مقدمہ ریاض القرآن

اصول القرآن

ہم نے قرآن کی تفہیم کے لئے آئمہ محققین کے جمع کردہ چند اصول و قواعد جمع کر دیئے ہیں جب تک کوئی عالم ان پر عبور نہ رکھتا ہو لازماً وہ ہدایت کی بجائے کسی عظیم فتنے میں مبتلا ہو جائے گا۔

علامہ ابوالخیر اسدی

مجلس نشر السنۃ مخدوم رشید (ملتان)

ادارہ اسلامیہ
مخدوم رشید۔ ملتان
0301-7444110
Azhar.asdi@gmail.com Idarahislamia.com

مُقدّمہ ریاضُ القرآن

اُصُولُ القرآن

ہم نے قرآن کی تفہیم کے لئے آئمہ محققین کے جمع کردہ چند اصول و قواعد جمع کر دیئے ہیں جب تک کوئی عالم ان پر عبور نہ رکھتا ہو لازماً وہ ہدایت کی بجائے کسی عظیم فتنے میں مُبتلا ہو جائے گا ۔

علّامہ ابُوالخیر اسدی

مجلس نشر السُنّہ مخدوم رشید (مُلتان)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
۱	تقدیم القرآن (قرآن سمجھنے کے بنیادی اصول)	۳
۲	قرآن میں فکر و تدبر کے تین اصول	۸
۳	مقدمۃ القرآن	۱۰
۴	قرآن کی تفہیم اور تفسیر کے اصول	۲۲
۵	تفسیر اور اصولِ تفسیر	۳۰
۶	اسلوبِ قرآن	۳۴
۷	قرآنِ حکیم کے مضامین	۳۸
۸	متشابہ آیات کی علمی تشریح	۴۱
۹	محکم اور متشابہ اور آیاتِ صفات	۴۸
۱۰	عہدِ صحابہؓ میں قرآن کے اصول	۵۳
۱۱	چند تفسیری مباحث	۶۳
۱۲	تفسیر بالروایات میں محدثین کا تساہل	۶۹
۱۳	ابن عربی کی تفسیر	۷۶
۱۴	کشفِ ساق اور قرآن میں مجاز کا بیان	۷۹
۱۵	امثال القرآن	۸۵
۱۶	قرآن میں قسموں کی تشریح	۱۱۴
۱۷	قرآنِ حکیم اور اکتشافاتِ جدیدہ	۱۲۳
۱۸	قرآن میں تسخیرِ کائنات اور آفاقی دلائل کا مقصد	۱۲۷

(کتبہ: محمد اقبال یوسفی ۹۵ء)

تقدیم القرآن
قرآن سمجھنے کے بنیادی اصول

شیخ التفسیر محمد اویس نگرامی ندوی لکھتے ہیں :—

قرآن مجید کے سچے طالب علم اور اس سے حقیقی استفادہ کرنے والے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اس کا دل قرآن مجید کی عظمت سے معمور ہو اور یہ نورِ یقین اس کی رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے ہو —

عقیدہ کے اعتبار سے تو ہر مسلمان قرآن مجید کو اللہ کا کلام تسلیم کرتا ہی ہے لیکن اس سے نفع اٹھانے کے لیے اس عقیدہ کا استحضار بھی ضروری ہے —

قرآن مجید میں بار بار فرمایا گیا ہے کہ قرآن کو ہم نے اُتارا ہے ! قرآن اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ اسے خوب ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کا اس طرح قرآن مجید کو اپنی طرف منسوب فرمانا اور اس نسبت کو بار بار ظاہر فرمانا محض سلسلۂ سند کے لئے نہیں ہے، بلکہ اس سے قرآن مجید کی عظمت اور بلندی کا اظہار مقصود ہے۔ اس لئے کہ متکلم کی عظمت اس کے کلام کی عظمت سے ظاہر ہوتی ہے —

امام شاطبی موافقات میں فرماتے ہیں :—

جو شخص دین کو جاننا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے، کہ وہ قرآن ہی کو اپنا مونس وہمدم بنائے شب و روز قرآن سے تعلق رکھے —

یہ ربط و تعلق علمی اور عملی دونوں طریقوں سے ہونا چاہیئے۔ صرف ایک تعلق پر اکتفا نہ کرے، جو شخص ایسا کرے گا اُمید ہے کہ وہ مقصود کو اچھی طرح حاصل کرے گا — (الموافقات ص ۳۴۶/۳)

جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے کلام کو عربی زبان کا لباس پہنا کر اپنے اور بندوں کے درمیان واسطہ بنایا۔ اسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو قرآن کی تشریح وتفصیل اور اس کی عملی تفسیر کیلئے ہادی بنایا، اس لیے قرآن مجید سے نفع اٹھانے کے لئے ضروری ہے، کہ پورے شرح صدر کے ساتھ اس وجود گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اعتماد، اتباع اور انقیاد کا تعلق رکھے۔ آپ کے بغیر قرآن مجید سے استفادہ کی اُمید رکھنا ایک عبث فعل ہے۔ خود قرآن مجید نے اپنا اور پیغمبر کا تعلق جس طرح ظاہر کیا ہے، وہ اس بات کی واضح دلیل ہے، کہ قرآن مجید سے استفادہ کرنے والوں کیلئے دامنِ نبوت سے وابستگی از حد ضروری ہے — قرآن مجید میں ہے :—

یتلوا علیھم آیتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ

"وہ رسول انہیں اللہ کی آیتیں پڑھ کر سُناتا ہے اور ان کے اعمال کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی اعلیٰ تعلیم دیتا ہے"

اس سے معلوم ہُوا کہ کتاب اللہ کی تعلیم اور اعمال کا تزکیہ کرنا نبوت کے فرائض میں داخل تھا — اس طرح دوسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون - (نحل ۶)

"اے رسول! ہم نے آپ کی طرف نصیحت خیز کتاب اُتاری ہے تاکہ جو کچھ لوگوں کی خاطر نازل کیا گیا ہے تو اُسے پوری وضاحت کے ساتھ سمجھاتا رہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس پر تفکر کرکے ہدایت حاصل کرسکیں —"

مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم اور اس کے شرح وبیان کی ذمہ داری اللہ کی طرف سے پیغمبر کے سپرد کی گئی ہے۔ اب ایسے رسول سے الگ ہوکر قرآن مجید میں غور کرنا اور اس کے مضامین سے نفع اٹھانے کی توقع رکھنا بحرِ ظلمات میں قدم رکھنا ہے —

قرآن مجید سے مکمل اور صحیح استفادہ کے لئے ضروری ہے کہ ہم کو اس سے نفع حاصل کرنے کی فکر بھی ہو اور اُس کے برکات سے مستفید ہونے کی

کی طلب بھی دل میں موجزن ہو۔ اسی لئے قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔

هُدًی للمتقین ــ راہ بتلاتی ہے ڈرنے والوں کو ــ یہاں تقویٰ سے مُراد اس کے اصطلاحی معنی نہیں ہے بلکہ لغوی معنی مقصود ہے۔ یعنی خوف و کھٹک۔ اس اعتبار سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ جن لوگوں کے قلب میں اپنی اصلاح کی کھٹک اور فکر و قصد ہے قرآن اُن کو ہدایت کرتا ہے۔ سورۃ اللیل میں ارشاد ہے:۔

فامامن اعطی واتقیٰ وصدّق بالحسنٰی.... ولمامن بخل و استغنیٰ وکذّب بالحسنٰی

یہاں صنعت تقابل کا استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں "اعطاء" کا ذکر ہے تو دوسری آیت میں "کذّب" ہے تو دوسری طرف "صدّق" ہے۔ اسی طرح استغنیٰ اور اتقیٰ کا تقابل ہے۔ اس تقابل کی وجہ سے تقویٰ کے معنی وہ ہوں گے جو استغنیٰ کے مقابل ہو۔ استغناء کے معنی بے فکری کے ہیں تو تقویٰ کے معنی ہوں گے فکر اور کھٹک کے ــ

حافظ جلال الدین سیوطی نے اتقان میں ابوالمعالی کے حوالہ سے اس موقع پر بڑے کام کی بات کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"اگر کسی کے دل میں بدعت، تکبر، خواہش نفسانی اور دُنیا کی محبت موجود ہے یا وہ گناہ کا عادی ہے یا اس کا ایمان کمزور ہے یا اس میں تحقیق کا مادہ کم ہے اور غیر مستند لوگوں کی تفسیر قبول کر لیتا ہے تو وہ نہ قرآن سمجھ سکتا ہے اور نہ اُس پر اِس کے اسرار کھُل سکتے ہیں"۔

اس کے بعد امام سیوطی نے حسبِ ذیل آیت سے استدلال کیا ہے ــ

وسساصرف عن آیاتِی الذین یتکبرون فی الارض بغیر الحق ــ (اعراف)

جو لوگ اس زمین میں ناحق جاہ و وجاہت کے طالب ہوتے ہیں ہم ان کے ذہنوں سے اپنی آیات کی صحیح تفہیم چھین لیتے ہیں۔

ــــــ (اتقان ص۱۸۱ ج ۲ مصر)

یہ آیت بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہے:۔

انّ فی ذالك لذکری لمن کان لہٗ قلبٌ اوالقی السمع وھو شہید ــ

"اس قرآن میں سوچنے کے اچھے مواقع ہیں۔ اس سے وہ انسان فائدہ اُٹھا سکتا ہے جو اپنے سینے میں قلبِ سلیم رکھتا ہو اور قرآن سُنتے وقت پوری توجہ کے ساتھ مستحضر رہتا ہو"۔

حافظ ابنِ قیم اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

کسی چیز کی تاثیر کے لئے ضروری ہے کہ کوئی مؤثر ہو دُوسرا جس پر اثر ڈالنا مقصود ہو وہ موجود، تیسرا اس میں اثر ہونے کے شرائط موجود ہوں چوتھا، جو چیزیں اثر کو زائل کرنے والی ہوں وہ نہ ہوں۔ اس آیت میں (قرآن مجید سے استفادہ کے سلسلے میں) ان سب چیزوں کا ذکر موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قول " ان فی ذالك لذکری " میں مؤثر کی طرف اشارہ ہے۔ " لمن کان قلب " سے قلبِ بیدار مُراد ہے۔ اس لئے کہ نصیحت قبول کرنے کی جگہ دل ہی ہے ــ دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

ان ھوالاّ ذکر و قرآن مبین لینذر الذین من کان حیًّا ــ (یٰس)

"یہ صرف خالص نصیحت ہے اور واضح کتاب، تاکہ رسول اس کتاب سے اُن لوگوں کو ڈرائے جن کے دِل مُردہ نہ ہوں"

اور القی السمع کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اسے کہا جائے دل لگا کر سُنے۔ کسی بات سے متاثر ہونے کی یہی شرط ہے۔ اور وھو شہید کا مطلب یہ ہے کہ اس کا دِل حاضر ہو کیونکہ غفلت اور بے فکری اثر نہیں ہونے دیتی ــ

پس جب مؤثر یعنی قرآن مجید اور محلِ قابل یعنی قلب بیدار اور اثر ہونے کی شرط یعنی توجہ کامل موجود ہو اور اثر کو زائل کرنے والی چیز

یعنی غفلت اور بے فکری موجود نہ ہو تو (ان شاء اللہ) مقصود یعنی قرآن سے پورا نفع حاصل ہو جائے گا۔ (التفسیر القیم ص۴۴۴)

قرآن مجید کے طالب علم کا ذہن اس معاملہ میں بھی صاف ہونا چاہیئے کہ ہم کو قرآنِ مجید سے کن امور میں رہنمائی کی ضرورت ہے۔ قرآنِ مجید کا موضوع اور اس کا عنوان کیا ہے؟ اس عقدہ کا حل نہ ہونے کی وجہ سے اس راہ کے کتنے مسافر منزل سے دور رہ جاتے ہیں۔ وہ سراب کو اپنی تشنہ لبی کا سامان سمجھ لیتے ہیں اور نتیجہ یہ نکلا "حیرانی اور پریشانی کے سوا انہیں کچھ بھی ہاتھ نہیں آیا ——

اس حقیقت کو بھی خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن مجید کی اصل دعوت انسان کو سعادتِ ابدی کی طرف لے جاتی ہے۔ وہ انسان کے ظاہر و باطن کی ایسی تعمیر کرنا چاہتی ہے کہ حیاتِ اُخروی میں اس کو کوئی زحمت پیش نہ آئے۔ اور یہ کتاب انسان کا ایسا تزکیہ کرنا چاہتی ہے کہ وہ بارگاہِ خداوندی میں حضوری کے لائق بن سکے —— بلاشبہ قرآن مجید نے دنیاوی زندگی کے تمام اصول و قواعد مرتب فرمائے ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے قوانین عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات، حقوق اور آداب ان سے بحث فرمائی ہے مگر ان تمام امور میں بنیادی نقطۂ نظر اُخروی سعادت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مباحث کا جن آیات میں ذکر آتا ہے ان کے اوّل یا آخر میں یا درمیان میں ترغیب یا ترہیب کی آیتیں، جنت و دوزخ اور عذاب کا ذکر ضرور ہوتا ہے —— اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں توقع کے اعتبار سے کسی مناسب اسم و صفت کا تذکرہ بھی ضرور ہوتا ہے۔ تاکہ پڑھنے والا یہ بات سمجھتا رہے کہ ان قوانین کی پیروی کے نتیجے میں ابدی راحت اور نافرمانی کی صورت میں اخروی ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا —— امام شاطبیؒ نے بڑے کام کی بات کہی ہے۔ آپ فرماتے ہیں، قرآن مجید کے اصل علوم تین ہیں۔ (۱) ذاتِ حق کی معرفت۔ (۲) حق تعالیٰ کی رضا کی صورتیں۔ (۳) انسان کا انجام —— پہلے علم یعنی ذات حق تعالیٰ کی معرفت میں اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات اور افعال کا علم داخل ہے۔ اور اسی سلسلہ میں نبوت بھی داخل ہے۔ اس لیے کہ عبد اور معبود کے درمیان یہی واسطہ ہے۔ دوسرے علم میں عبادات اور معاملات وغیرہ داخل ہیں۔ تیسرے علم میں موت اور اس کے احوال، قیامت اور اس کے مشتملات۔ اور جنت و دوزخ کے احوال داخل ہیں۔ اسی قسم میں ترغیب اور ترہیب کی آیات اور وہ آیتیں جن میں اچھے لوگوں کی نجات اور بدکاروں کے بُرے انجام کے واقعات بیان کئے گئے ہیں اس میں وہ بھی شامل ہیں —— (الموافقات ص۲)

قرآن مجید کے الفاظ کی تشریح کے لئے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے قرآن، اس کے بعد سنت اور پھر اقوالِ صحابہؓ و تابعین کی طرف رجوع کیا جائے —— قرآن عربی زبان میں ہے۔ اس لئے بلاشبہ قرآن کے الفاظ کی تشریح کے سلسلے میں لغت عرب سے بھی چارہ نہیں۔ لیکن اس لسانی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ قرآن کی کچھ خود اپنی اصطلاحات ہیں اور انہیں صرف کتاب و سنت ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً سورۃ فاتحہ میں لفظ "صراطِ مستقیم" ہے لغت میں جس کے معنی "سیدھے راستے" کے ہیں مگر قرآن نے "صراطِ مستقیم" کے لفظ سے کون سا سیدھا راستہ مراد لیا ہے۔ اس کی تشریح اس کے متصل خود ہی فرما دی ——

صراط الذین انعمت علیھم۔ اُن لوگوں کا راستہ جن پر آپ نے انعام کیا ——

انعام کن لوگوں پر ہوا ہے اس کی تشریح ایک دوسرے مقام پر کر دی گئی ہے ——

ومن یطع اللہ والرسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین ——

"جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کرتے وہ لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا۔ وہ لوگ انبیاء، صدیقین، اور صالحین کی جماعت ہے ——" اس سورۂ آلِ عمران کے آخر میں فرمایا کہ :——

"زمین و آسمان کی پیدائش اور شب و روز کے اُلٹ پھیر میں پختہ عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ قرآن مجید نے اس موقع پر

پختہ عقل والوں کے لئے " اولوالالباب " کا لفظ استعمال کیا ہے۔ قرآن کے نزدیک اولوالالباب وہ لوگ ہیں جو اُٹھتے بیٹھتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں۔ یذکرون اللہ قیامًا وقعودا۔ وہ لوگ اُٹھتے بیٹھتے ہر حال میں خُدا کو یاد کرتے رہتے ہیں

قرآن مجید میں عبادات کے سلسلہ میں صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ لُغت میں صلوٰۃ کے معنیٰ دُعا کے ہیں زکوٰۃ کے معنیٰ بڑھنے کے۔ صوم کے معنیٰ رُکنے کے اور حج کے معنیٰ قصد کرنے کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان الفاظ کے لُغوی معنیٰ یہاں مقصود نہیں ہیں بلکہ ان میں سے ہر لفظ کا ایک خاص مفہوم مُراد ہے اور اس مفہوم کا تعین سُنّتِ نبوی کرتی ہے۔ اگر اس تعین کو نہ مانا جائے۔ اور صرف لغت کو سامنے رکھا جائے تو عبادات کی کوئی حیثیت بھی باقی نہیں رہ سکتی۔ جس طرح اس دَور میں پرویزی، نیچری اور ماڈرن اسلام کے داعی، مفسّرِ قرآن بَن کر سادہ اذہان کو ملحد بنا رہے ہیں۔ اس لئے حافظ ابنِ قیمؒ نے فرمایا :-

" قرآن مجید کا ایک خاص عُرف ہوتا ہے اور اس کے کچھ متعین معنیٰ ہوتے ہیں۔ اور اس عُرف سے ہٹ کر قرآن کی تفسیر کرنا جائز نہیں ——" (التفسیر القیم ص ۲۶۹)

اس زمانے میں قرآن مجید کے سمجھنے کے جو دردناک اور تکلیف دہ مناظر سامنے آتے ہیں ان میں ایک رُوح فرسا منظر یہ بھی ہے کہ عربی زبان کی چند ریڈریں پڑھ کر لوگ اپنے آپ کو فہمِ قرآن اور اس سے استنباط و استناد کا جائز حق دار جاننے لگتے ہیں۔ حالانکہ یہ سخت جرأت اور انتہائی غیر ذمہ دارانہ اقدام ہے —— شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ اپنے رسالہ " اصولِ تفسیر " میں تفسیری غلطیوں کے سلسلے میں لکھتے ہیں :-

" دوسرے وہ لوگ ہیں جنہوں نے قرآن کی تفسیر محض لُغتِ عرب سے کی ہے۔ اور یہ لحاظ نہیں کیا کہ متکلمِ قرآن کی کیا مُراد ہے اور اس نے جس پر قرآن نازل ہوا، اس کا کیا مطلب بیان فرمایا ہے اور وہ لوگ جو قرآن کے اوّلین مخاطب تھے وہ اس کا کیا مفہوم سمجھتے تھے" —— علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں ——

جو شخص سماع اور نقل کی مدد کے بغیر محض عربیت کی بنا پر قرآن کی تفسیر کرے گا اس سے بہت غلطیاں ہوں گی، اور تفسیر بالرائے کا مرتکب ہوگا —— (تفسیر قرطبی ص ۱۰)

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کے الفاظ کی تفسیر و توضیح و تشریح کے لیے لُغتِ عرب کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کے عرف، اس کی اصطلاحات اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تشریحات کا علم بھی ضروری ہے، ورنہ نتائج بے حد خطرناک نکلیں گے ——

دوسرا طریقہ یہ ہے، کہ آیت کا وہ مطلب مُراد لینا چاہیئے۔ اگر اس کی تائید کسی دوسری آیت سے ہوتی ہو اگر اس اصول کی رعایت نہ کی جائے گی تو قدم قدم پر لغزش کا اندیشہ ہے۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں یہود کے باب میں فرمایا گیا ہے کہ یہ دُنیا میں ہمیشہ ذلیل و رُسوا رہیں گے۔ ارشاد ہُوا۔

وضربت علیھم الذلّۃ والمسکنۃ وباؤ بغضب من اللہ ——

اللہ کی طرف سے یہود پر ذلت و رسوائی ڈالی گئی، یہ جہاں بھی گئے اللہ کے غضب کو ساتھ لیتے گئے ——

لیکن ادھر جب سے اسرائیل کی حکومت قائم ہوئی، اور یہود کو ایک وطن مل گیا۔ اس وقت سے برابر سوالات ہوتے رہے ہیں کہ قرآن نے یہود کے متعلق تو ذلت اور رُسوائی کی پیشین گوئی فرمادی تھی۔ اب یہ یہود کیسے اقتدار کے مالک بن گئے۔ اس کا جواب اس آیت میں موجود ہے —— ضربت علیھم الذلۃ این ما ثقفوا الا بحبل من اللہ وحبل من الناس (آل عمران)

یہود جہاں بھی رہیں گے ذلت انہیں نہیں چھوڑے گی۔ ہاں وہ اگر مسلمان ہو کر اللہ کی پناہ میں آجائیں یا کسی طاقتور قوم کے سائے میں پناہ حاصل کرلیں —— اس آیت میں واضح فرمادیا گیا ہے کہ یہود کو ذِلّت و رُسوائی سے بچنے کی صرف دو صورتیں ہیں یا وہ اسلام قبول کریں یا دُنیا میں کسی دوسرے کی سرپرستی قبول کرلیں۔ مطلب یہ ہے کہ دوسروں کے سہارے کے بغیر وہ قومی عزت کے مالک

نہیں بن سکتے۔ اب دیکھئے بنی اسرائیل کی حکومت و بقا خود یہود کا کارنامہ ہے۔ یا ساحرانِ فرنگ کی ادنی ساحری کا نتیجہ ہے۔ اگر آیاتِ قرآنیہ کے مطلب بیان کرنے میں اصولِ شریعت اور قواعد زبانِ عرب کا لحاظ نہ کیا جائے تو یہ ناجائز ہے اور اسی کو تفسیر بالرائے" کہتے ہیں ــــ

ترمذی شریف میں ہے جو شخص قرآن میں اپنی رائے سے تفسیر کرے تو وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں مقرر کرلے ــــ

یہاں علم سے مُراد قواعدِ عربیت اور اصولِ شریعت کا علم ہے۔ بے شُبہ جو شخص ان دونوں علوم سے ناواقف ہے۔ اس کو قرآن پاک کی تفسیر کرنا حرام ہے ــــ علامہ شاطبی موافقات میں فرماتے ہیں ــــ

"تفسیر کی دو قسمیں ہیں ایک وہ تفسیر جو کتاب و سُنّت کے مطابق اور قواعد زبان عرب کے موافق ہو۔ اس تفسیر سے اغراض و غفلت ممکن نہیں ــــ دوسری تفسیر وہ جو نہ دلائل شرعیہ کے موافق ہو اور نہ زبان عرب کے قواعد کے مطابق۔ تو بے شک یہ تفسیر قابلِ مذمّت ہے۔

ایک حدیث میں ہے:۔ من قال فی القرآن برایہ فاصاب فقد اخطاء ــــ

جو شخص قرآن میں اپنی رائے سے کوئی بات کہے اگر وہ صحیح بھی ہو پھر بھی اس نے خطاء کی ــــ (احکام القرآن)

یہ اُس شخص کے متعلق ہے جو قرآن کی تفسیر ہی اصول سے ہٹ کر وہ بات کہے جو اور اگر کوئی شخص آیاتِ قرآنیہ کا مطلب بیان کرے اور اس کو ایسے معانی پر محمول کرے جن پر سب کا اتّفاق ہے وہ شخص قابلِ تعریف ہے اجر کا مستحق ہے ــــ

قرآن مجید کے طالب علم کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن مجید میں جن قوموں کا ذکر آیا ہے اور جن مذاہب سے خطاب فرمایا گیا ہے ان سے اور عہدِ نبوت کی تاریخ سے گہری واقفیت رکھتا ہو۔ یہ مطالعہ جتنا گہرا ہوگا اسی قدر آیات قرآنیہ کا صحیح انکشاف ہوگا ــ صورت یہ ہے قرآن مجید نے اپنے نزول تک گمراہ فرقوں، مشرکین، یہود اور منافقین کو خصوصی طور سے خطاب کیا ہے، ان کے عقائد پر سخت تنقید کی ہے اور ان کے مذموم اعمال کی پردہ دری کی ہے۔ اب جس شخص کو ان فرقوں کے عقائد کی واقفیت نہیں ہے یا جس کی نگاہوں میں ان کی اخلاقی اور سیاسی زندگی نہیں ہے۔ وہ متعلقہ آیات کے اسلوب بیان اور طرزِ خطاب کی اہمیّت اور استدلال کی قوّت کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتا، اس طرح قرآن مجید نے جن مسلمانوں کو خطاب کیا ہے عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات میں ان کی رہنمائی کی ہے غزوات اور اس وقت کے اہم واقعات کا ذکر فرمایا ہے۔ اب اگر زمانہ نزولِ قرآن کی تاریخ سے کوئی شخص ناواقف ہے تو وہ ان آیات کو ان کے صحیح محل پر نہیں رکھ سکتا۔ بلکہ اندیشہ ہے کہ کسی اہم موقع پر اہم غلطی کا ارتکاب نہ کر بیٹھے ــــ

اس لئے امام شاطبیؒ "موافقات" میں فرماتے ہیں :ــــ

"جو شخص قرآن مجید کو سمجھنا چاہے اس کے لئے نزولِ قرآن کی معرفت ضروری ہے"۔

اس اصول کی تشریح کرتے ہوئے امام شاطبیؒ نے بڑی لطیف بات کہی کہ :ــــ

"فنِ معانی و بیان کی بُنیاد اس پر ہے ــــ کہ نفس خطاب مخاطب کرنے والے اور جس کو مخاطب کیا گیا ہے اس کے متعلق صحیح معلومات ہوں۔ اس کو مقتضائے حال کہتے ہیں۔ اسبابِ نزول کی واقفیت کا مطلب اسی مقتضائے حال کا جاننا ہے"۔

امام شاطبیؒ فرماتے ہیں کہ بسا اوقات اس مقتضائے حال سے ناواقفیت سخت اشکالات کا باعث بن جاتی ہے"ــــ حاصل یہ ہے کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں مسلمانوں کے حالات اور قرآن کے مخاطب فرقوں کے عقائد، رسوم اور عادات سے واقفیت بھی ازحد ضروری ہے۔

امام شاطبیؒ دوسرے مقام میں فرماتے ہیں :ــــ طالب قرآن کو عادات عرب سے ناواقفیت بعض اوقات ایسی مشکلات میں ڈال دیتی ہے اس سے نجات کی شکل اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ اس ناواقفیت کو اچھی طرح دُور کیا جائے۔ (موافقات)

قرآن میں فکر و تدبّر کے تین اصول

مولانا حنیف ندوی لکھتے ہیں :—

ہمارے نزدیک فکر و تدبّر کے یہ تین پیمانے ہیں جو قرآن فہمی کے لئے ازحد ضروری ہیں ۔—

۱— عصرِ نبوّت کا استحضار —۲ عربی زبان پر کامل عبور ۳— قرآن حکیم سے محبّت اور شغف —

(۱) استحضار عصرِ نبوّت کے معنی یہ ہیں کہ پہلے ہم تاریخی طور سے یہ معلوم کریں کہ اُس دَور کے مسائل کیا تھے؟ اور وہ کون سے تہذیبی اور عقائد کے اشکالات تھے جن کو حل کرنے کی غرض سے قرآن کریم نازل ہُوا تھا۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معاشرے اور ماحول میں مصروف اور روزمرّہ کی زندگی میں رواں دواں دیکھیں کہ اس دَور کی قیادت اور اصلاح میں آپؐ کا کردار کیا رہا اور آپؐ نے کِس کِس ڈھب اور انداز سے ایک بگڑی ہوئی اور اخلاق باختہ قوم کو بامِ عروج تک پہنچا دیا — عصرِ نبوّت اور قرآن میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جس کو سمجھے اور جانے بغیر قرآن فہمی کا دعویٰ یا تو انتہا درجے کی سادگی پر مبنی ہے اور پھر اس میں فسادِ نیّت کا پہلو مضمر ہے کہ قرآن کو ایک مرتبہ اس کے تہذیبی و ثقافتی ماحول سے الگ کر دو پھر جو معنی بھی اس میں سے نکالنا چاہو گے آسانی سے نکال لو گے۔ قرآن مجید کے فہم و ادراک کے لئے استحضارِ عصرِ نبوّت کا نظریہ کچھ قرآن ہی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ دُنیا کی ہر کتاب شخصیت یا فکر کو ذہن کی گرفت میں لانے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس ماحول اور کوائف کو چشمِ تصوّر میں لایا جائے کہ جن میں یہ کتاب نازل ہوئی یا شخصیت اُبھری یا فکر پروان چڑھا پھر اس کے بعد اس کو پہچاننے کی کوشش کی جائے —

(۲) عربی زبان پر عبور کے معنی یہ ہیں کہ اہلِ علم یہ جان لیں کہ قرآن جس زبان میں نازل ہُوا ہے اس کا مزاج کیا ہے۔ اس کا زبان کا انداز اسلوب کیسا ہے اور احکام عقائد اور مسائل کو کس نہج سے پیش کرتا ہے۔ اس میں تشبیہ استعارہ اور کنایہ کا کہاں کہاں استعمال ہوا ہے۔ یہ واضح رہے کہ جب تک ہم زبان دانی کی اس سطح سے آشنائی پیدا نہیں کرتے جس پر قرآن کریم اپنے مخصوص اسلوب اور پیرایۂ بیان کے لحاظ سے فائز ہے۔ قرآن حکیم کے مطالب و دقائق تک ہماری رسائی ممکن نہیں —

قرآن حکیم قریش کی صاف ستھری زبان میں اُترا ہے۔ یہ کتاب اگرچہ اپنے عقائد و مسائل کے اعتبار سے بہت سہل ہے، اس لیے کہ اس میں کوئی عقلی و فکری پیچیدگی نہیں پائی جاتی تاہم چونکہ یہ کتاب وحی و تنزیل کا افشردہ عطر ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کے فہم و ادراک کے لیے اربابِ علم اس زبان کو اچھی طرح جانیں جس میں یہ نازل ہوئی ہے۔ اور اپنے غیر مانوس مطالب و معانی اس کی جانب منسوب نہ کریں جن کی تائید اس کے لسانی تقاضوں سے نہیں ہو پاتی —

(۳) قرآن سے محبّت اور شغف کے معنی یہ ہیں، کہ ہم نے عقائد و افکار اور تعبیر و تفسیر کے جن غیر قرآنی صنم خانوں کو اپنے قلب و ذہن میں پہلے سے تعمیر کر رکھا ہے۔ ان سب کو "لا الٰہ" کی تیغ ...... سے یکسر مٹا دیں تمام تعصبات سے خالی الذہن ہو کر اس کا مطالعہ

کریں اور کثرت سے کریں کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بار بار تلاوت کرتے اور اس میں بار بار ڈوبنے اور غواصی کرنے سے لمعات (FLASHES) قلب و ذہن کی سطح پر دمک جاتے ہیں جو عام حالات میں ظہور پذیر نہیں ہوتے۔ یہی وہ حقائق ہیں جن کو قرآن حکیم نے اپنی زبان میں یوں فرمایا ہے ____

انہ لقرآن کریم، فی کتاب مکنون، لا یمسہ الا المطھرون (الواقعہ، ۹)

یہ ذی شان قرآن ہے جو ایک محفوظ کتاب میں پہلے دن سے درج ہے جسے بجز پاک نہاد لوگوں کے دوسرا کوئی چھو نہیں سکتا۔

ھدًی للمتقین (البقرہ ۲)

یہ کتاب ہدایت ہے اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے ____

تلک ایت الکتاب الحکیم ہدًی و رحمۃ للمحسنین (لقمان)

یہ ایک حکیمانہ کتاب کی آیات ہیں جو نیکوکاروں کے حق میں ہدایت و رحمت ہے یعنی اس کے فہم و ادراک کے لیے جوارح کے ساتھ ساتھ قلب و ذہن کی طہارت بھی ضروری ہے۔ اتقا بھی لازم ہے اور عملی زندگی میں نیکی معروف اور اسی شئے کا ہونا بھی واجب ہے جسے ہم احسان کہتے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ آپ کی صبحیں اور شامیں اگر قرآن کے پیغام دعوت و اصلاح کے ساتھ ہم آہنگ نہیں پھر آپ ایک کتاب کو تو سمجھ سکتے ہیں قرآن کو نہیں ____

مقدمۃ القرآن

اللہ تعالیٰ نے قرآن اُتار کر بنی نوع انسان پر اپنی نعمت پُوری کر دی اور اپنے اس دین کو جس کو انسانوں کی آغازِ آفرینش سے ان کی ہدایت کے لئے بنایا تھا اس کتاب کریم میں مکمل کر دیا اور اعلان کر دیا کہ :۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (۵/۴)

آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تمہارے اُوپر پُوری کر دی اور تمہارے لئے دینِ اسلام کو پسند کیا ۔

قرآن کریم ایسی صاف عربی زبان میں نازل ہُوا جس کو عام طور پر اہلِ عرب سمجھتے تھے، خود قرآنی آیات میں اس کی زبان "عربی مبین" کہی گئی ہے یعنی کھلی ہُوئی اور واضح ۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس نے اپنے کو "نورِ مبین" کہا ہے ۔ نیز قرآنی آیات کو بھی "آیاتِ بینات" کے نام سے موسوم کیا ہے۔

بَلْ ھُوَ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۔ (۲۹/۴۹)

بلکہ وہ کھلی ہوئی آیتیں ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم دیا گیا ہے ۔

اَلغرض ۔ قرآن کی زبان، قرآن کی تعلیم اور قرآنی آیات کا مفہوم سب خود قرآن کے بیان کے مطابق واضح، کھلا ہُوا اور جگمگاتا ہُوا نور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے بار بار تصریح کی ہے کہ :۔

وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ (۵۴/۱۷) ہم نے قرآن کو نصیحت لینے کیلئے آسان بنا دیا ہے۔ کوئی ہے جو نصیحت لے۔ نصیحت لینے کی آسانی کو دیکھنے کے لئے خود اھلِ عرب پر نظر ڈالنا کافی ہے جو قرآن کے اوّلین مخاطب اور بالعموم بدوی اور ناخواندہ تھے جس کی وجہ سے قرآن نے اُن کو "اُمِّیین" کا لقب دیا اور فرمایا :۔

ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ (۶۲/۲) وہی ہے جس نے اُٹھایا اَن پڑھوں میں انہیں میں سے ایک رسول۔ ان اُمّیوں نے بے تکلف قرآن کو سمجھا اور اس کے اُوپر عمل کیا اور کامیاب ہوئے ۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں :۔

اِنّ القرآن نزل بلغۃ العرب علی اسالیب بلاغتھم وکانوا کلھم یفھمونہ ویعلمون معانیہ فی مفرداتہ وتراکیبہ ۱؎ ۔

قرآن عرب کی زبان میں ان کے انداز بلاغت کے مطابق نازل ہُوا۔ ہر ایک اس کو سمجھتا تھا اور اس کے مفردات و مرکبات کے معانی کا علم رکھتا تھا ۔ علامہ موصوف کا مقصد غالباً یہ ہے کہ اھلِ عرب بالعموم قرآن سے اس کی تعلیمات کو سمجھتے تھے۔ ورنہ یہ تو ظاہر ہے کہ ہر فردِ اُمّتِ عربیہ کا اس کے جملہ الفاظ کے معانی اور اس کی تمام تراکیب کی تفصیلات کا عالم نہیں ہو سکتا تھا۔ ہاں وہ ایک سادہ مفہوم اس کا ضرور سمجھ لیتے تھے اور ہر ایک آیت کے تفصیلی معانی تک پہنچنے کی تکلیف لازمی خیال نہیں کرتے تھے لیکن اس سے یہ اندازہ کر لینا کہ وہ بالعموم آیات کے سرسری مفہوم پر قانع تھے صحیح نہیں ہو سکتا۔ ابو عبدالرحمٰن سلمیؒ سے روایت ہے کہ صحابہؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیتیں سیکھتے تھے تو جب تک ان کی علمی اور عملی حقیقت کو جان نہ لیتے تھے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ہم میں سے جب کوئی شخص سورۂ بقرۃ اور آلِ عمران پڑھ لیتا تھا تو ہماری نگاہوں میں محترم ہو جاتا تھا ۲؎ ۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں زیادہ تر آیات محکمات ہیں جو اصولِ دین اور احکامِ شریعت سے تعلق رکھتی ہیں یا انبیاء کرامؑ اور اقوامِ سابقہ کے نتیجہ خیز اور عبرت انگیز قصص ہیں ان کا سمجھنا جمہور کے لئے آسان ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ حقائق غامضہ بھی ہیں

۱؎ مقدمہ ابن خلدون ص ۳۶۷ ۔ ۲؎ مسند امام احمد

جن کو صرف راسخون فی العلم ہی سمجھ سکتے ہیں اور صحابہ کرامؓ میں ایسے حضرات کی کمی نہیں تھی، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی نگاہوں میں اس کا عملی پہلو غالب تھا، یہاں اس بات کی تصریح کی ضرورت ہے کہ ظاہری اور عملی حیثیت کے علاوہ قرآن کریم کی نظری اور عقلی حیثیت بھی اہم ہے۔ یہ چھوٹی سی کتاب جو آسانی کے ساتھ صرف چند اجزاء میں نمایاں اوراق لکھی جا سکتی ہے، قیامت تک کے لئے اُمّتِ اسلامیہ کا دستور العمل بنائی گئی ہے اور ہر زبان اور ہر مکان میں ان کی ہدایت کا نصاب قرار دی گئی ہے۔ اگر یہ ایسے حقائق جاودانی پر مشتمل نہ ہوتی جن کو ابدالآباد تک انسانی نسلیں ختم نہیں کر سکیں گی، تو کیونکر ان کا دائمی نصابِ ہدایت بننے کی صلاحیت رکھتی؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن سے صرف عملی نصیحت ہی لینے کی ہدایت نہیں کی گئی بلکہ اس میں تفکّر اور تدبّر کی بھی تاکید فرمائی گئی ہے۔ مثلاً :—

كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ (۳۸/۲۹) مُبارک کتاب ہم نے تیری طرف نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں ——— دوسری جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :—

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (۴۷) کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں میں ان کے قفل پڑے ہوئے ہیں ——— اور آیت ہے :—

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ... (۱۶/۴۴) | اور ہم نے تیری طرف قرآن اُتارا تاکہ لوگوں کے لئے جو اُتارا گیا ہے اس کو اُن کے سامنے بیان کر دے اور تاکہ لوگ اس میں تفکّر کریں۔

الغرض ——— اہلِ نظر کو قرآن نے اپنی آیات میں فکر و نظر کی دعوت دی ہے تاکہ وہ ان سے ہدایت لیتے اور اپنی فلاح کا راستہ نکالتے رہیں۔ اس کا دعویٰ ہے :— إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ (۸۱/۲۷) وہ نہیں ہے مگر سارے عالموں کی نصیحت کے لئے ۔

یعنی جملہ بنی نوعِ انسان کے لئے خواہ وہ کسی عالم، کسی ماحول، کسی زمان اور کسی مکان میں ہوں ——— یہی وجہ تھی کہ عہدِ رسالت میں فقہاء صحابہؓ اس کی آیات میں تدبّر کرتے تھے اور بعض امور کو جو اُن کے سامنے فی الجملہ واضح نہیں ہوتے تھے، خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرتے تھے لیکن بہت کم، کیونکہ کثرتِ سوال کی آفتوں سے وہ اچھی طرح واقف تھے ۔

اکثر صحابہ کرام بہ نظرِ احتیاط انہیں معانی پر اکتفا کرتے تھے، جو بعض الفاظ یا آیاتِ قرآن کی تشریح کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسموع ہوئے تھے خود قرآن کی تفسیر میں کچھ کہنے سے پرہیز کرتے تھے۔ چنانچہ ابن سیرین نے کہا ہے کہ میں نے عبیدہ سے ایک آیت کی تفسیر پوچھی تو انہوں نے کہا کہ اللہ سے ڈرو اور سیدھے چلے چلو، لیکن بعض صحابہؓ مثلاً ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ وغیرہ رضی اللہ عنہم قرآن میں تدبّر اور تفکّر کو ضروری سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک جو چیز ناجائز تھی وہ یہ تھی کہ بلا حقیقت کو پہنچے اور اچھی طرح سمجھے ہوئے آیات کی تفسیر کی جائے۔ یا بعض اہلِ مذاہب مثلاً خارجی شیعہ، قدری، مرجی وغیرہ جو اُس وقت پیدا ہو چکے تھے ان کے عقائد کے مطابق تاویل کی جائے۔[1]

اس زمانہ میں تفسیر کے لئے عربی زبان، جاہلیت کے رسوم و عادات جن کو قرآن نے مٹایا ہے۔ عہدِ رسالت کے واقعات جن کا تعلق قرآن سے ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، اعمال اور قضایا وغیرہ کا جاننا ضروری تھا انہیں کی مدد سے آیات کی تشریح کرتے تھے ۔

اسرائیلیات

قرآن میں دینی تعلیم کے لئے علاوہ ایسے تاریخی حقائق بھی مذکور ہوئے ہیں جن کا علم اصلاحِ نفوسِ بشری کے لئے ضروری ہے۔ مثلاً عالم کی تکوین آدم کی پیدائش اور انبیاء سابقین اور اقوامِ گذشتہ کے واقعات، انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ جب کسی شے کا ذکر سنتی ہے تو اس کے متعلق مزید معرفت کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے عہدِ صحابہؓ میں لوگ ان امور کو اُن علماء اہلِ کتاب سے جو اسلام لا چکے تھے دریافت کرتے تھے، خود حضرت ابن عباسؓ حبرِ اُمّت بھی ابن جریر طبری کے بیان کے مطابق کعب احبار کے پاس بیٹھتے اور ان

[1] فجر الاسلام صفحہ ۲۳۵۔

روایتوں کو اخذ کرتے تھے۔ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگاہ کر دیا تھا کہ " اہل کتاب کے اقوال کی تصدیق کرو نہ تکذیب " مگر چونکہ ان امور کا تعلق اعمالِ شریعت کے ساتھ نہ تھا اس وجہ سے ان کے لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا گیا۔ اس طرح پر اہل کتاب کی روایتیں بھی تفسیر قرآن میں شامل ہوگئیں —— علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ :۔——

" بالعموم عرب نہ پہلے سے اہل کتاب تھے، نہ علم رکھتے تھے۔ ان کے اوپر بدویت غالب تھی۔ جب ان کو موجودات کے اسباب ابتدائے تخلیق اور امم سابقہ کے حالات وغیرہ کے جاننے کا شوق ہوتا، تو ان اہل کتاب سے جو مسلمان ہوگئے تھے دریافت کرتے، یہ بھی زیادہ تر ان ہی کی طرح بدوی تھے اور ان امور ای قدر جانتے تھے جس قدر عوام اہل کتاب، انہیں کے بیانات لوگوں سے منقول ہو کر آیات کی تفسیروں میں داخل ہوگئے اور بوجہ اس کے کہ ان کا تعلق احکامِ شرعیہ سے نہ تھا تدوین کے وقت مفسروں نے مسامحت سے کام لے کر ان کی تنقید کی طرف توجہ نہیں کی اور انہیں کو کتب تفاسیر میں درج کر دیا[۵۱] —" (مقدمہ ابن خلدون) ——

عہدِ رسالت میں اہل کتاب میں سے جو حضرات اسلام لائے تھے ان میں سے سب سے پہلے یہودی عالم جن کو قرآن کریم نے " اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ " کہہ کر اہل علم میں شمار کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام ہیں جو ہجرتِ نبوی کے بعد ہی مدینہ میں اسلام لائے اور ان کا انتقال ۴۳ھ میں ہوا۔ ان سے حضرت ابوہریرہؓ اور انسؓ بن مالک نے روایت کی ہے۔ دوسرے حضرت سلمانؓ فارسی ہیں۔ یہ اصلاً مجوس بلکہ ایک آتش کدہ کے متولی کے عزیز فرزند تھے گھر سے نکل کر شام میں گئے وہاں عیسائیت اختیار کر لی۔ ایک مدت تک نصیبین اور اس کے بعد عموریہ میں رہے اور آسمانی کتابوں کا علم حاصل کیا، پھر عرب کی طرف آئے وادی القریٰ میں بنی کلب نے غداری کر کے ان کو غلام بنا ڈالا اور فروخت کر ڈالا، قسمت کی یاوری سے مدینے پہنچے وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لائے، حضرت عثمانؓ کی خلافت میں مدائن میں وفات پائی[۵۲]۔

جس طرح حضرت بلالؓ کو حبشیوں نے اور حضرت صہیبؓ کو رومیوں نے اپنا قومی افتخار اور نمونہ بنایا ہے۔ اسی طرح اہل فارس نے اسلام لانے کے بعد حضرت سلمانؓ فارسی کو اپنا قوم کا پیش رو قرار دیا، ان کے حالات میں غیر معمولی باتیں بڑھائیں اور ان کی طرف بہت سی روایتیں منسوب کیں، بالخصوص صوفیۂ عجم نے جن میں سے اکثر اپنا سلسلۂ ارادت ان تک پہنچاتے ہیں ——

تیسرے صحابیؓ جن سے اس قسم کی روایتیں آئی ہیں حضرت تمیمؓ داری ہیں جو ۹ھ میں مدینہ آکر مسلمان ہوئے تھے۔ یہ نصاریٰ یمن میں سے تھے اور قصہ گوئی کرتے تھے، یعنی گزشتہ انبیاء اقوام کے حالات سناتے تھے۔ حضرت عمرؓ کی خلافت میں ان سے قصہ گوئی کی اجازت طلب کی، مگر انہوں نے منظور نہیں فرمایا۔ آخر میں ان کے بہت اصرار کی وجہ سے صرف اس قدر اجازت دی کہ جمعہ کے دن اس سے پہلے کہ میں جماعت کے لئے نکلوں، تم قصے سنا لیا کرو، حضرت عثمانؓ کے عہد میں ان کو ہفتہ میں دو دن کی اجازت مل گئی[۵۳]۔ جساسہ اور دجال کی روایتیں انہیں سے مروی ہیں ۔

اس قصہ گوئی کی دو صورتیں ہوتی تھیں، ایک قصص عامہ کی کہ قصاص مسجد میں مسلمانوں کے مجمع میں بیٹھ کر ان کو دوسری قوموں کے وہ حکایات اور حالات سناتا، جو اس نے اپنے بزرگوں سے سنے تھے، دوسری قصص خاصہ جو کسی مخصوص بڑے آدمی کے سامنے بیان کئے جاتے تھے[۵۴]۔ عہد صحابہؓ ہی میں قصہ گوئی کا رواج عوام کی دلچسپی کی وجہ سے بہت بڑھ گیا اور چونکہ قصے کذب آمیز بلکہ زیادہ تر بے بنیاد افسانہ ہوتے

---

۵۱ مقدمہ ص ۳۶۷ — ۵۲ طبقات ابن سعد جلد ۴ صفحہ ۵۳ — ۵۳ اصابہ جلد ۱ صفحہ ۱۸۴ — ۵۴ خلد مقریزی جلد ۲ صفحہ ۲۵۳

اس وجہ سے حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ میں قصہ گویوں کو مسجدوں میں بیٹھنے کی ممانعت کردی۔[1]

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ تفسیر کا علم زیادہ علماء مکہ میں تھا جو حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد تھے۔ مثلاً عکرمہ، مجاہد اور عطاء، پھر اہل کوفہ میں جو حضرت ابن مسعودؓ کے اصحاب تھے جیسے حسن بصریؒ اور مسروق وغیرہ ——

اس عہد میں اسرائیلیات میں بہت اضافہ ہوا، کیونکہ عوام کا رجحان ان کی طرف بڑھ گیا تھا اور وہ اس کو علمی تحقیق سمجھنے لگے تھے کہ قرآن میں جن انبیاء اور اقوام کے قصص ہیں، ان کے متعلق مزید حالات کا پتہ لگائیں۔ اس لئے جزئی سے جزئی اور چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی دریافت کرنے لگے۔ مثلاً سفینۂ نوح کی مقدار اور وسعت، اس میں جن جانداروں کے جوڑے لادے گئے تھے، ان کے اقسام، حضرت ابراہیمؑ کے قصہ میں چاروں پرندوں کے واقعہ میں کے متعلق تحقیق۔

اصحاب کہف کے نام اور ان کے کتے کے رنگ و نسل،

غرض اسی قسم کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں امور کی بابت جن کو قرآن کریم نے لایعنی اور غیر ضروری ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا، بحث و تفتیش کرنے لگے، یہی معلومات روایات کے ذریعہ سے پھیلیں اور جب تفسیریں مدون ہوئیں تو ان میں درج کی گئیں۔ ان روایات کا سب سے بڑا مرجع دو شخص ہیں۔ ایک کعب بن ماتع حمیر کے یہودی تھے، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلام لائے اور مدینہ میں رہنے لگے۔ یہ کعب احبار کے نام سے مشہور ہیں ان سے حضرت عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کے توسط سے زیادہ روایتیں آئی ہیں۔ دوسرے وہب بن منبہ، یہ بھی یمن کے یہودی اور فارسی الاصل تھے، ان کی وفات صنعاء میں ۱۱۰ھ میں ہوئی۔ اسرائیلیات میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ علماء ثقاۃ مثلاً ابن قتیبہ یا امام نوویؒ وغیرہ نے ان کی کوئی روایت اپنی کتابوں میں درج نہیں کی۔ ابن جریر طبری نے اگرچہ ان سے قطعی پرہیز تو نہیں کیا ہے مگر بہت کم روایتیں لی ہیں لیکن ثعلبی وغیرہ نے انبیاء کے قصوں میں زیادہ تر انہیں کی مرویات درج کی ہیں[2]۔ یہاں اس حقیقت کا بھی ظاہر کردینا ضروری ہے کہ اس زمانہ میں عرب کے ہر حصہ سے زیادہ یہودی ثقافت یمن میں شائع تھی۔ یہی وجہ ہوئی کہ وہاں کے اہل کتاب مسلمانوں سے اس قسم کی روایتیں زیادہ منقول ہوئیں ——

تنقید و تفسیر زیادہ تر اسی زمانہ میں یعنی تیسری صدی ہجری میں ائمہ جرح و تعدیل نے راویوں اور روایتوں کی تنقید کی، تفسیری روایات کا بڑا حصہ بوجہ ان کے رواۃ کے ضعف کے مشکوک ثابت ہوا۔ کیونکہ ضحاک بن مزاحم، مقاتل بن سلیمان ابوصالح مصری، محمد بن سائب کلبی، السدی محمد بن مروان، بشیر بن عمار اور عوفی وغیرہ جن سے زیادہ تر یہ روایتیں آئی ہیں، جانچنے سے کمزور بلکہ بعض ان میں وضاع نکلے[3]۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ صحابۂ کرامؓ میں حضرت علیؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کے نام سے تفسیر کی روایتیں زیادہ آئی ہیں اور یہی رواۃ کی کمزوری کی وجہ سے عام طور پر موضوع اور مجعول نکلیں جس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے شیعہ انہیں اقوال کو زیادہ احترام اور قبولیت کی نظر سے دیکھتے تھے جو ان کے نام کے ساتھ منسوب ہوں، اس لئے شیعہ رواۃ بیشتر انہیں کے نام روایتیں کرتے تھے، بلکہ جو بات ان کے ذہن میں ایسی آتی تھی جن سے حضرت علیؓ کا رتبہ ظاہر ہو اس کو بھی ان کی طرف سے منسوب کردیتے تھے۔ چنانچہ ابن ابی جمرہ نے روایت کی ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اگر میں چاہوں تو صرف فاتحہ کی تفسیر سے ستر اونٹوں کا بوجھ تیار کردوں[4] —— وضع کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ حضرت علیؓ کے نام جو روایتیں کی گئی ہیں ان کی کل تعداد ۶۸۶ ہے جن میں سے محدثین کے نزدیک اصول کی رو سے صرف پچاس صحیح ہیں[5] ——

---

[1] فجر الاسلام ص ۲۸۸ [2] فجر الاسلام ص ۱۹۰ [3] مراۃ التفسیر ص ۲۰ سے ص ۲۸ تک [4] فجر الاسلام ص ۲۳۸
[5] الملل والنحل لابن حزم ج ۴ ص ۱۳۷ ——

حضرت ابنِ عباسؓ جن کی نسل سے خلفاء عباسیہ تھے، مقربینِ بارگاہ کا مخصوص موضوع تھے، قرآنِ کریم کی کوئی آیت بلکہ کوئی لفظ خالی نہ ہوگا جس کی تفسیر میں ان سے روایت نہ کی گئی ہو، ان کی کُل روایتوں کی تعداد ۱۶۶۰ ہے جن میں امام شافعیؒ کے قول کے مطابق زیادہ سے زیادہ سو ایسی ہیں جو صحیح مانی گئی ہیں [ف۱] ــــ

ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے جتنے طرق ہیں، ان میں سب سے معتبر طریقہ، ابنِ صالح عن علی بن ابی طلحہ عن ابنِ عباس ہے۔ مگر جملہ حفاظِ حدیث کا اجماع ہے کہ علی بن ابی طلحہ کی لقاء حضرت ابنِ عباسؓ سے ثابت نہیں ہے وہ جو کچھ ان کے نام سے کہتے ہیں۔ دراصل مجاہد اور سعید بن جبیر کی روایتیں ہوتی ہیں ــــ دوسرا طریق جس کو محدثین نے شیخین یعنی امام بخاریؒ اور مسلمؒ کی شرط کے مطابق تسلیم کیا ہے قیس عن عطاء بن السائب عن سعید بن جبیر عن ابی عباسؓ ہے۔ مگر اس سلسلہ سے صرف چند ہی روایات ہیں۔ باقی دوسرے تمام طرق مجروح ہیں۔ جویبر عن ضحاک سخت ضعیف سلسلہ ہے۔ ابنِ جریج نے جو کچھ روایت کیا ہے، اس میں صحت کا خیال ہی نہیں رکھا۔ کلبی کی روایتیں سب سے زیادہ کمزور ہوتی ہیں اور اس کے ساتھ جب مروان بن محمد بھی شامل ہوجائے تو یہ سلسلہ سرتاپا کذب ہو جاتا ہے۔ [ف۳] ــــ

یہی وجوہات ہیں جن کی بناء پر بعض اکابر ائمہ نے تفسیری روایتوں کی صحت کا سرے سے انکار ہی کردیا۔ چنانچہ امام احمدؒ بن حنبل جو جرح و تعدیل کے امام اور بخاریؒ اور مسلمؒ کے استاد ہیں کا قول ہے کہ تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں، مغازی، ملاحم اور تفسیر [ف۴] ہر چند کہ امام موصوف کے اس قول میں تاویل کی گنجائش نہیں ہے لیکن ان کے تلامذہ نے کہا ہے کہ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ بیشتر حصہ ان روایات کا ناقابلِ اعتماد ہے۔ غالباً اس تاویل سے ان کا منشاء یہ ہے کہ ائمہ حدیث نے جن تفسیری روایتوں کو اصولِ حدیث کے مطابق صحیح قرار دیا ہے وہ اس سے مستثنیٰ ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ جو روایتیں صحیح قرار دی گئی ہیں ان میں بھی تنقید کی ضرورت ہے مثلاً القناطیر المقنطرہ کی تفسیر میں امام حاکمؒ نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ قنطار ایک ہزار اوقیہ کا ہوتا ہے اور ابنِ ماجہ میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ بارہ ہزار اوقیہ کا۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے صرف ایک ہی صحیح ہوسکتی ہے مگر محدثین نے دونوں کو صحیح کہا ہے [ف۵] ــــ

علمی تفسیریں

اب تک جتنی قدر تفسیریں لکھی گئی تھیں وہ خالص منقولی تھیں، یعنی روایات کا مجموعہ، لیکن چوتھی صدی ہجری میں مسلمانوں میں مختلف قسم کی علمی تحریکات پیدا ہوگئی تھیں، صرف و نحو، بلاغت و معانی، فقہ و اصول، منطق و فلسفہ، کلام و تصوف وغیرہ کا عام رواج ہوچکا تھا، ان علوم کے حاملین نے جو تفسیریں لکھیں، ان میں بیشتر اپنے فنی زاویۂ نظر سے الفاظ و آیات کی تشریح میں بحثیں شروع کیں اور روایات کے ساتھ ساتھ اجتہاد کا دروازہ بھی کھول دیا۔ علاوہ بریں نئے نئے مذہبی فرقے بھی پیدا ہوگئے تھے، ان اہلِ مذاہب نے بھی اپنے عقائد و خیالات کے مطابق آیات کی تفسیریں کیں، جن کی وجہ سے اختلافات کی بہت کثرت ہوگئی اور تفسیروں کی نوعیتیں متعدد ہوگئیں، مثلاً زجاجؒ اور کسائیؒ وغیرہ نے جو صرف و نحو کے امام تھے اپنی تفسیروں میں خصوصیت کے ساتھ لفظی تصرفات اور وجوہِ اعراب سے بحثیں کیں، ثعلبیؒ اور ابنِ اثیرؒ نے جن کو تاریخ کا ذوق تھا قصص کی تفصیلوں کی طرف رجحان رکھا۔ فقیہ ابواللیث سمرقندیؒ اور علامہ سمرقندی نے فروعاتِ فقہ پر آیات سے استدلال میں توجہ صرف کی۔ ابومسلم اصفہانیؒ اور زمخشریؒ نے معتزلی عقائد کے اثبات کی کوشش کی۔ اسفرائینی اور رازی نے اشعری اصول کے مطابق متکلمانہ بحثیں لکھیں، عبدالقاہر جرجانی اور ابوہلال عسکریؒ نے بلاغت و معانی کے لطائف ظاہر کئے، محی الدین ابنِ عربی اور واحدی وغیرہ نے تصوف کا رنگ بھرا اور شیعہ مفسروں نے آیات کو اپنے مذہبی خیالات کے مطابق بنانے سے سروکار رکھا۔ غرض اس وقت سے ہر زمانہ کی تفسیر اس زمانہ

ف۱ مراۃ التفسیر ص۱۳ ۔ ف۲ الاتقان جلد ۲ ص۱۹۵ ۔ ف۳ الاتقان جلد ۲ ص۱۹۵ ۔ ف۴ تذکرۃ الموضوعات للشیخ محمد طاہرؒ ص۸۲۔

ف۵، الاتقان جلد ۲ صفحہ ۱۹۹ ــــ

کی علمی بحثوں اور تحریکوں سے متاثر اور ہر فرقہ کی تفسیر اس کے عقائد و خیالات کی آئینہ نظر آتی ہے ــــ

ان وجوہات سے اگرچہ تفسیروں میں وُسعت تو بہت پیدا ہوگئی لیکن بیجا تاویلات کا بھی راستہ کُھل گیا اور اکثر فرقوں نے آیات قرآن کو اپنے خیالات کے مطابق اس طرح ڈھالنے کی کوششیں کیں، جن کو معنوی تحریف کہنا بجا ہے۔ اس بے اعتدالی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ تفسیر کے اصول نہیں متعیّن کئے گئے۔ علماء اصول نے جو کچھ لکھا ہے وہ الفاظ کے استعمال کے متعلق چند عام قیاسی قاعدے ہیں جو بالکل ناکافی ہیں۔ علّامہ فناریؒ نے تصریح کی ہے کہ علم تفسیر میں بجز چند امور کے اصول مطلقاً نہیں ہیں۔ جس پر ان کی جزئیات کا مدار ہو۔[1]

(۱) ان مفسّروں نے قرآن کی تفسیر کا جو طریقہ رکھا ہے، وہ وہی ہے جس کے مطابق کسی انسانی کتاب کی تشریح کی جاتی ہے۔ یعنی فاتحہ سے شروع کرکے ایک ایک آیت کی سلسلہ وار تفسیر لکھتے چلے جاتے ہیں اور خاتمہ تک پہنچا دیتے ہیں اس طرح آیات و الفاظ کے معانی کی شرح تو ضرور ہوجاتی ہے مگر قرآن سمجھ میں نہیں آتا، یعنی اس کی کوئی تعلیم حاصل نہیں ہوتی، اس لئے کہ اس کی تعلیمات اس ترتیب اور ربط کے ساتھ نہیں بیان کی گئی ہیں جس طرح انسانوں کی کتابوں میں بیان کی جاتی ہیں، بلکہ اس کی تعلیم متعدد سُورتوں اور آیتوں میں اس کے طول و عرض میں بتدریج اُتاری گئی ہے تا وقتیکہ کسی خاص مسئلہ کے متعلق تمام تعلیمات متفرق سُورتوں سے نکال کر جمع نہ کرلی جائیں اور ان کو صحیح ترتیب کے ساتھ مرتب نہ کیا جائے، اس مسئلہ کی پُوری قرآنی تعلیم ہرگز سمجھ میں نہیں آسکتی، لہٰذا، ان تفسیروں نیز ترجموں سے جو بسلسلہ آیات کے ساتھ چلتے ہیں، قرآنی تعلیمات کی توضیح نہیں ہوسکتی۔ فہم قرآن کے لئے ان تفسیروں کی نوعیّت تقریباً وہی ہے جو فنِ طب میں کُتب مفردات کی ہے جن میں حروفِ تہجّی کی ترتیب کے ساتھ دواؤں کے نام، خواص، آثار اور بدل وغیرہ لکھ دیئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص ان کو پڑھ کر طبیب نہیں ہوسکتا۔ بجنسہٖ اسی طرح ان تفاسیر و تراجم کے مطالعہ سے بھی کوئی شخص حقائقِ قرآنی کا عالم نہیں ہوسکتا ــــ

(۲) اکثر تفاسیر میں آیات و الفاظ کی تشریحات روایات سے کی گئی ہیں۔ ان کا بڑا حصّہ خود محدّثین کے نزدیک موضوع ہے۔ چنانچہ امام احمد حنبلؒ نے جن کے اُوپر حدیث کی امامت منتہی ہوئی کہدیا ہے کہ تفسیری روایتیں تمام تر بے اصل ہیں۔ اسرائیلیات لائی جاتی ہیں جو بیشتر ناقابلِ اعتبار ہیں۔ یہی حال اسبابِ نزول کی روایتوں کا ہے۔ قدیم مفسّروں نے ان روایتوں کے سلسلۂ اسناد بھی لکھے تھے، جن سے صحیح اور غیر صحیح کی تمیز ہوسکتی تھی، مگر متاخرین نے ان کو بھی حذف کردیا۔ اور اپنی تفسیروں میں ان روایات کو بلا اسناد کے نقل کرنے لگے، جس کے باعث عوام میں ان کی حیثیت مسلّمات کی سی ہوگئی اور بہت سی آیتوں کی غلط تفسیریں اُمّت میں رائج ہوگئیں، یہی سبب ہے کہ جس قدر تفاسیر کی کثرت ہوتی گئی، اسی قدر مسلمانوں کو قرآنِ کریم کی اصلی اور صحیح تعلیم سے بُعد ہوتا گیا ــــ

(۳) ایک خاص شکایت یہ ہے کہ ان تفسیر نگاروں نے خود اپنے دماغوں سے بہت کم محنت لی ہے۔ الّا ماشاء اللہ زیادہ تر متقدمین ہی کی باتیں اور روایتیں نقل کرتے چلے آئے ہیں بعض بزرگ تو اس قسم کے گزرے ہیں جنہوں نے اپنی تفسیریں محض ثواب کا ذخیرہ اور جنّت کا ذریعہ سمجھ کر لکھی ہیں، یعنی تقرّباً الی اللہ خدّامِ قرآن میں داخل ہوگئے، بحالیکہ ان کی تفسیروں میں کوئی چیز ایسی نہیں ملتی جس پر کسی طالبِ قرآن کی زبان سے ان کے لئے مغفرت کی دُعا نکلے، یا جو بوجھ اپنی تصنیف کا وہ پڑھنے والوں پر ڈال گئے ہیں۔ اس کی کوئی تلافی ہوسکے۔ بیشتر اسی قسم کی تفسیریں تھیں جو معدوم یا متروک ہوگئیں، کیونکہ یہ حقیقت ہے جس کو قرآن نے سکھلایا ہے کہ:- وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ "وہی چیز دُنیا میں رہے گی جو لوگوں کے لئے نفع رساں ہوگی ــــ"

جن لوگوں نے دماغ سے کام لیا ہے، ان میں سے اکثر ایسے ہیں جنہوں نے اپنے خاص عقیدوں کو موقع بے موقع قرآن کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور بعض نے محض جدّتِ طبع دکھائی ہے، مثلاً ایک مفسّر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول لِیَطْمَئِنَّ

---

[1] مرآۃ التفسیر ص۔

قَلْبِیْ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ قلبی ان کے ایک دوست تھے۔ یا کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْکُتُبِ کی تفسیر میں بعضوں نے کہا ہے کہ سجل آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے کاتب کا نام تھا۔ حالانکہ تمام ائمہ حدیث و تاریخ متفق ہیں کہ اس نام کا کوئی صحابی نہیں ہے۔ یا مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ کی تفسیر علیؓ و فاطمہؓ اور لولو والمرجان کی تفسیر حسنین رضی اللہ عنہم یا الصَّابِرِیْنَ وَالصَّادِقِیْنَ وَالْقَانِتِیْنَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ کی تفسیر میں صابر سے مُراد رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم، صادق سے صدیقؓ، قانت عُمر فارُوقؓ، منفقین سے عثمان غنیؓ، اور مستغفرین سے حضرت علی رضی اللہ عنہم، غرض اسی طرح کی سینکڑوں آیات ہیں جو ان حضرات نے مسخ کی ہیں[۵۱] ـــــ

(۴) ـــ یہ مفسّرین بالعموم قرآن میں نسخ کے قائل ہیں۔ چنانچہ بہت سی محکم اور یقینی آیتوں پر بھی نسخ کے احکام لگاتے چلے جاتے ہیں بلکہ جن لوگوں نے ناسخ اور منسوخ پر کتابیں لکھی ہیں ان کی تو کوشش یہی معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر ہو سکے نسخ دکھلائیں۔ ان کے بیان کے مطابق نصف بلکہ اس سے بھی زیادہ احکامی آیات منسوخ ہیں، غرض اس نسخ کے عقیدہ نے بھی تفسیروں کے اندر ایک عجیب پیچیدگی پیدا کر دی ہے ـــــ (۵) یہ مفسّرین بہت سی آیتوں کی تفسیر میں متعدد معانی اور مختلف اقوال نقل کرتے ہیں۔ مثلاً غیر المغضوب علیھم و لا الضّالین ؕ کی تفسیر میں دس قول ہیں۔ وَالفجر ولیال عشرٍ کی متعدد تفسیریں ہیں۔ و شاھدٍ وّ مشھود کی شرح میں کئی باتیں کہی گئی ہیں۔ اصحاب الاخدود کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ وہ اہل فارس تھے یا یمن کے باشندے تھے یا حبشی یا نجرانی باشندے تھے[۵۲]۔ الغرض سینکڑوں الفاظ و آیات ہیں جن کی کئی کئی تفسیریں یا، یا کر کے لکھتے چلے جاتے ہیں اور کسی ایک بات کو جزم و یقین کے ساتھ بیان نہیں کرتے، ان میں سے صحیح مفہوم کے فیصلہ کی قوت خود ان کے اندر مفقود ہوتی ہے۔ حالانکہ صحیح مفہوم ایک اور صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ ایسی تفسیروں سے بجائے اس کے آیات کی توضیح ہو، وہ اور مبہم ہو کے رہ جاتی ہے ـــــ

(۶) ـــ ان مفسّروں کو قرآنی حقائق کی جستجو کم اور غیر متعلّق اور غیر ضروری باتوں کی تلاش زیادہ رہتی ہے۔ جنّت کا ذکر ہے تو اس کے پیالوں اور آبخوروں کی تعداد کا شمار اور کوثر اور طوبیٰ کی پیمائش کریں گے، دوزخ کے بیان میں اس کے طبقوں کی گہرائی اور سانپوں اور بچھوؤں کی درازی ناپیں گے، جنگِ بدر میں فرشتوں کے نزول کی حقیقت سمجھانے کے بجائے ان کے چہروں، گھوڑوں اور عماموں کے رنگ اور ان کی سواری و حملہ و قتال کی کیفیّت لکھیں گے۔ یاجوج ماجوج کے تاریخی حالات بیان نہیں کریں گے بلکہ کوئی لکھے گا کہ ان کے قد اس درخت کے مشابہ ہیں، جو ملک شام میں نظر آتا ہے اور جس کی بلندی ایک سو بیس گز ہوتی ہے اور کوئی لکھے گا کہ ان کا ایک کان اوڑھنا ہے اور دوسرا بچھونا۔ اگر ان چیزوں کا موقع نہیں پائیں گے تو فصاحت و بلاغت کی لطافتیں دکھلانے لگیں گے یا خیالی فلسفیانہ بحثوں میں اُلجھ جائیں گے۔ علم فطرت فعلِ الٰہی ہے، کتاب مبین علمِ الٰہی ہے اور قرآن کریم قولِ الٰہی ہے اور یہ تینوں متحد ہیں ـــــ

جس طرح صحیفۂ فطرت کے حقائق کی وسعت بے پایاں ہے۔ اسی طرح قرآنی حقائق کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اور انسانی نسلیں ابدالآباد تک بھی ان کو ختم نہیں کر سکتیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن بنی نوع انسان کی ہدایت کا نصاب مقرّر کیا گیا ہے۔ مزید توضیح کیلئے یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ مصنوعاتِ فطرت اور مصنوعاتِ انسانی میں اس قدر بدیہی فرق ہے کہ ہر انسان بلا کسی قسم کے ریب اور شک کے ان دونوں میں امتیاز کر لیتا ہے، مثلاً زمین، دریا، اور پہاڑ اور جنگل کو دیکھ کر سب کو یقین کے ساتھ علم ہو جاتا ہے کہ یہ فطری چیزیں اور اگر زمین پر کوئی عمارت یا پہاڑ میں کوئی بُت یا دریا میں کوئی کشتی یا جنگل میں کوئی گاڑی نظر آئے تو ہر شخص بلا کسی اشتباہ کے سمجھ جاتا ہے کہ یہ انسانی ساخت ہے ـــــ

[۵۱] تذکرۃ الموضوعات صہ ۸۴ ـ [۵۲] تفسیر جامع البیان ـ

درخت پر سے گرا ہُوا پتہ، گھاس میں سے جھڑا ہُوا ایک تنکہ، چیونٹی کا ٹوٹا ہُوا ایک پاؤں اور بھیڑ کا گرا ہُوا ایک بال اگر سارے عالم کے ماہر اور کاریگر جمع ہو کر بھی بنانا چاہیں تو نہیں بنا سکتے۔ یہی فرق اللہ کے کلام اور انسان کے کلام میں ہے ——

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (۱۷/۸۸)

کہدے کہ اگر سارے جنّ و انس اس بات پر متفق ہوں کہ قرآن جیسا کلام بنائیں تو بھی ویسا نہیں بنا سکتے۔ اگرچہ وہ سب ایک دوسرے کے مددگار کیوں نہ ہوں ——

لیکن معنوی حقائق چونکہ عقلی چیزیں ہیں اس لئے یہ فرق سر کی آنکھوں سے نظر نہیں آسکتا بلکہ دل کی آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے اور یہی امتیاز قرآن کا وہ زندہ معجزہ ہے جو جاودانی ہے اور اہلِ بصیرت پر سورج کی طرح نمایاں ہے۔ جن لوگوں نے آیاتِ الٰہی کا اقوالِ انسانی کے سامنے موازنہ کر کے اس کے اعجاز دکھانے کی کوشش کی ہے اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ کس بے بصری میں مبتلا تھے ——

دوسرا فرق مصنوعاتِ فطرت اور مصنوعاتِ انسانی میں یہ ہے کہ فطرتی اشیاء کے منافع اور تاثیرات کی کوئی حد نہیں معیّن کی جا سکتی۔ بلکہ ان کے متعلّق جس قدر معلومات بڑھتی جاتی ہیں اس قدر ان کے افعال و خواص معلوم ہوتے جاتے ہیں۔ بخلاف انسانی مصنوعات کے جو ایک معیّن اور مخصوص غرض و غایت کے لئے بنائی جاتی ہیں اور ان سے وہی نفع لیا جاتا ہے جس کو پہلے سے مدِّنظر رکھ کر وہ بنائی گئی ہیں۔ یہی کیفیت خالق اور مخلوق کے کلام کے مراتب کی ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے وہ کسی ایک ماحول۔ ایک زمان یا ایک مکان کے لئے نہیں ہے بلکہ ہر ماحول ہر زمان اور ہر مکان کے لئے ہے۔ حقائقِ فطرت کے متعلّق جس قدر انسان کا علم بڑھتا جائے گا۔ اسی قدر قرآنی حقائق بھی اس کی سمجھ میں آتے جائیں گے اور قرآن بھی فطرتی اشیاء کی طرح کسی زمانہ میں ختم ہو جانے والا اور تھک جانے والا نہیں ہے۔ بخلاف انسانی اقوال کے کہ ان کے معانی محدود ہوتے ہیں اور ان کی غرض معیّن ——

اصولِ قرآن

اب ہم خود قرآنِ کریم ہی سے فہمِ قرآن کے وہ اصول بیان کرتے ہیں جو ہم نے اس سے اخذ کئے ہیں، کیونکہ قرآن جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں جو اپنی کسی بات میں بھی دوسری کسی چیز کا محتاج نہیں ہے ——

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (۷/۳)

اس کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اُتارا گیا اور اس کے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو۔

(۱) —— قرآن فہمی کا اصل الاصول یہ ہے کہ اس کی بیان کی ہوئی جس حقیقت کی تفصیل مطلوب ہو وہ قرآن ہی سے نکالی جائے۔ کیونکہ قرآن کی تفسیر اللہ نے اپنے ذمّہ لی ہے ——

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ؕ (۷۵/۱۹) پھر اس کی تشریح بھی ہمارے ذمّہ ہے۔

قرآن نے تصریح کر دی ہے کہ آیاتِ قرآنی بیشتر محکمات ہیں یعنی ان کے معانی قطعی اور متعیّن ہیں۔ تھوڑی سی متشابہات ہیں۔ جن کے حقائق انسان کی علمی دسترس سے بالاتر ہیں۔ مثلاً اللہ کی ذات، صفات، جنّت، دوزخ اور میزانِ عمل وغیرہ جن کو تمثیل اور تشبیہ کے طور پر قرآن میں بیان کیا گیا ہے —— اور جن کی اصل حقیقت سمجھنے سے انسان اس دُنیا میں قاصر ہے۔ ان کے اُوپر صرف ایمان کا مطالبہ ہے نہ کہ عمل کا۔ اس وجہ سے ان کی تفصیل مطلوب نہیں ہے۔ البتہ محکم آیات جو اُمّ الکتاب اور اصل قرآن کہی گئی ہیں۔ ان کی تفصیلات اللہ ہی طرف سے کی گئی ہیں ——

كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ (۱۱/۱)

(ترجمہ) یہ (مکمل) کتاب ہے جس کی آیتیں محکم بنائی گئی ہیں۔ پھر حکمت اور خبر رکھنے والے اللہ کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی ہے۔

یہ تفصیل علم کے ساتھ کی گئی ہے :——

وَلَقَدْ جِئْنَاهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ (۷/۵۲) - ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے جس کی تفصیل ہم نے علم کے ساتھ کی ہے۔

یہ تفصیل اہلِ علم وفہم کے لئے ہے :——

قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (۶/۹۷) - ہم نے آیات کی تفصیل ان لوگوں کے لئے کی ہے جو علم رکھتے ہیں ——

قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ (۶/۹۹) - ہم نے آیات کی تفصیل ان لوگوں کے لئے کی ہے جو فہم رکھتے ہیں ——

جس قدر انسان کا علم حقائقِ فطرت کے متعلق بڑھتا جائے گا اُسی قدر وہ قرآنی تفصیلات سمجھنے کے قابل ہوگا۔ اگر فہم معانی میں اختلاف واقع ہوں تو قرآن ان کو رفع کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ جس طرح کہ امورِ فطرت کے محققین میں کبھی کبھی نظریوں کا اختلاف واقع ہوجاتا ہے لیکن مزید غور وفکر سے رفتہ رفتہ آخرکار وہ مٹ جاتا ہے اور سب کے سب ایک حقیقت پر پہنچ کر متحد الخیال ہوجاتے ہیں ——

قرآنی آیات جو اکثر بہ تبدیل الفاظ وعبارات جابجا اُلٹ پھیر کے بیان کی گئی ہیں ان میں ان کی تشریح مضمر ہے ——

وَكَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ وَلِيَقُولُوا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهُ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (۶/۱۰۵) | اور اُسی طرح ہم آیتوں کو پھیر پھیر کے لاتے ہیں تاکہ وہ کہدیں کہ تُو نے پڑھ کر سُنا دیا اور ہم اہل علم کے لئے تشریح کردیں ——

الغرض قرآن کریم کی تفصیل خود قرآن ہی میں ہے اور وہ مفصّل کتاب ہے ——

وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا (۶/۱۱۴) اور وہی ہے اللہ جس نے تمہاری طرف کتاب اُتاری تفصیل شدہ۔

اس لئے تفسیرِ قرآنی کی صورت یہ ہے کہ جس طرح حقائقِ فطرت کے مفکّرین اپنی علمی تحقیق کے لئے ایک خاص شعبہ کو جس میں ان کو مہارت ہوتی ہے مخصوص کرلیتے ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ جو علومِ صحیحہ میں سے کسی علم کے ماہر ہوں قرآن کی ان مخصوص آیات کی تفصیل جو ان کے علم سے تعلق رکھتی ہیں اپنے ذمّہ لیں اور ان پر علم وبصیرت کے ساتھ غور وفکر کریں۔ اس طرح پر قرآنِ کریم کی تفصیل ہوتی جائے گی اور عالمِ فطرت کی طرح اس کے حقائق بھی آشکارا ہوتے جائیں گے۔ لیکن علم کے ساتھ اخلاص بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آتا —— بے شک قرآن سے نصیحت لینا اور اس پر عمل کرنا عوام کے لئے بھی سہل ہے جس طرح کہ عالمِ فطرت کی نعمتوں سے متمتع ہونا جاہلوں کے لئے بھی آسان ہے مگر عالمِ فطرت پر غور کرنے والوں نے ہزارہا چیزیں جو ایجاد کی ہیں وہ ان کے فہم سے بالاتر ہیں۔ اسی طرح قرآنی حکمت تک رسائی علومِ صحیحہ کے ساتھ ہی ہوسکتی ہے ——

اس سے یہ امر واضح ہوگیا کہ قرآن کی موجودہ تفسیریں جو آج تک ہوئی ہیں ان سے آیات کے معانی حل ہونے ہیں اور یہ ضروری اور —— ابتدائی چیز ہے لیکن کسی قرآنی حقیقت کی توضیح کے لئے سارے قرآن کو چھاننا پڑے گا۔ اور اس لحاظ سے ابھی تک قرآن پر بہت کم توجہ کی گئی ہے ——

۲ —— آیات کی تشریح میں روایات سے مدد لی جاسکتی ہے۔ لیکن چونکہ روایات سنداً خام ہوتی ہیں اس لئے ان پر تفسیر کا مدار نہیں رکھا جاسکتا۔ تاریخ تفسیر میں ہم امام احمد بن حنبلؒ کا قول نقل کرچکے ہیں کہ "تفسیری روایتیں بوجہ ضعف رواۃ کے بے اصل ہیں"۔ عام خیال یہ ہے کہ صحاح ستہ میں جو روایات ابواب التفسیر میں آئی ہیں وہ صحیح ہیں لیکن ان پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ ابھی امام موصوف کے قول سے مستثنیٰ نہیں ہیں —— قرآنِ کریم کے الفاظ جس حد تک لے چلیں اس سے آگے مطلق قدم نہ بڑھایا جائے کیونکہ قرآن کا ہر لفظ اپنی جگہ پر اپنے معنی کے لحاظ سے کامل اور مقصود کے مطابق ہے ——

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ط اور تیرے رب کے الفاظ سچائی اور (معنی کی) برابری کے لحاظ سے پورے ہیں۔

ان کلمات سے آگے بڑھنے میں قرآنی حدود سے تجاوز لازمی ہے جو بڑی غلطیوں کا موجب ہوسکتا ہے۔ مثلاً :۔

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ (۱۵/۲۴-۲۵)

ہم کو تم میں سے آگے جانے والوں کا بھی علم ہے اور پیچھے آنے والوں کا بھی علم ہے۔ بیشک تیرا رب ان کو حشر میں جمع کریگا۔

مستقدم اور متاخر کے الفاظ قرآن میں کئی جگہ پہلے اور پیچھے مرنے والوں کے لئے مستعمل ہوئے ہیں۔ مثلاً :۔

اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ۔ (۱۰/۴۹)

جب ان کی اجل آجائے گی تو ایک گھڑی نہ وہ پیچھے رہیں گے، نہ آگے بڑھیں گے ——

یعنی اپنے وقتِ معینہ پر ان کی ہلاکت واقع ہو جائے گی۔ اس لئے قرآن کی تفصیل کے مطابق "ولقد علمنا المستقدمین" کے معنی یہ ہوئے کہ تم میں سے جو لوگ پہلے گزر گئے اور جو بعد میں مریں گے ان سب کا ہم علم رکھتے ہیں اور حشر کے دن ان سب کو جمع کریں گے لیکن بعضوں نے اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے کہ ایک حسین عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نمازِ جماعت پڑھنے کے لئے مسجد میں آیا کرتی تھی کچھ لوگ آگے کی صف میں بڑھ جاتے تھے تاکہ اس کو نہ دیکھیں اور کچھ پیچھے کی صف میں رہ جاتے تھے اور رکوع کی حالت میں بغل میں سے اس کی طرف جھانکتے تھے انہیں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ——

اب یہ معنی نکالنے کے لئے آیت میں پہلی صف اور پچھلی صف کے الفاظ کا اضافہ کرنا پڑتا ہے جو اصولاً جائز نہیں۔ پھر صحابۂ کرامؓ کی ایک جماعت پر ایسا مکروہ الزام عائد ہوتا ہے جس کو کوئی شخص جو ان کے حالات سے واقف ہے تسلیم نہیں کرسکتا۔ اگرچہ یہ روایت صحاح ستہ کی تین کتابوں میں درج ہیں لیکن خود قرآنی تفصیل کی مخالف ہونے کی وجہ سے قابلِ قبول نہیں ہے ——

۵ —— جہاں تک زبان کا تعلق ہے قرآن کی عربی آسان اور واضح ہے جس میں کوئی پیچیدگی نہیں :۔

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ۔ (۲۶/۱۹۵) —— واضح عربی زبان میں ——

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ۔ (۳۹/۲۸) عربی قرآن جس میں کوئی کجی نہیں ——

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ (۴۴/۵۸) ہم نے اس قرآن کو تمہاری زبان میں آسان کردیا ہے ——

لہٰذا، قرآن کے معنی وہی لئے جائیں گے جو عربی زبان کے مطابق صحیح ہوں۔ اہلِ لغت نے جو معانی الفاظ کے لکھے ہیں ان کی بنیاد سماع پر ہے۔ قرآنی الفاظ کے معانی میں اگر اختلاف واقع ہو تو خود قرآن سے ان کا تعین ہوسکتا ہے ——

اصول و قواعد لسانی کی ترتیب بھی نزولِ قرآن کے مدّتوں بعد ہوئی ہے۔ بلکہ ان کا بڑا حصہ ائمہ فن نے خود قرآن ہی سے استنباط کیا ہے۔ لہٰذا، یہ اصول قرآن پر حاکم نہیں ہوسکتے، اگر کوئی بات قرآن میں اصول کے خلاف ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ جن لوگوں نے اصول استنباط کئے ان سے کمی رہ گئی ہے ——

۶ —— ایک اہم اصول قرآن فہمی کا یہ ہے کہ اس کی تعلیمات میں اختلاف نہیں ہے :۔

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۔ (۴/۸۲)

اور اگر یہ قرآن اللہ کے سوا کسی غیر کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں بہت اختلاف پاتے ——

اس لئے کسی آیت کی تفسیر نہیں کی جاسکتی جو دوسری آیت کے خلاف پڑتی ہو :۔ مثلاً :۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ط

قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ ط (۱۰/۱۸)

عام مفسروں نے آیتِ بالا میں لَا يَعْلَمُ کا فاعل اللہ کو قرار دیا ہے۔ یعنی اللہ کی طرف لاعلمی منسوب کی ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ نے بھی اس کا ترجمہ یہ کیا ہے :——

" اور پُوجتے ہیں اللہ کے نیچے جو چیز نہ بُرا کرے ان کا نہ بھلا کرے اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے پاس تو کہہ کہ تم اللہ کو جتاتے ہو، جو اس کو معلوم نہیں کہیں آسمانوں میں نہ زمینوں میں "——

یہ تفسیر یا ترجمہ علاوہ اس کے کہ جسارت ہے جو کسی مسلمان کے لئے زیبا نہیں براہِ راست خود قرآنی تصریح کے خلاف ہے۔

قرآنِ کریم میں ہے :——

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ | جس شے کو بھی وہ اللہ کے ماسوا پکارتے ہیں اللہ اس کو جانتا ہے۔

پھر یہ مشرکین اللہ کو اپنے باطل معبودوں کی خبر ہرگز نہیں دیتے بلکہ ان کے توسط سے خود اپنی حاجتوں کی خبر اللہ تک پہنچانا چاہتے ہیں اور یہی معنیٰ سفارشی بنائے گئے ہیں۔ ورنہ اگر وہ اللہ کو اپنے معبودوں کی خبر دیتے تو خود اپنا حال بھی اس سے کہہ سکتے ہیں۔ بیچ میں سفارشی کیا ضرورت تھی۔ اس آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے :——

" اور وہ اللہ کے سوا ان کی پرستش کرتے ہیں جو ان کو ضرر پہنچا سکتے ہیں نہ نفع۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں۔ کہہ دے کہ کیا تم اللہ کو ان کے ذریعہ سے خبر پہنچاتے ہو جن کو آسمان اور زمین کی کسی شے کا علم نہیں ہے "۔

۷ —— پہلے یہ اشارہ گزر چکا ہے کہ قرآن کی تفسیر میں نسخ کے عقیدہ نے بہت خرابیاں پیدا کی ہیں۔ مفسرین تین قسم کی نسخ کے قائل ہیں۔

(۱) وہ آیات جن کا حکم بھی منسوخ ہو گیا اور وہ پڑھی لکھی بھی نہیں جاتیں ——

یہ خیال چند نہایت ضعیف بلکہ موضوع روایات سے پیدا ہوا۔ جن کو اکثر ائمہ حدیث خاص کر قاضی ابوبکر نے موضوعات کی فہرست میں شمار کیا ہے۔ اب چونکہ وہ آیتیں موجود نہیں نہ ان کے احکام باقی ہیں۔ اس لئے ان پر بحث بھی غیر ضروری ہے ——

(۲) وہ آیات جن کا حکم نہیں منسوخ ہوا، تلاوت منسوخ ہو گئی ——

نسخ کی یہ قسم عقل کے بالکل خلاف ہے کیونکہ اگر حقیقت میں کوئی ایسی آیت ہوتی تو ناممکن تھا کہ اللہ اس کی حفاظت نہ کرتا۔ مثال میں آیتِ رجم پیش کی جاتی ہے۔ حالانکہ اگر واقعی آیتِ رجم نازل ہوئی ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ قرآن میں درج ہونے سے رہ جاتی۔ خود حضرت عمرؓ جن سے یہ روایت کی گئی ہے جمع قرآن میں شریک تھے۔ کیا چیز مانع تھی کہ انہوں نے اس کو نہ لکھوایا۔ علاوہ بریں چونکہ یہ روایت قرآن کی تصریح اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ کے خلاف ہے۔ اس لئے ہرگز تسلیم کے قابل نہیں خواہ اس کے راوی جبرئیل و میکائیل ہی کیوں نہ بتائے جائیں ——

(۳) وہ آیات جن کا حکم منسوخ ہو گیا ہے۔ مگر تلاوت منسوخ نہیں ہوئی ——

اس قسمِ سوم میں لوگوں نے اسے قیاس کو اس قدر دخل دیا کہ پچاسوں آیتوں پر نسخ کا حکم لگا دیا۔ علامہ ابن العربی نے اس تعداد کو کم کر کے ۲۱ آیتوں کو منسوخ قرار دیا شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ان میں ذرا اور غور کیا تو ان کے نزدیک صرف پانچ آیتیں منسوخ ثابت ہوئیں۔ ہمارے نزدیک وہ بھی منسوخ نہیں۔

ان باتوں سے یہ صاف اندازہ ہو جاتا ہے، کہ آیات کو جن لوگوں نے منسوخ کہا ہے محض اپنی رائے اور قیاس سے کہا ہے۔ اور اللہ کا کلام اس سے کہیں بالاتر ہے، کہ وہ کسی انسان کی رائے سے منسوخ ہو سکے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق حاصل نہ تھا، کہ وہ قرآن کے ایک

لفظ کو بھی بدل سکیں ——

مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ | کہہ دے کہ مجھے حق نہیں ہے کہ اس کو بدلوں اپنی طرف سے۔

اُن آیات کے متعلق جن کو لوگوں نے منسوخ الحکم قرار دیا ہے ہم کو یقین ہے کہ وہ قرآن کی احکامی آیتیں ہیں۔ اللہ نے ان کو نازل فرمایا ہے اور رسولؐ نے ان کو یاد کرایا اور قرآن میں لکھوایا ہے۔ اب سوائے اللہ کے دُوسرا کون ان کو منسوخ کر سکتا ہے، اگر کسی کو دو آیتوں میں باہمی تعارض نظر آتا ہے جس کی وجہ سے وہ ایک کو منسوخ قرار دیتا ہے تو یہ اس کی فہم کا قصور ہے کیونکہ قرآن نے تصریح کی ہے کہ اس کی تعلیمات میں اختلاف نہیں ہے —— قرآن کی آیات میں سے ایک بھی منسوخ نہیں ہے۔ جن لوگوں نے روایات سے آیات کو منسوخ قرار دیا ہے انہوں نے قرآن پر بڑا ظلم کیا ہے مثلاً: ——

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝ (۲/۱۸۰) | تمہارے اُوپر فرض کیا گیا کہ تم میں سے جب کسی کی موت کا وقت آئے اگر کچھ مال چھوڑے تو والدین اور اقربا کے لئے وصیّت کر جائے یہ اللہ سے ڈرنے والوں پر حق ہے ——

صریح الفاظ میں اللہ نے مالداروں پر ورثہ کے لئے وصیّت فرض کی اور متقیوں پر اس کو لازمی قرار دے کر مؤکّد فرمایا۔ پھر آیت وراثت میں بھی تین جگہ "مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ" فرما کر توضیح کر دی اور توریث کا اجراء وصیّت کے نفاذ کے بعد ہوگا۔ مگر فقہائے "لَا وصيّة لوارث" (یاد رکھو کہ وارث کے لئے وصیّت نہیں ہے) کی روایت سے اس مؤکّد آیت کو منسوخ کر ڈالا اور یہ سمجھ نہ سکے کہ وصیّت ورثہ کی شخصی مصلحتوں کے لیے ہے۔ جو توریث میں ممکن نہیں۔ کیونکہ ورثہ کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ فرض کرو کہ ایک شخص کے دو بیٹے ہیں جن میں سے ایک پر اس نے ہزاروں روپیہ خرچ کیا ہے اور اس کو پڑھا لکھا کر اس قابل بنا دیا ہے، کہ وہ خوب کماتا ہے اور باپ کی دولت سے مستغنی ہے۔ دوسرا بیٹا آج پیدا ہوا ہے۔ وراثت کا قانون کلی ہے وہ شخصی مصالح کا لحاظ نہیں کرے گا اور دونوں کو برابر دے گا۔ لیکن مصالح عائلی کا تقاضا اس کے خلاف ہے۔ اس قسم کے مخصوص حالات کے لئے وصیت فرض کی گئی ہے تاکہ مورث اپنے ورثہ کی مناسب ضرورتوں کا لحاظ رکھ سکے۔ ایسی ضروری اور مؤکّد آیت کو لوگوں نے صرف خبر احاد کی بنا پر منسوخ کر ڈالا اور قرآن کی سکھائی ہوئی مصلحت کو ضائع کر دیا [1] ——

---

[1] اِس مضمون کو جس صاحبِ علم نے مرتب کیا تھا۔ ہم نے اُس کی زائد اور غیر موزوں باتوں کو حذف کر دیا ہے ——

قرآن کی تفہیم اور تفسیر کے اصول

علامہ رشید رضا جو مصر کے ایک محقق مفسر ہیں۔ ان کی تفسیر "المنار" کافی شہرت کی حامل ہے انہوں نے اپنی تفسیر کے مقدمے میں تفسیر اور قرآن فہمی کے چند اصول لکھے ہیں :۔۔۔۔

" تفسیر قرآن میں کلام کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے، بلکہ بسا اوقات وہ مشکل ترین اور اہم امور میں سے ہو جاتا ہے لیکن ہر مشکل کو چھوڑا نہیں جاتا۔ اس لیے لوگوں کو اس کی طلب سے رکنا نہ چاہیئے ۔۔۔۔

تفسیر قرآن کے دشوار ہونے کی کئی وجوہ ہیں جن میں سے اہم یہ ہے، کہ قرآن آسمانی کتاب ہے، جو بارگاہِ ربوبیت سے، جس کی کنہ تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اکمل انبیاءؑ کے قلب پر نازل ہوا ہے۔ اور جو معارف عالیہ اور بلند مقاصد پر مشتمل ہے، جن پر کوئی مطلع نہیں ہو سکتا، بجز اُن کے جن کے نفوس پاک ہیں اور جن کی عقلیں سلیم ہیں اور یہ کہ اس کا طالب اپنے سامنے وہ ہیبت و جلال دیکھتا ہے جو بارگاہ کمال سے اس پر اس طرح طاری ہوتا ہے کہ اس کی عقل حیران و ششدر ہو کر رہ جاتی ہے اور بہت ممکن ہے، کہ اس کے اور مطلوب کے درمیان وہ حائل ہو جائے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم پر معاملہ کو اس طرح آسان کر دیا، کہ ہمیں فہم و عقل سے کام لینے کا حکم دیا، کیونکہ یہ کتاب نور و ہدایت بن کر نازل ہوئی ہے جو لوگوں کے لئے شریعتیں اور احکام الٰہی بیان کرتی ہے اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا، جب تک کہ ہم اسے نہ سمجھیں ۔۔۔۔

اور تفسیر، جس کے ہم طالب ہیں، وہ دراصل کتاب اللہ کو اس حیثیت سے سمجھنا ہے کہ وہ دین ہے جو لوگوں کو اس بات کی ہدایت کرتا ہے، کہ دنیوی اور اُخروی زندگی میں ان کی سعادت کس امر سے وابستہ ہے اور یہی اس کا اعلیٰ مقصد ہے اور اس کے سوا جو بحثیں ہیں وہ اس کی تابع اور اس کے حصول کا ذریعہ ہیں ۔۔۔

پھر فرماتے ہیں کہ تفسیر کے کئی زاویۂ نگاہ ہوتے ہیں۔ مثلاً :۔۔۔

۱ ۔۔۔ کتاب کے اسلوب اور اس کے معانی میں فکر و نظر اور یہ کہ بلاغت کے انواع میں سے وہ کس پر مشتمل ہے تاکہ اس سے کلام کی بلندی اور قول کے لحاظ سے کلامِ غیر سے امتیاز کی معرفت حاصل ہو۔ زمخشریؒ نے یہی راہ اختیار کی ہے اور کچھ دوسرے مقاصد بھی سامنے رکھے ہیں اور زمخشری کے علاوہ کچھ اور لوگوں نے بھی یہ طرز اختیار کیا ہے

۲ ۔۔۔ وجوہ اعراب کے نقطۂ نظر سے تفسیر، اس کی طرف بھی کچھ لوگوں نے توجہ کی ہے۔ اور وجوہ اعراب کے بیان کرنے میں پوری تفصیل سے کام لیا ہے، نیز یہ امر بھی پھیلا کر بیان کیا ہے کہ الفاظ کس کس معنی اور کن وجوہ کے متحمل ہیں ۔۔۔

۳ ۔۔۔ قصص کا بیان کرنا۔ یہ روش بھی کچھ لوگوں نے اختیار کی ہے۔ اور قرآنی قصص میں جو چاہا کتب تاریخ اور اسرائیلیات سے اخذ کر کے بڑھا دیا اور صرف تورات و انجیل ہی پر اعتماد نہیں کیا اور نہ اُن کتابوں پر اکتفا کی جو اہلِ کتاب کے نزدیک معتمد ہیں، بلکہ انہوں نے لوگوں سے جو کچھ سُنا، سب لے لیا، اس بات کی تفریق کئے بغیر کہ قوی کون سی بات ہے

اور ضعیف کون سی ہے اور نہ اس بات کی تنقیح کی کہ وہ خلافِ شریعت بھی ہے اور خلافِ عقل بھی ـــــ

۴ ـــــ قرآن کے غریب الفاظ کی تشریح و توضیح ـــــ

۵ ـــــ عبادات و معاملات سے متعلق شرعی احکام اور ان کا استنباط کرنا اور بعض لوگوں نے تو یہ کیا کہ احکام کی آیات کو جمع کر کے صرف انہی کی تفسیر کی، جن میں سے ایک ابوبکر بن عربی ہیں ۔ اور جن مفسرین پر فقہ کا غلبہ ہے وہ ان آیات کی تفسیر کی طرف، جو عبادات و معاملات کے احکام سے متعلق ہیں، دوسری آیات کی طرف توجہ کرنے سے زیادہ اہتمام کرتے ہیں ـــ

۶ ـــــ اُصول عقائد سے متعلق بحث اور کجی اختیار کرنے والوں کو سیدھا کرنا اور اختلاف کرنے والوں سے بحث کرنا. امام رازی نے اس طرز تفسیر پر زیادہ توجہ دی ہے ـــــ

۷ ـــــ وعظ و نصیحت اور سوز و گداز پیدا کرنے والی باتیں بیان کرنا. جن لوگوں کو ان باتوں سے شغف ہے، انہوں نے تفسیر میں صُوفیاء اور عابدین کی حکایتیں شامل کر دیں، اور بعض لوگ تو ایسے ہیں جو حکایات و قصص کے بیان کرنے میں فضائل و آداب کے ان حدود سے تجاوز کر گئے جن کو قرآن نے مقرر کیا ہے ـــــ

۸ ـــــ تفسیر میں وہ چیزیں بیان کرنا جنہیں "اشارۃ" کہا جاتا ہے اور اس معاملہ میں لوگوں کو باطنیہ کے اور صُوفیہ کے کلام میں التباس ہو گیا ہے، اور اسی قسم میں وہ تفسیر ہے جو شیخ اکبر محی الدین بن عربی کی طرف منسوب ہے، حالانکہ وہ مشہور باطنی قاشانی (کاشانی) کی تفسیر ہے اور اس میں ایسی لغویات ہیں جن سے اللہ کا دین اور اس کی کتاب عزیز بری ہے ـــــ

میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ ان مقاصد میں سے کسی خاص مقصد کی طرف بہت زیادہ جھکاؤ اکثر لوگوں کو کتاب الٰہی کے مقصودِ اصلی سے دُور کر کے ایسی وادیوں میں لے جاتا ہے، کہ وہ اس کے حقیقی معنی فراموش کر بیٹھتے ہیں. اسی لیے تفسیر سے ہم جو مراد لیتے ہیں، وہ وہی ہے جس کا ذکر پہلے آچکا، یعنی یہ کہ کتاب کو اس حیثیت سے سمجھنا کہ یہ دین ہے اور اللہ کی طرف سے تمام دنیا والوں کے لئے ہدایت ہے ۔ اور دُنیا و آخرت کی سعادتوں کی جامع ہے. یعنی اس میں اُن باتوں کا بھی بیان ہے. جن سے لوگوں کے معاملات اِس دُنیا کی زندگی میں درست رہتے ہیں اور ان باتوں کا بھی بیان ہے جن کی وجہ سے وہ آخرت میں بھی نیک بخت ہو جائیں.

ہاں بلاشبہ اس کے ساتھ وجوہ بلاغت کا بھی اس حد تک بیان کرنا ضروری ہے، جس حد تک معنی اس کی برداشت کر سکے، اور اعراب کی تحقیق بھی ہونی چاہیئے، مگر اس حد تک جو فصاحت قرآن اور اس کی بلاغت کے لائق ہو. یعنی جس وقت اس کی حاجت ہو، جیسے وہ متعلقہ مسائل جن کا بیان کرنا ناگزیر ہو، اور ہم بسا اوقات اعراب کی طرف بغیر کسی نحوی اصطلاحی عبارت کی تصریح کے اشارہ کریں گے جیسا کہ بلاغت کے بعض نکتوں میں یا اصول کے قواعد میں یہ طریقہ اختیار کیا ہے تاکہ قاری اصطلاحات کے چکر میں پھنس کر اصل معانی و مقاصد سے دُور نہ ہو جائے اور یہ اصطلاحات اُسے عبرت و نصیحت حاصل کرنے میں مانع نہ ہوں ـــــ

ممکن ہے کہ موجودہ زمانے کے بعض لوگ یہ کہنے لگیں کہ ہمیں نہ تفسیر کی حاجت ہے، اور نہ قرآن میں تدبّر کرنے کی، اس لیے کہ ائمۂ سابقین نے کتاب و سُنّت میں غور و فکر کا حق ادا کر دیا اور ان سے احکام کا استنباط کر لیا، لہٰذا ہم کو تدبر فی القرآن سے مستغنی کر دیا ہے ـــــ لیکن اگر یہ خیال صحیح ہے تو پھر تفسیر کی طلب ایک فعل عبث ٹھہرتی ہے اور اس میں سوائے تضیع اوقات کے اور کچھ حاصل نہیں، حالانکہ ـــــ اگرچہ اس خیال میں شان فقہ کی تعظیم کا ایک

پہلو ہے مگر ـــــ یہ اجماعِ اُمّت کے خلاف ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر آج تک کے ہر مومن کے موقف کی مخالفت ہے اور میں نہیں جانتا کہ یہ بات کسی مُسلم کے دل میں کیسے آسکتی ہے ـــــ

وہ احکام عملیہ جن کے لیے اصطلاحی اسماء استعمال کئے جاتے ہیں، وہ اس قبیل سے ہیں، جو قرآن میں بہت کم آئے ہیں۔ اس میں تو تہذیب اخلاق کا درس ہے روحوں کو اس بات کی طرف دعوت ہے جس میں ان کی سعادت ہے، اور ایسی تعلیمات ہیں، جو جہالت کی پستی سے نکال کر اوج معرفت پر فائز کرتی ہیں، اور حیات اجتماعیہ کے طریقہ کی طرف رہنمائی ہے، جس سے وہ شخص جو اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے، کبھی کسی حال میں مستغنی نہیں ہوسکتا اور جو حقیقی فقہ میں داخل ہونے کی زیادہ مستحق ہے۔ اور اس قسم کی رہنمائی بجز قرآن کے اور کسی جگہ نہ ملے گی یا پھر وہ کتب ہیں جن میں ان باتوں کو قرآن سے لیا گیا ہے، مثلاً احیاء العلوم، کہ اس میں علم تہذیب کافی حصہ ہے۔ لیکن قرآن کی شوکت ان نفوس پر جو اسے سمجھتے ہیں، اور اس کی تاثیر ان لوگوں کے دلوں میں جو اس کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں، اس کے مقابلہ میں کوئی کلام نہیں آسکتا، جیسا کہ اس کی بہت سی حکمتوں اور معارف کا انکشاف اب تک نہیں ہوسکا ہے اور کسی عالم و امام نے ان کو ظاہر نہیں کیا ہے۔

پھر یہ کہ ائمہ دین نے یہ بھی کہا ہے کہ قرآن افراد بشر میں سے ہر فرد پر قیامت تک کے لیے حجت ہے، اور اس کی دلیلوں میں سے ایک دلیل یہ حدیث ہے "والقرآن حجۃٌ لک او علیک[1]" اور ظاہر ہے، کہ یہ سمجھے بغیر عقل کی گرفت میں نہیں آسکتا اور اس کی حکمتوں اور بصائر کو صحیح طور پر سمجھے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ان لوگوں سے خطاب کیا ہے، جو زمانہ نزولِ قرآن کے وقت تھے، اور ان سے خطاب کی وجہ یہ نہ تھی کہ ان اشخاص میں کوئی خصوصیت تھی، بلکہ اس لئے کہ وہ اس نوع انسانی کے افراد تھے، جس کی ہدایت کے لیے قرآن نازل ہوا ہے[2]۔ چنانچہ اللہ کا قول ہے کہ یاایھا الناس اتقوا ربکم[3]۔ تو کیا یہ بات عقل میں آتی ہے کہ اللہ ہمارے اس طرزِ عمل کو پسند فرمائے گا کہ ہم اللہ کے قول کو نہ سمجھیں، اور قرآن میں فکر و نظر کرنے والے کسی ایسے شخص کے قول پر اکتفا کر کے بیٹھ رہیں، جس کی اتباع کے لازم ہونے کی بابت ہمارے پاس کوئی وحی نہیں آئی ہے، نہ مجملاً اور نہ تفصیلاً۔ نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہے، بلکہ ہر شخص پر واجب ہے، کہ وہ اپنی بساط کے مطابق حتی الوسع کتاب اللہ کی آیات کو اچھی طرح سمجھے، اس میں عالم و جاہل کا کوئی فرق نہیں ہے۔ عامی انسان کے لئے تو اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ـــــ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ[4]۔۔۔۔ الخ جو کچھ ظاہر آیات سے معلوم ہو، اسی کا سمجھنا کافی ہے، اور یہ کہ ایسے لوگ جو آیاتِ کریمہ میں بیان کردہ اوصاف سے آراستہ ہیں، انہی کے لیے فوز و فلاح ہے،

---

[1] قرآن تیرے لیے یا تجھ پر حجت ہے ـــــ

[2] مطلب یہ کہ قرآن ہدایت ہے رہتی دُنیا تک کے انسانوں کے لئے اور نزولِ قرآن کے وقت کے افراد اس کے مخاطب اوّل تھے ـــــ (مترجم)

[3] لوگو! اپنے رب سے ڈرو (۴/۱)۔ (اس میں الناس قیامت تک کے انسانوں کے لیے ہے)

[4] وہ مومنین فلاح یافتہ ہوئے جو اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں ـــــ (المومنون۔ ۱۔۲)

ادان اوصاف کی معرفت کے لیے یہ کافی ہے، کہ خشوع کا مفہوم جان لیا جائے، اور لغویات سے اعراض اوران باتوں سے کنارہ کشی کا مطلب سمجھ لیا جائے، جن میں کوئی خیر نہیں، اور جس چیز میں دینوی یا اخروی فائدہ ہو، اس کی طرف توجہ اور ادائیگی زکوٰۃ، اور اقرار کے پورا کرنے اور وعدے کی سچائی اور فواحش سے عفت کے معنی جان لئے جائیں ——

اور یہ کہ جو شخص ان اوصاف سے کنارہ کشی کر کے ان کے اضداد کی طرف چلا جائے، وہی اللہ تعالیٰ کے حدود سے تجاوز کرنے والا اور اپنے نفس کو اس کے غضب کے لئے پیش کرنے والا ہے —— ظاہر ہے کہ ان معانی کا سمجھنا ہر مسلمان کے لئے آسان ہے، خواہ وہ کسی طبقہ سے ہو اور کوئی بھی زبان جانتا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہر شخص اسی قدر حصہ لے جس سے وہ اپنے نفس میں خیر کو جذب کر سکے اور اس کو برائی سے پھیر دے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس (قرآن) کو ہماری ھدایت کے لئے نازل فرمایا ہے اور وہ جانتا ہے، کہ ہم میں کس کس نوع کا ضعف ہے اور ہماری کیا صلاحیتیں ہیں۔ یہ تو فہم قرآن کا وہ مرتبہ ہے، جو ہر شخص کے لیے ضروری ہے —— اس کے علاوہ اس کا ایک درجہ اور ہے، جو اس سے بلند تر ہے، اور وہ فرض کفایہ ہے ،، ——

اس کے بعد رشید رضا، فرماتے ہیں، کہ: ——

" درجاتِ تفسیر کی بات آگئی ہے تو مناسب ہے کہ ہم یہیں مختصر طور پر یہ بھی بتاتے چلیں، کہ تفسیر کے چند درجات و مراتب ہیں، جن میں سے اس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے، کہ مختصراً بات اس طرح بتائی جائے کہ دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و تنزیہہ جاگزیں ہو جائے اور نفس کو برائی سے روکے اور اس کو خیر کی طرف کھینچے، اور یہی وہ بات ہے جس کے متعلق ہم نے ابھی کہا ہے کہ وہ ہر شخص کے لئے آسان ہے، اور اسی لحاظ سے قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ:-

ولقد یسّرنا القرآن للذکر فھل من مدکر [1]

رہا تفسیر کا اعلیٰ مرتبہ، تو اس کے لیے چند امور ضروری ہیں ——

ا۔ جو مفرد الفاظ قرآن میں وارد ہوئے ہیں اُن کی حقیقتوں کو اس طرح سمجھنا کہ اہلِ لغت کے استعمالات کے مطابق مفسر ان کی تحقیق کرے اور اس پر اکتفا نہ کرے کہ یہ فلاں کا قول ہے اور فلاں نے اس کا مفہوم یہ سمجھا ہے۔ کیونکہ بہت سے الفاظ نزولِ قرآن کے وقت کئی معانی کے لئے استعمال کئے جاتے تھے، پھر (اثنائے تنزیل ہی میں ابتدائے نزول سے) کچھ زمانہ گذرنے پر یا قدرے طویل زمانہ گذرنے پر ان معانی کے علاوہ کسی اور معنی کا ان الفاظ پر غلبہ ہو گیا۔ انہی میں سے ایک لفظ "تاویل" ہے۔ جو تفسیر کے معنی میں مشہور تھا، یا تو مطلقاً (تفسیر کے مرادف کی حیثیت سے) یا کسی خاص طور پر تفسیر و تشریح کرنے کے لئے (بہرحال، تفسیر و تشریح اور توضیح کے مفہوم میں اس کی شہرت تھی) لیکن قرآن میں بعض جگہ وہ ایک دوسرے معنی کیلئے آیا ہے، مثلاً اللہ کا ارشاد ہے کہ۔ ھل ینظرون الا تاویلہ، یوم یاتی تاویلہ یقول الذین نسوہ من قبل قد جاءت رسل ربنا بالحق [2] تو یہاں "یہ تاویل" کیا ہے [3] —— ؟

---

[1] ہم نے نصیحت پذیری کے لیے قرآن کو آسان کر دیا ہے، تو کیا ہے کوئی عبرت و نصیحت حاصل کرنے والا۔ ؟ (القمر۔ ۳۲)

[2] پھر کیا یہ لوگ اس بات کے انتظار میں ہیں کہ (فساد و بدعملی کے جس نتیجہ کی اس میں خبر دی گئی ہے) وہ وقوع میں آجائے؟ جس دن وہ انجام سامنے آگیا، تو وہی لوگ جو اسے پہلے سے بھولے بیٹھے تھے (نامرادی و حسرت کیساتھ) بول اٹھیں گے کہ "بلاشبہ ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے تھے"۔ (الاعراف۔ ۵۳)

[3] یہاں "تاویل" اس نتیجہ عمل اور اُس انجام کو کہا گیا ہے، جس کی خبر قرآن نے دی ہے ——

غرض، جو شخص قرآن کو صحیح طور پر سمجھنا چاہتا ہے، اُسے چاہیئے کہ ملت میں جو اصطلاحات بعد میں پیدا ہوئی ہیں، اِن سے واقفیت حاصل کرے، تاکہ وہ ان میں اور کتاب میں جس معنی کی رو سے وہ لفظ وارد ہوا ہے فرق کر سکے، کیونکہ اکثر مفسرین نے کلماتِ قرآن کی تفسیر ان اصطلاحات سے کی ہے جو ملت میں تیسری صدی ہجری کے لگ بھگ کی پیداوار ہیں، لہذا قرآنی الفاظ کی تفسیر اُن معانی کے مطابق کی جانی چاہیئے جو زمانۂ نزولِ قرآن میں مستعمل تھے اور بہتر تو یہ ہے کہ ہم لفظ محض قرآن سے سمجھیں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن کے مختلف مقامات میں ایک لفظ کی جو تکرار کی گئی ہے ان سب کو یک جا کر لیں اور پھر غور کریں، ایسا کرنے پر تم دیکھو گے کہ لفظ بسا اوقات مختلف معانی کے لئے استعمال کیا گیا ہوگا۔ مثلاً لفظ "ھدایت" وغیرہ اور تحقیق کی جائے کہ لفظ کا کون سا معنی کس طرح زیرِ غور آیت کے مدعا و مفاد سے پوری طرح مناسبت رکھتا ہے، اس طرح لفظ کے مختلف معانی کے درمیان سے از خود معنی مطلوب اُبھر کر سامنے آجائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مفسّرین نے کہا ہے کہ قرآن کا ایک حصّہ دوسرے حصّہ کی تفسیر کرتا ہے اور اس طرح عمل کر کے صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی لئے لفظ کے معنی کی حقیقت پر دلالت کرنے والا بہترین قرینہ لفظ کا سابقہ قول کے ساتھ موافق ہو جانا ہے، اور جملہ کے معنی کے ساتھ جو معنی پوری طرح مناسب ہو جائے اور اس مقصد کے ساتھ جُڑ جائے جس کے لئے کتاب میں وہ جُملہ آیا ہے۔ تو سمجھ لو کہ اس جگہ لفظ کے مختلف معانی میں سے وہی معنی مطلوب ہے۔

(۲) فہمِ اسالیب اس کے لئے چاہیئے کہ مفسّر کو وہ علم حاصل ہو جس سے وہ ان بُلند اسالیب کو سمجھ سکے اور یہ کلام بلیغ کی مشق اور اس کے نکات و محاسن کو سمجھنے کے ساتھ اس کی مزاولت اور متکلم کی مُراد سے واقفیّت بہم پہنچانے کی جانب توجّہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ ہاں، یہ صحیح ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی مُراد تک تمام و کمال طریقہ پر پہنچنے کی عزّت حاصل نہیں کر سکتے، لیکن یہ تو ممکن ہے کہ ہم اپنی استطاعت کے مطابق اس بات کو سمجھنے کی کوشش کریں، جس کی ہدایت ہمیں مِل رہی ہو اور اس بارے میں علمِ اعراب اور علمِ اسالیب کی ضرورت ہوتی ہے جس کا نام "علم معانی و بیان" ہے۔ لیکن ان فنون کا صرف جان لینا اور ان کے مسائل کو سمجھ لینا اور اس کے احکام کا یاد کر لینا مطلوب کے لئے مفید نہیں ہے (بلکہ مشق و مزاولت ضروری ہے) ——

تم کتبِ عربیہ میں دیکھو گے کہ عرب کی زبان آوری کے سامنے غیر عرب کی زبانیں گنگ ہو جاتی تھیں اور عرب قواعد کے بالکل مطابق گفتگو کیا کرتے تھے، حالانکہ اُس وقت تک قواعد سازی ہوئی بھی نہ تھی، پھر کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ صفت اُن کی خلقی و طبعی تھی نہیں، بلکہ وہ تو ان کا ملکۂ راسخہ تھا، جو سُننے اور بات چیت کرنے سے حاصل ہوتا تھا، اور یہی وجہ ہے کہ جب اولادِ عرب عجمیوں کے ساتھ ملنے جُلنے اور اُٹھنے بیٹھنے لگی تو وہ عجمیوں سے بھی زیادہ گونگے ہو گئے، پس اگر یہ بات اُن کی ذاتی اور طبعی ہوتی تو ہجری سال کے لحاظ سے صرف پچاس سال میں (۵۰ھ کی مدّت میں) وہ اسے کھو نہ دیتے ——

(۳) انسان کی مُختلف حالتوں کا علم کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب نازل فرمائی، جو آخری کتابِ الٰہی ہے اور اس میں ان باتوں کو ظاہر کیا جن کو اس کے علاوہ کسی اور کتاب میں نہیں بتایا تھا اس میں مخلوق کے احوال، ان کی طبیعتوں کے کوائف اور بشر کے معاملہ میں سُنن الٰہیّہ کا بکثرت بیان ہے اور امتوں کے بہترین قصص اور ان کی وہ سیرتیں ہمیں بتائی ہیں جو سنّتِ الٰہی کے موافق ہیں، لہذا اس کتاب میں غور و فکر کرنے

والے کیلئے ضروری ہے کہ انسان کی حالتوں کو، اُن کے طور طریقوں کو، ان کے ادوار کو اچھی طرح سمجھے اور جانے اور ان کے حالات کے اختلاف کے قوی و ضعیف اسباب میں فکر و نظر کرے، نیز عزّت و ذلت، علم و جہالت اور ایمان و کُفر کے لحاظ سے بھی انسانی احوال کے اختلاف اور قوموں کے عروج و زوال کے اسباب کو جانے اور ان امور کے ساتھ ساتھ عالمِ کبیر کے علوی و سفلی حالات کا جاننا بھی ضروری ہے۔ اور ان امور کے لئے بہت سے فنون کے جاننے کی ضرورت ہے جن میں سے اہم تاریخ اور اس کے انواع و اقسام ہیں

استاذ امام (شیخ محمد عبدہٗ) فرماتے ہیں کہ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کسی کے لیے یہ کس طرح ممکن ہوگا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تفسیر کرے ــــــ كان الناس أمة واحدة فبعث الله النبيين مبشرين ومنذرين[1]... الخ جب تک کہ وہ یہ نہ جانتا ہو کہ انسان کی حالتیں کیا تھیں اور وہ کس طرح متحد ہوئے اور پھر ان میں اختلاف و افتراق کس طرح ہوا اور جس وحدت پر وہ تھے اس کے کیا معنیٰ ہیں، اور کیا وہ اتحاد ان کے لئے نافع تھا یا ضرر رساں اور پھر ان میں انبیاء کی بعثت کے کیا نتائج و آثار ہوئے[2] ــــــ

قرآن میں اللہ نے اُمتوں کے حالات اور سُنن الٰہیہ اور آسمانوں اور زمین اور انفس و آفاق میں اپنی نشانیوں کو مختصر طور پر بیان کیا ہے، اور وہ ایسا اختصار و اجمال ہے، جو اس ہستی کی جانب سے وارد ہوا ہے جو ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے، اور اس نے ہم کو فکر و نظر کا حکم دیا ہے اور دنیا میں سیاحت کرنے کی تاکید کی ہے تاکہ ہم اس کے اجمال کو تفصیل سے سمجھیں جو ہماری ترقی و کمال میں زیادتی کا باعث ہو۔ اور اگر ہم کائنات کے علم پر صرف سطحی اور ظاہری نظر سے کفایت کر لیں تو اس کی مثال ایسی ہو گی جیسے کوئی کسی کتاب سے متعلق فیصلہ صرف اس کی جلد کا رنگ دیکھ کر کر ڈالے اور یہ نہ دیکھے کہ اس کے اندر علم و حکمت کی کون کون سی باتیں ہیں ــــــ

۴۔ یہ علم کہ تمام انسانوں کی ہدایت قرآن سے کس طرح ہو گی۔ تو جو مُفسر اس فرض کفایہ سے عہدہ برا ہونے کے لیے کھڑا ہو گا، اُسے یہ معلوم کرنا ضروری ہو گا کہ زمانۂ نبوّت میں عرب اور غیر عرب کے عقائد و مذاہب کیا تھے، بالخصوص اس لیے بھی کہ قرآن پوری صراحت سے اعلان کر رہا ہے، کہ سارے انسان شقاوت اور گمراہی میں مبتلا تھے، اور یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی ہدایت اور سعادت کی راہ پر انہیں چلانے کے لیے مبعوث کئے گئے، لہٰذا مفسر اگر ان کی حالتوں کو اور ان کے مذاہب کو نہ جانتا ہو گا تو کس طرح یہ بات معلوم کر سکے گا کہ آیات الٰہیہ نے ان کے کن نظریات و رجحانات اور خصائل و عادات کو حقیقتاً یا بالواسطہ مذموم قرار دیا ہے ــــــ

---

[1] ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے انبیاء مبعوث کئے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کجروی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے ــــــ (۲/۲۱۳)

[2] مقدمہ کے آخر میں لکھا ہے، کہ استاذ امام رحمۃ اللہ (مفتی محمد عبدہٗ) نے اس آیت کی تفسیر میں وہ اُمور بیان کئے ہیں جو کسی کتاب میں نہیں پائے جاتے۔ اس آیت سے متعلق شیخ محمد عبدہٗ کے افادات رسالہ "المنار" کی جلد ۸ کے جزو ثانی میں یعنی ۱۳۲۳ھ کی جلد میں شائع ہوئے تھے (مُصنف)

میرے اس موقف کی تائید حضرت عمرؓ کے ایک ارشاد سے بھی ہوتی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ احوالِ جاہلیت سے لوگوں کا بے خبر رہنا ہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے اس بات کا اندیشہ ہے کہ اسلام کا لباس پارہ پارہ ہوجائے ـــــ
مطلب یہ کہ جس نے اسلام میں نشو ونما پائی اور اپنے پہلے کے لوگوں کی حالتوں کو نہیں جانا تو وہ ہدایتِ اسلام کی تاثیر سے ناآشنا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اس عنایت سے بے خبر ہوجاتا ہے کہ اس نے انسانوں کی حالتوں میں کیا اور کس طرح تغیّر پیدا کیا اور ان کو کس طرح تاریکی سے روشنی کی طرف نکالا۔

۵ - نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیّبہ اور آپؐ کے اصحاب کی سیرت کا علم اور یہ کہ ان کا علم وعمل کیا تھا اور وہ اپنے دنیوی اور اخروی معاملات سے کس طرح عہدہ برآ ہوا کرتے ـــــ پس، متذکرہ بالا ان تمام باتوں سے یہ معلوم ہوا کہ تفسیر کی دو قسمیں ہیں، ایک تو ہے بالکل خشک اور غیر مفید بلکہ اللہ سے اور اس کی کتاب سے دُور کردینے والی اور وہ یہ ہے، کہ مقصود صرف حل الفاظ اور جملوں کا اعراب ہو اور یہ کہ ان عبادات وارشادات سے کیسے کچھ فنی نکات نکلتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرز کو تفسیر کہنا ہی غلط ہے^۱، بلکہ یہ ایک قسم کا فنّی مظاہرہ اور ایک طرح کی فنی مشق ہے، جیسے نحو اور معانی وغیرہ فنون میں مشق وتمرین کی جاتی ہے ـــــ
دوسری قسم وہ ہے جس کی بابت ہم کہتے ہیں کہ فرضِ کفایہ ہونے کی حیثیّت سے یہ لوگوں پر واجب ہے اور وہ یہ ہے کہ تفسیر کو مذکورۂ بالا شرطوں کی جامع ہونا چاہیئے، تاکہ ان کی غایت وغرض کے لئے ان کو استعمال کیا جائے، اور وہ اس طرح کہ مفسّر مُرادِ قول سمجھنے کے لئے پوری طرح کوشش کرے اور عقائد واحکام میں تشریع کی حکمت اس طرح سمجھے کہ رُوحوں کو کھینچ سکے اور ان کو عمل اور اُس ہدایت پر گامزن کردے، جو کلام میں ودیعت کی ہوئی ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مدعا متحقق ہوجائے کہ قرآن ہدایت اور رحمت ہے (ھدیً ورحمۃ) پس ان شرائط وفنون کے پیچھے جو مقصد کار فرما ہونا چاہیئے وہ قرآن سے ہدایت پانا ہے ـــــ
استاذ امام (مفتی محمد عبدہٗ) نے فرمایا کہ یہی وہ پہلی غرض اور مدعائے اصلی ہے جس کو میں تفسیر کے پڑھنے میں پیشِ نظر رکھتا ہوں ـــــ"

اس اہم مقدمہ کو انہوں (علامہ رشید رضا) نے اپنے اس قول پر ختم کیا ہے کہ :ـــــ

۱؎ میں کہتا ہوں کہ یہ دعویٰ اس وقت درست ہوگا جب مفسّر تفسیر میں بس اتنا ہی کچھ کرکے ختم کردے اور اسی کو اپنی انتہائے مقصود قرار دے لے لیکن جب ان امور کو مقصود کے لئے وسیلہ اور مُرادِ کلام تک پہنچنے اور حکمتِ تشریع سمجھنے کا ذریعہ بنایا جائے ـــــ جس کو چند سطروں کے بعد خود علّامہ رشید رضا بیان کر رہے ہیں ـــــ تو یہ اللہ سے اور اس کی کتاب سے دُور کردینے والا نہ ہوگا بلکہ وہ اللہ اور اس کی کتاب سے قریب کرنے والا ہوگا۔ وانما الاعمال بالنیّات (مصنّف)

"ہمیں پوری طرح یقین ہے کہ مسلمانوں کے ضعف اور ان کی وسیع مملکت کے زوال کا سبب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے قرآن کی ہدایت سے روگردانی کرلی۔ اور یہ بھی مجھے یقین ہے کہ جو عزت اور سیادت و قیادت مسلمانوں نے کھودی ہے، وہ اس وقت تک انہیں واپس نہ ملے گی جب تک وہ قرآن کی ہدایت کی طرف نہیں پلٹتے، اور اس کی رسی کو مضبوط نہ تھام لیں، جیسا کہ قرآن کی مندرجہ ذیل ان آیاتِ کریمہ کی تفسیر میں پوری وضاحت سے دیکھا جاسکتا ہے جو ہمارے دعوی پر صراحتاً دلالت کر رہی ہے اور یہ اس وقت تک پورا نہ ہوگا، جب تک کہ اس کی لغت کو زندہ نہ کریں گے تو گویا اس کی طرف دعوت دینا، ہدایت کی طرف دعوت دینا ہے:—

(مقدمہ تفسیر المنار ص۱۸۰ تا ص۲۱۲)

تفسیر اور اصولِ تفسیر

علّامہ راغب الطباخ لکھتے ہیں :——

کشف الظنون میں علم تفسیر کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ تفسیر وہ علم ہے جس میں بشری طاقت کی حد تک عربی زبان کے قواعد کے مطابق نظم قرآن کے معنے سے بحث کی جائے اور علم تفسیر کے موقوف علیہ علوم یہ ہیں ——

① —— علومِ عربیّہ ② —— اصولِ کلام ③ —— اصولِ احکام ④ —— خلافیات اور ان کے علاوہ بعض دوسرے علوم اور علم تفسیر کی غرض وغایت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ کلام اللہ کے معانی معلوم کئے جائیں، اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ صحیح طریقہ پر احکامِ شرعیہ کے استنباط کرنے پر قدرت حاصل ہو اور اس کا موضوع اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو ہر حکمت کا منبع اور ہر فضیلت کا معدن ہے اور علم کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگانا چاہئے کہ دنیا و آخرت کی سعادت کا حصول اس پر موقوف ہے ——

علمِ تفسیر کی فضیلت

چونکہ ہر علم کی عظمت و فضیلت اس کے موضوع اور غایت کے شرف کے لحاظ سے ہوتی ہے لہٰذا علم تفسیر اشرف العلوم اور سب سے زیادہ عظمت والا علم ہوا۔ اور اس کی ضرورت اس لئے ہے جیسا کہ اتقان میں ہے کہ شدّتِ حاجت کے لحاظ سے ہر کمال خواہ دینی ہو یا دنیوی اور خواہ عاجل (جلد حاصل ہونے والا ہو یا آجل (تاخیر سے حاصل ہونے والا) شرعی اور دینی علوم کی تحصیل پر موقوف ہے اور یہ علوم و معارف موقوف ہیں کتاب اللہ پر ——

تفسیری سرمایہ

مؤرخ ابن خلدون لکھتے ہیں :-

" قرآن، لغتِ عرب اور ان کی بلاغت کے اسلوبوں پر نازل ہوا ہے، اس بناء پر عرب اس کے مفردات اور اس کے جملوں کے معانی خوب سمجھتے اور جانتے تھے، مزید برآں قرآن تھوڑا تھوڑا ضرورت کے مطابق نازل ہوتا تھا تاکہ توحید کی تعلیم کھل کر سامنے آتی رہے اور دینی فرائض و احکام کی تعلیم جڑ پکڑتی چلی جائے، اس طرح کبھی عقائد و ایمانیات کے باب میں کچھ نازل ہوا کبھی اعمال کی تعلیم دی ——

یہ ساری باتیں صحابہ سے تابعین تک منتقل ہوئیں، پھر تابعین نے یہ امانت اپنے بعد والوں کو سپرد کی، اور یوں یہ سلسلہ صدر اوّل سے منتقل ہوتا ہوا آگے بڑھتا رہا، تا آنکہ ان حقائق و معارف نے باضابطہ علوم کی شکل اختیار کی اور کتابیں مدوّن ہوئیں، تو بہتوں نے اس (تفسیر) میں کتابیں لکھیں، اور جو آثار اس باب میں صحابہ اور تابعین سے وارد ہوئے تھے، وہ سب اپنی کتابوں میں درج کئے، یہاں تک کہ طبری، واقدی اور ثعالبی وغیرہ مفسرین تک اس طرز پر کتب تفسیر کی تالیف کا سلسلہ پہنچا اور اللہ نے جس سے جتنا چاہا (تفسیر بالآثار) قلمبند کرایا، پھر علوم لسانیہ فن کے درجہ پر پہنچے اور لغت و اعراب اور بلاغت و نحو کے موضوعات پر کتابیں چھڑیں تو ان فنون پر بھی کتابیں مدون کی گئیں حالانکہ اس سے پہلے عرب کے لیے تو یہ علوم ملکہ کی حیثیت رکھتے تھے کہ انہیں ان علوم کو نہ نقل و روایت کے توسط سے حاصل کرنے کی ضرورت تھی اور نہ کتابی علم کی انہیں

حاجت تھی، لیکن جب اہلِ زبان سے اُصول و قواعد مستنبط ہوئے اور ان علوم نے کتابی شکل اختیار کی اور لوگ اپنے پُرانے طرز کو بھُلا بیٹھے تو پھر ایسی تفسیر قرآن کی ضرورت پیش آئی (جس میں لُغت و بلاغت وغیرہ سے بحث ہو) کیونکہ قرآن عرب کی زبان پر اور ان کی بلاغت کے اسلوب پر نازل ہوا تھا، اس طور پر تفسیر کی دو قسمیں ہوگئیں، ایک تو وہ جس میں وہ آثار جمع کئے گئے جو سلف سے منقول ہوئے تھے، اور اسباب نزول اور آیات کے مقاصد وغیرہ، ظاہر ہے کہ یہ وہ باتیں ہیں جو صحابہ اور تابعین سے نقل پر منحصر تھیں، چنانچہ متقدمین نے اس باب میں استیعاب کے ساتھ سب کو جمع کر دیا، لیکن ان کی کتابوں میں ایسی روایتیں بھی درج ہوگئیں جن میں صحیح اور غلط اور مقبول و مردود ہر قسم کی باتیں تھیں، اسلئے کہ عرب اہلِ کتاب تو تھے نہیں، بلکہ ان پر اُمیّت اور بدویت کا غلبہ تھا، لہٰذا جب کبھی اُنہیں ایسی چیزوں کے جاننے کا شوق پیدا ہوتا، جنہیں فطرتاً انسانی نفوس جاننا چاہتے ہیں، مثلاً کائنات کے وجود میں آنے کے اسباب، تخلیق عالم کی ابتداء اور اسرارِ وجود وغیرہ، تو وہ ان باتوں کی بابت اہلِ کتاب ——— یہود و نصاریٰ ——— سے دریافت کرتے اور ان سے استفادہ کرتے ادھر اس زمانے میں ان اہلِ عرب کے درمیان جو اہلِ تورات تھے، وہ خود انہی (اہلِ عرب) کی طرح بدویت کے مرقع تھے اور ان امور (جن کی بابت ان سے اہلِ عرب پوچھا کرتے) سے متعلق ان کی معلومات ویسی ہی (سطحی اور بے اصل) تھیں، جیسی اہلِ تورات کے عوام کی تھیں، اور ایسے لوگوں میں بڑا طبقہ قبیلہ حمیر کا تھا، جو یہودی المذہب تھا۔ پھر جب یہ لوگ اسلام لائے تو ان کی سابقہ معلومات، جنہیں احکامِ شرعیہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان کے ذہنوں میں محفوظ رہیں، مثلاً ابتدائے آفرینش کے اخبار اور تاریخی واقعات و حادثات وغیرہ، چنانچہ مسلمان ہوجانے والے ان اہلِ کتاب، مثلاً کعب الاحبار[1]، وہب بن منبہ اور عبداللہ بن سلام وغیرہ سے بکثرت ایسی رطب و یابس باتیں منسوب ہو کر مفسّروں تک پہنچیں اور چونکہ یہ خبریں احکام سے تعلق نہیں رکھتی تھیں، جو اپنے واجب العمل ہونے کی بنا پر صحت کی تحقیق کے اہتمام و التزام کا مطالبہ کرتیں، اس لیے مفسرین نے تساہل سے کام لیا اور ایسی منقولات سے اپنی کتب تفسیر کو بھر دیا جن کا سرچشمہ، جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، بدویت میں پروان چڑھے ہوئے وہ اہلِ کتاب تھے، جو اپنی اوٹ پٹانگ باتوں کی تحقیق کر لینے سے بے نیاز تھے، اور جو نقل کرتے، اس کی صحت معلوم کر لینے کی فکر سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے تھے، لہٰذا ایسے حضرات کے اسلام لانے کے بعد جب ان کی قدر و منزلت بڑھ گئی، اور دین و ملت میں انہیں ایک خاص مقام حاصل ہوا تو ان کی شخصیتوں پر بھروسہ کرتے ہوئے، قدیم اخبار اور سرگزشتوں کے باب میں جو انہوں نے کہا، لوگوں نے مان لیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے حقیقت اور غلط روایتیں پھیل گئیں، پھر (تفاسیر میں ان منقولہ روایات کی) تنقید و تحقیق کی طرف لوگ متوجہ ہوئے، جن میں علمائے متاخرین میں سے ابو محمد بن عطیہ مغربی کا نام سرفہرست ہے، چنانچہ انہوں نے تمام تفاسیر پر ناقدانہ نظر ڈالی اور رطب و یابس کو چھانٹ کر جہاں تک ممکن ہو سکا صحت کے قریب روایتیں انتخاب کرتے ہوئے خود ایک تفسیر لکھی، جو مغرب و اندلس میں پسندیدہ نظر سے دیکھی گئی اور مقبول و متداول ہوئی پھر قرطبی نے ان کی روش اختیار

---

[1] یہ وہی کعب الاحبار ہے جس نے لولاک لما خلقت الافلاک، کی حدیث وضع کر کے یہ تاثر دیا ذات نبویہ تخلیق کائنات کی علت غائیہ ہیں۔ عالمِ ارواح میں آپؐ کا نبوۃ سے موصوف ہونا۔ ساری کائنات کی نعمتوں کا آپؐ کے وجود سے اجرا ثابت کرنا یہ سب نظریات حدیث لولاک سے اختراع کئے گئے ہیں، حالانکہ محدثین کے نزدیک یہ حدیث بالاتفاق موضوع ہے (اسدی غفرلہٗ)

کرتے ہوئے تفسیر میں ایک کتاب تالیف کی جس نے مشرق میں شہرتِ عام اور مقبولیت حاصل کی ——

تفسیر کی دوسری قسم وہ ہے جس میں زبان و ادب کے محور پر بحثیں گردش کرتی ہیں تاکہ لُغت و اعراب اور بلاغت کو جتنا دخل مقاصد اور اسالیب کے مطابق معنی کے ادا کرنے میں ہے، ان کی معرفت حاصل ہو جائے، اور تفسیر کی یہ قسم اول الذکر قسم سے کوئی جداگانہ اور منفرد حیثیت نہیں رکھتی، کیونکہ اول الذکر تو مقصود بالذات ہے اس لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ لُغت و اعراب اور بلاغت سے تو بحث ہو اور قرآن کے معانی، اس کے قصص اور واقعات و حوادث وغیرہ سے صرف نظر کرتے ہوئے ان سب کو ترک کر دیا جائے، لیکن جب علومِ لسانیہ نے ایک فن اور صناعت کی حیثیت اختیار کی تو تفسیر میں ان مباحث نے جگہ حاصل کی، ہاں، کچھ تفاسیر ایسی ضرور ہیں جن میں لغت و اعراب اور بلاغت کے عناصر کو کافی حد تک غلبہ حاصل ہے —— (مقدمہ ابنِ خلدون)

بعض مفسّرین کی بے اعتدالیاں

صاحب کشف الظنون نے چند مُفسرین کی بے اعتدالیوں اور کتب کی لغویات کا جو تذکرہ کیا ہے، وہ افادیت سے خالی نہیں، اس لئے اسے بھی جان لینا چاہیئے، وہ کہتے ہیں کہ:-

"بعض مفسرین ایسے ہیں جنہوں نے اپنی کتاب کو اس فن سے بھر دیا ہے جس کا انہیں ذوق تھا اور جس میں وہ مہارت رکھتے تھے، گویا قرآن اُن کے اسی پسندیدہ علم کا مظاہرہ کرنے کے لیے نازل ہوا ہے اور اس کے علاوہ اس کا کوئی مقصد نہیں، باوجود یہ کہ اس میں ہر چیز کا بیان ہے، چنانچہ تم نحوی کو دیکھو گے کہ اسے اعراب اور اس کی وجوہ محتملہ کی کثرتِ تعداد کی نمائش کرنے کے علاوہ اور کسی چیز سے سروکار نہ ہوگا، اگرچہ وہ وجوہ بعید ہی کیوں نہ ہوں اور وہ (نحوی) قواعد نحویہ، اس کے مسائل و فروع اور اس کی خلافیات کو نہایت بسط و تفصیل سے بیان کرتا ہے جیسا کہ زجاج اور واحدی نے "البسیط" میں اور ابوحیان نے "البحر والنہر" میں کیا ہے، اور تاریخ و روایات سے شغف رکھنے والے کسی صاحب کو تم دیکھو گے کہ انہیں اپنی کتاب میں قصص و حکایات کا انبار لگانے کے سوا اور کسی کام سے کوئی واسطہ نہیں، خواہ وہ روایات صحیح ہوں یا غلط، انہی میں سے ثعلبی ہیں اور فقیہ تو یہ چاہتا ہے کہ اس میں پوری فقہ تفصیل سے بیان کر دے، اور کبھی فقہی فروع کے دلائل قائم کرنے میں ایسا تسلسل پیدا کرتا ہے، جس کو مطلقاً آیتِ قرآنی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور مخالفین کے دلائل کا جواب دینے لگتا ہے، جیسے قرطبی اور صاحب علوم عقلیہ اور بدعتی کو بجز آیات میں معنوی تحریف کرنے اور اپنے فاسد مسلک کے مطابق قرآن کو ڈھالنے کے سوا اور کوئی کام نہیں چنانچہ اگر اسے شمہ برابر بھی دور از کار بات سجھائی دیتی ہے، تو اس کا سہارا لینے سے نہیں چوکتا یا اسے اگر پیر ٹکانے کے لائق بھی جگہ نظر آتی ہے تو وہاں دوڑ لگاتا ہے ——

رہا ملحد، تو اللہ کی آیات میں اس کے کفر و الحاد اور اللہ پر اس کے افترا کا حال نہ پوچھو، جیسا کہ ان ھی الا فتنتك سے متعلق ان میں سے بعضوں کا یہ قول ہے، کہ بندوں کو نقصان پہنچانے والا ان کے ربّ سے زیادہ کوئی نہیں ہے، اور یہ قول، صاحب "قوت القلوب" ابوطالب مکی کی طرف منسوب ہے —— اور اسی قبیل سے وہ لوگ ہیں جو بلا کسی سند کے اور سلف سے منقول کسی چیز کے بغیر اور اصولِ شرعیہ سے روگردانی کرتے ہوئے اور قواعد عربیہ کو پسِ پُشت ڈال کر قرآن میں گفتگو کرتے ہیں مثلاً محمود بن حمزہ کرمانی نے دو جلدوں پر مشتمل اپنی کتاب "العجائب والغرائب" میں ایسے ایسے اقوال درج کئے ہیں جو سخت ناپسند اور منکر ہیں اور جن پر اعتماد کرنا جائز نہیں اور ان کا بیان صرف

اس صورت میں جائز ہے، کہ ان سے بچنے کے لیے ان کا ذکر کیا جائے۔ ان لغو، مہمل اور منکر (بلکہ باعث شرم اور قابل ملامت) اقوال میں سے کسی صاحب کا ایک یہ قول ہے، کہ اللہ کے ارشاد ـــــ " ربنا و لا تحملنا ما لا طاقۃ لنا بہ میں ناقابلِ برداشت بوجھ سے مُراد، عشق و محبت کا بار ہے، اسی طرح کسی صاحب نے اللہ کے قول ـــــ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ ـــــ کا مثلاً اس طرح کیا ہے کہ اصل میں یہ یوں ہے، مَنْ ذَلَّ (جو ذلیل ہوا) اور ذی اشارہ ہے نفس کی طرف اور یشف شفا سے ماخوذ ہے جو مَنْ کا جواب ہے، اور ع امر ہے دعی سے .... بلقینی سے اس طرح کی تفسیر کرنے والے کی بابت پوچھا گیا، تو انھوں نے فتویٰ دیا کہ ایسا شخص ملحد ہے"
(کشف الظنون)

صوفیہ کا کلام رہا قرآن میں صوفیہ کا کلام، تو وہ تفسیر نہیں ہے۔ ابن الصلاح نے اپنے فتاوی میں امام واحدی کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ سلمی نے "حقائق التفسیر" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ہے، تو اگر اس کا اعتقاد یہ ہے کہ یہ (کتاب) قرآن کی تفسیر ہے، تو اس نے کفر کیا ہے ـــــ اسی طرح ابن عربی کی تفسیر اور "عرائس البیان" اور "روز بیان" کی تفسیر کفریات کا مجموعہ ہیں۔

امام نسفی نے اپنی کتاب "عقائد" میں کہا ہے، کہ نصوص اپنے ظاہر پر محمول ہیں اور جو مفہوم و معنی ظاہری الفاظ سے سمجھ میں آتے ہیں، ان سے عدول کر کے ایسے معنی اختیار کرنا الحاد ہے جس طرح کے معنی کا ادعا اہلِ باطن کرتے ہیں، اور علامہ تفتازانی اس کی شرح میں کہتے ہیں، کہ ملاحدہ کا نام باطنیہ اسی لیے پڑا کہ ان کا یہ ادعا ہے، کہ نصوص اپنے ظاہر پر محمول نہیں ہیں بلکہ ان کے دراصل باطنی معانی ہیں۔ جنہیں صرف معلّم (باطنیہ کے داعی یا پیشوا یا مُرشد) ہی جانتے ہیں، اور اس سے ان (باطنیہ) کا مقصد یہ ہے کہ شریعت کی ساری عمارت ملیامیٹ ہو جائے ـــــ (شرح عقائد نسفی)

اسلوبِ قرآن

مصطفیٰ رافعی اپنی کتاب " اعجاز القرآن" میں بعنوان" اسلوب القرآن" لکھتے ہیں کہ:۔

——— " یہ اسلوبِ قرآنی ایسا ہے جو تمام کلامِ عرب میں " مادۃ اعجاز عربی" ہے، جس کا کوئی عنصر بھی ایسا نہیں جو معجزہ نہ ہو۔ اور قرآن کے علاوہ عام عربوں کے کلام کا اسلوب ناممکن ہے کہ معجزہ ثابت ہو سکے۔ اسی اسلوب کلام نے عرب کو اس کے مقابلہ و معارضہ کی ہر کوشش میں ناکام رکھا اور اس کلام و اسلوبِ کلام میں کسی طرح کا نقص نکالنے سے باز رکھا، اس طرح اُن پر خود انہی کے اندر سے حجت و دلیل قائم کی اور انہیں بے دست و پا بنا کر رکھ دیا ———

پھر اسی اسلوب نے اہلِ عرب کے سامنے ایک ایسی یاس و نا اُمیدی لا کھڑی کی جس سے کوئی اُمید و طمع کبھی دوچار ہی نہ ہو سکی اور ان پر عاجزی و بے بسی کو اس طرح مُسلّط کر دیا، کہ وہ ایسے اسلوب پر قدرت رکھنے کا تصور بھی نہ کر سکے، اس طرح اُن کے مزاج اور طبعی ذوق ہی نہ تھا اور وہ اگرچہ بہت تیز اور دھار دار تھا مگر اب کند ہو گیا ہے اور پہلے بہت کارگر تھا مگر اب اس میں وہ خوبیاں ہی نہیں رہی ہیں اور اس نے اپنی شکست تسلیم کر لی ہے ———

ظاہر ہے کہ وہ (اہلِ عرب) کلام و خطابت میں باہم مقابلے بھی کیا کرتے، شعر گوئی کے میدان میں ان کے درمیان مسابقت بھی ہوا کرتی اور شعر کے اغراض و معانی پر وہ ردو قدح بھی کیا کرتے تھے، اور یہ اس وقت کی بات ہے، جب فصحائے عرب کے نزدیک کلام کے ایک فن اور دوسرے فن کے درمیان، معانی کے فرق اور اختلاف اغراض اور کلام میں وسعتِ تصرف کے علاوہ اور کوئی خاص فرق نہ تھا، کیونکہ ان کا اسلوبِ کلام ایک قبیل اور ایک طرز کا تھا جسے ایک "جنسِ معروف" کہہ لیجئے، یعنی آزاد لہجۂ گفتگو اور فصیحانہ خطاب، تربیت و نسق میں سادگی، مضمون و فکر میں پورا زور اور اعتماد، عبارت کی فصاحت اور ترکیب الفاظ میں حُسن و خوبی، جن میں ایک لفظ بھی مبہم رکھ دینا یا کسی کلمہ کو دبا دینا وہ پسند نہیں کرتے تھے، نہ کسی خاص ترکیب کا اہتمام ———

——— اور کسی مخصوص ساخت کا تکلف کیا کرتے اور نہ فن کارانہ صنائع و بدائع کی اُلجھن میں وہ مبتلا ہوتے۔ (یعنی آورد نہ تھی، بلکہ صرف آمد تھی، خود فطرت و طبیعت اُن کے ادبی نظم و نثر کے شہ پاروں میں ان کی معاون ہوا کرتی تھی، اس لئے الفاظ اُن کی زبان پر بے تکلف جاری ہو جاتے تھے ادھر خیالات ان کے دماغ میں گونجے، ادھر ان کے افکار کے دھارے کے ساتھ وہ الفاظ بہنے لگتے، اُن کے تخیل کی ہر حرکت کے ساتھ با معنی الفاظ اس طرح ہاتھ باندھ کر آن کھڑے ہوتے، جیسے کہ یہی الفاظ اس رفتارِ تخیل کی اساس ہیں اور ایسا معلوم ہوتا کہ یہ لفظ اسی دن کے لئے وضع ہوا ہے اور اسی معنی کے لئے ڈھلا ہے، کوئی دوسرا لفظ اس مضمون و تخیل کی ادائیگی کے لئے وضع ہی نہیں ہوا ہے، یہاں تک کہ اس کی جگہ پر خود متکلم کی زبان سے دوسرا لفظ بالکل غیر مونوس اور نامناسب معلوم ہونے لگتا، اور متکلم کے نقطہ نظر اور اس کی قوم کے شیوہ بیان اور اس کی زبان و لغت کے

لحاظ سے اس مقام کے لیئے اس سے زیادہ مناسب تر کوئی لفظ ناممکن ہوتا تھا ____

لیکن جب اُن (اہلِ عرب) کے سامنے اسلوبِ قرآن آیا تو انہوں نے بعینہٖ انہی الفاظ کو اسی اسلوب میں مستعمل اور رواں پایا، جن کو وہ دن رات بولا کرتے تھے، بالکل اسی اندازِ گفتگو اور اسی طرزِ خطاب کے ساتھ جس کے وہ عادی اور جس سے وہ مانوس و مالوف تھے، جس میں کوئی تکلف و پیچیدگی اور ابہام نہ تھا ____

اس کے باوجود نظمِ قرآن کے طرق، اس کے وجوہ ترکیب، اس کے کلمات میں حروف کی ترتیب، اس کے جملوں میں ان کلمات کی ترتیب اور پھر مجموعۂ قرآن میں ان کے دلوں پر ایک ہیبت بیٹھ گئی اور ایک پُرجلال خوف چھاگیا، ایسا خوف جس سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ____

یہاں تک کہ عرب اپنی اس فطری زبان آوری کو جسے وہ بہت قوی سمجھتے تھے، ضعیف سمجھنے پر مجبور ہو گئے اور کلام و خطابت کے اپنے مستحکم ملکہ کو قرآنی بلاغت کے سامنے بہت پست اور بہت پیچھے باور کرنے لگے، اور ان کے بلغا کو اعتراف کرنا پڑا، کہ اسلوبِ قرآنی بیان و کلام کی وہ جنس گرانمایہ ہے، جس تک ان کی پرواز نہ ہو سکی ہے۔ نہ ہو سکتی ہے ____

نیز اہلِ عرب نے شدت کے ساتھ یہ بھی محسوس کیا کہ یہ نظم و اسلوب خود ان کی فطرتِ لسانی کی روح اور جان ہے اور کسی عرب کے دل و دماغ کو اس اندازِ نظم و بیان سے پھیرنے اور باز رکھنے کی کوئی سبیل نہیں ہے اور نہ کسی عرب کے دل و دماغ کو اس بیان سے متاثر ہونے سے بچایا جا سکتا ہے، اس لیے کہ یہ اسلوبِ قرآن عرب کے لغوی کمال کا وہ رُخ ہے جسے سارے عرب کی روح جانتی پہچانتی ہے اور جو اُن کے دلوں کی دھڑکن ہے، بلکہ ایک رمز و سر ہے جو ان اہلِ عرب میں اپنے کو فاش کرتا جا رہا ہے، خواہ وہ اسے کتنا ہی چھپانے کی کوشش کریں۔ یہ ان کی زبانوں پہ آرہا ہے، ان کے چہروں سے ٹپک رہا ہے اور حس و شعور کی آخری حدوں تک جا پہنچا ہے ____

لہٰذا کسی بہانہ سازی، کسی طمع سازی اور کسی فریب کاری کہیں سے کوئی گز نہیں، کہ اس سے اسلوبِ قرآن کی تاثیر کو ختم کیا جائے اور اس کو اس کے مقام سے ہٹایا جائے، اور اگر کسی نے اپنے کلام کے ذریعہ یہ چاہا یا کسی تدبیر و حیلہ سے کام لے کر اس کا ارادہ کیا تو وہ نفوس کو ان کی طبعی خواہشات سے پھیرنے اور دلوں کو ان کی محبت و اُلفت سے باز رکھنے کی کوشش کرے گا، گویا نفس کے قوی ترین جذبے کو اس کے ضعیف ترین جذبے سے دبانے کی سعیٔ لاحاصل کرے گا، یہ قلبی لگاؤ اور فطری کشش، جیسا کہ وہ خود جانتے تھے، ایک ایسی چیز ہے، جو کسی شخص کے کہنے سُننے اور عصبیت اور اغراض و خواہشات کے تابع نہیں رہتی اس کی تو صرف یہی صورت ہو سکتی ہے، کہ وہ شخص جبلت اور قانونِ فطرت کو توڑ دے، تب اسکی مُراد پُوری ہو، مگر جبلت اور قانونِ فطرت کے توڑنے کے لیے ضروری ہے، کہ وہ از سرِ نو تخلیق کرے اور خالق والہٰ بن جائے، اور اس کا، جیسا کہ تم جانتے ہو، نہ نام لیا جا سکتا ہے اور نہ تصور ہی کیا جا سکتا ہے ____

یہ وہ باتیں تھیں، جن کو بلغائے عرب نے اچھی طرح محسوس کر لیا تھا، اس لیے وہ قرآن کے معارضہ (قرآن جیسا کلام پیش کرنے) سے مایوس ہو گئے، اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ قرآن حکیم ان کی ساری قوتِ بیانیہ ہی کو سلب کیئے لیتا ہے، طبیعت کی موزونیت اور جولانی کو ختم کیئے دے رہا ہے، اور دل سے براہِ راست ٹکرا کر انہیں بے بس اور بے سہارا بنائے جا رہا ہے جس کے مقابلہ میں کوئی حیلہ اور کوئی فریب کام نہیں دے سکتا ____

رہی امکان کی حد تک معارضہ کی صورت، جسکی خواہش ذہن وخیال میں ابھر سکتی ہے، تو اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ معارضہ کرنے والے کے کلام کا ایک خاص انداز واسلوب ہو، جس پر کوئی حرف گیری کبھی نہ کی گئی ہو اور اس کے کلام میں (علم) معانی کا کوئی ایسا نکتہ ہو جو اس سے پہلے بیان تحریر میں نہ آیا ہو یا صنائع و بدائع کا کوئی ایسا باب ہو جو اس کے پیشتر وانہ ہوا ہو، نیز اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے، کہ (فن معانی کے دوش بدوش علم) بیان کے تمام اسالیب وطریق اس معارض کے سامنے کھلے ہوئے ہوں، کہ وہ جس میں سے چاہے لے لے اور جس کو چاہے نظر انداز کر دے، تاکہ وہ (معارض) ایک خوب کا خوب تر سے نہ سہی تو دوسرے خوب سے معارضہ کر سکے اور ایک کلمہ کو دوسرے کلمہ کے مقابلہ میں رکھ سکے یا ایک جملہ کے مقابل دوسرا جملہ لا سکے ——

لیکن اگر کوئی معارض اس طرح معارضہ و مقابلہ پر قادر بھی ہو، تو پھر بھی اس کے لئے ایک مزید مہم سر کرنے کو رہ جاتی ہے، اور وہ یہ کہ اس معارض کے کلام کی تاثیر کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے کیا اور کتنی ہے ؟ —— —— اور قوم کے دل و دماغ پر اُس کلام کی گرفت کس حد تک ہو سکتی ہے ؟ —— یہ اس لیے کہ تاثیرِ کلام کے ذرائع و وسائل سے کام لینا ارباب بلاغت کے یہاں ایک بڑا مقام اور بڑی اہمیت رکھتا ہے اور بلاغت کا یہ ایک وسیع اور اہم ترین باب ہے، اور جب فن بلاغت اور اس کے اسباب میں بصیرت سے کام لے کر ایک دوسرے کے مقابل خم ٹھونک کر آتے ہیں تو وہ اثر انگیزی کے تمام طریقوں سے کام لینے پر مجبور ہوتے ہیں ان کا بھرپور استعمال کرتے ہیں، اس لیے ہر صاحبِ بلاغت، اپنے کلام سے کسی جذبے کے تار کو چھیڑتا ہے اور اپنے کلام کو نفسِ انسانی کے تاروں سے ہم آہنگ بنانے کی انتہائی کوشش کرتا ہے ——

اب ظاہر ہے، کہ وہ صاحب بلاغت، بلاغت کے دوسرے مرد میدان کے کلام میں تناسب و توازن کا کوئی خلل یا کمی اور قسم کا کوئی نقص، خواہ وہ معمولی سا ہی کیوں نہ ہو، ضرور محسوس کرتا ہے، یا سلسلۂ کلام کی کسی کڑی میں نفس کی غفلت و بے شعوری کو پاتا ہے، یا کسی طرح کے استکراہ و تنفر کا اثر معلوم کرتا ہے، جس کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں، جو اہلِ بلاغت کو اپنے پیشہ و فن میں پیش آ سکتے ہیں، اور آتے رہتے ہیں، جس کی وجہ سے اُن کے کلام کے کسی حصّہ میں خلا یا کوئی نقص و خلل واقع ہو سکتا ہے اور کلام کے معنی کہیں سے کمزور پڑ سکتے ہیں اور اس کی معنویت اپنی عظمت و بلندی کسی مقام پر کھو سکتی ہے، جس کی وجہ سے ایک ہی اسلوب میں ضعف و قوت کے اعتبار سے بڑا تفاوت اور فرق پیدا ہو سکتا ہے ——

اب اگر اس بلیغ نے اپنے حریف کی کمزوری اور نقص کو بھانپ لیا، تو اس کا اپنے اندازِ فکر اور اپنے تخیّل اور اپنے کلام کے راجح و فائق توازن وغیرہ جیسی چیزوں سے، ظاہر ہے کہ مقابلہ کرے گا، اس طرح جب وہ ٹھونک بجا کر دیکھ لے گا، اور دونوں قسم کے کلام کو خوب اچھی طرح تول کر اطمینان کر لے گا، تب کہیں جا کر وہ معارضہ و مقابلہ کے میدان میں نکل سکتا ہے اور اسے اس کی سبیل نظر آ سکتی ہے اور اس طرح ایک کلام کی فوقیّت اور خوبیاں دوسرے کلام پر، ایک طبیعت کی جولانی دوسری طبیعت پر اور ایک ذہن و دماغ کی اور ایک فکر کی عظمت و رَوانی دوسرے ذہن و دماغ اور دوسری فکر پر آشکارا ہو سکتی ہے —— لیکن اگر ایسا نہیں اور ضعف و توازن اور الفاظ کے انتخاب میں اختلافِ ذوق اور ترکیب و معانی وغیرہ میں فرق مراتب، فطرت بلغاء میں داخل ہے، بلکہ اس سے کوئی فرد بشر محفوظ نہیں ہے، تو

تو پھر یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ دو شاعر ایک دوسرے کے مدّمقابل آئیں یا دو رجز خوان رجز گوئی کے ہنر دکھائیں یا دو انشاء پرداز مراسلت و کتابت کے مَردِ میدان بنیں۔ یا دو خطیب جوہرِ خطابت دکھائیں یا ایک کلام کا دوسرے کلام سے تقابل معرضِ بحث میں لایا جائے اور انصاف و نقد کے ترازو میں تول کر ایک کی برتری اور دوسرے کی کمزوری پر سارے اذہان و اذواق کا کامل اتفاق ہو جائے اور بلا کسی تردّد اور تذبذب کے ہر ذہن و ذوق پر پورے انشراح صدر کے ساتھ یقینی فیصلہ صادر کر دے ——

اب وہ کلام جس کے ذریعہ معارضہ و مقابلہ کا ارادہ کیا جا رہا ہے، اس قرآن کی طرح ہو جس کا دقیق و جلی سب محکم و مضبوط ہو، جس کا کثیر و قلیل ایسا ہو جس کی نظیر پیش کرنی کسی کے بس کی بات نہ ہو، جس نے فن کے ہر رخنے اور ہر مسلک و طریق پر قابو پا رکھا ہو اور جس معنی کو اس نے پیش کیا ہو اس کا حق ادا کر کے رکھ دیا ہو اور اپنے حریف پر اُس رُخ سے توجّہ کرنے کا حق و اختیار ہی سلب کر لیا ہو، جس پہلو سے وہ مقابلہ و معارضہ کرنا چاہتا ہے، علاوہ بریں وہ اپنی جامعیت میں حریف پر حملہ آور ہونے کا راستہ بند کر کے ایک بابِ واحد کی حیثیت اختیار کر گیا ہو، جس میں کسی تلاش و جستجو کا کوئی محل و مقام نہ رہا ہو، نہ گفتگو اور اعتراض کی کوئی گنجائش ہو اور ان خوبیوں پر اس کے دقائق و نکات مزید اضافے کر رہے ہوں، پھر وہ مجموعی حیثیّت سے بھی اور اس کا ہر کلمہ اور ہر جُملہ بھی فنونِ معانی و بیان پر پوری طرح حاوی ہو اور ایسا فنّی کمال اور ایسی جامعیّت اپنے اندر رکھتا ہو جو اربابِ معانی و بیان کے یہاں شعور و وجدان سے تعلق تو ضرور رکھتا ہے مگر خارج میں جس کے اظہار و بیان پر کوئی اپنے اندر قوّت نہ پاتا ہو، تو یہ ایسی خوبیاں اور خصوصیات ہیں کہ ضعف و نقص اور متذکرہ بالا فرق مراتب کے خمیر سے تیار شدہ نفسِ انسانی کسی حال میں بھی کسی مقابلہ پر کمربستہ نہیں ہو سکتا بلکہ سنجیدگی کے ساتھ اسے سوچ بھی نہیں سکتا، یہ اور بات ہے کہ مقابلہ و معارضہ کر سکنے کے لئے محض ایک وہم میں مُبتلا رہے یا اس کے مثل لانے پر قدرت رکھنے کی ڈینگیں مارے، اس لئے کہ یہ کلامِ مبین (قرآن) اپنی فطرت اور اساسی نوعیت ہی میں معجزہ ہے، جس میں نفس کی نوعیّت کے سامنے صرف ایک مثالی علم آتا ہے جس کے ذریعہ اسے ان عملی احکام کی نوعیّت معلوم ہو جاتی ہے جس کا اس نے ادراک کیا ——

(تاریخ افکار اور علومِ اسلامی ص۱۴۸)

قرآنِ حکیم کے مضامین

علامہ محمد راغب الطباخ لکھتے ہیں :۔

قرآن کے مضامین و مقاصد بے شمار[1] ہیں، سب سے اول اور اہم اللہ تعالیٰ کے وجود کا بیان ہے اور یہ کہ وہ واحد ہے، احد ہے صمد ہے اور یہ کہ وہی اس کائنات کا خالق ہے اور اس کے قیام و قرار کا ہر وقت اور ہر آن سامان فراہم کر رہا ہے، نیز اللہ تعالیٰ کی واحدانیت و ربوبیت کے واضح دلائل اور براہین قاطعہ کا اس میں بیان ہے اور اللہ ہی کی عبادت کی دعوت اس میں دی گئی ہے اور یہ کہ ہم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ ان کے علاوہ قرآن حکیم میں :

- ان احکام کا بیان ہے جن سے انسانوں کے احوال اور ان کی معیشت منظم ہو ۔
- نفوس کی تہذیب و اصلاح کے لیے مواعظ و حِکَم اور امثال پیش کئے گئے ہیں ۔
- ان اوامر و نواہی کا بیان ہے جن سے انسانی سعادت وابستہ ہے ۔
- دلوں کی استقامت اور عزم و حوصلہ کی پختگی کے لیے انبیائے سابقین کے قصص ہیں، تاکہ ان کی اقتداء کرکے اور اُن کی روش پر چل کر فوز و فلاح حاصل کی جائے ۔
- ان اُمم سابقہ اور سرکش نفوس اور ان جبّاروں کے تذکرے ہیں جنہوں نے دعوتِ حق سے اعراض کیا اور یہ کہ جب انہوں نے داعیانِ حق کی دعوت کو رَدّ کر دیا تو ان کے انکار کا نتیجہ کیا نکلا ۔
- آداب معاشرت اور اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لئے حقوق و فرائض اور عام لوگوں اور اہل و عیال کے ساتھ معاملات اور تعلقات کی نوعیت کا بیان ہے ۔
- اعمالِ خیر کرنے، شر سے بچنے اور معروفات کی تلقین کرنے پر ابھارا گیا ہے ۔
- آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان جو عجائب ہیں نیز انسانوں، حیوانوں اور نباتات میں تفکر کی طرف توجہ دلائی گئی تاکہ عبرت و بصیرت حاصل ہو اور ان آثارِ کائنات کے فکری مشاہدہ سے ان کے خالق کی معرفت حاصل ہو اور اس کی عظمت کا احساس ہو۔
- اس کائنات کے انجام اور مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات و حقائق کی خبریں ہیں اور یہ کہ اس کائنات کے درہم برہم ہو جانے کے بعد نشاۃ ثانیہ ہوگی اور آخرت کی زندگی میں کن کو کیسے انعامات سے سرفراز کیا جائے گا اور کن کو دائمی عذاب سے پالا پڑیگا۔

---

[1] سورۃ الانعام میں ارشادِ الٰہی ہے کہ مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتَابِ مِنْ شَیْءٍ۔ (۳۸) یعنی ہم نے اس کتاب میں نہ کوئی چیز چھوڑی ہے اور نہ غافل ہوئے ہیں۔ بیضادی کا قول ہے کہ قرآن کہیں تو تفصیل کیساتھ اور کہیں اجمالی طور سے ان سارے امور پر مشتمل ہے جن کی دین میں احتیاج ہوتی ہے (مصنف)

خلاصہ یہ کہ اتنے مختلف علوم، اتنے متعدد مقاصد اور انسان کے لیے نفع دینے والے ایسے مضامین جو انسان کو اس کی دائمی سعادت پر فائز کر دیں کسی کتاب میں جمع نہیں ہیں جتنے اللہ کی کتاب میں جمع ہیں ـــــــ

امام راغب اصفہانی اپنے رسالہ "مقدمۃ التفسیر" میں لکھتے ہیں: ـــــــ

"کوئی دلیل و برہان اور تقسیم و تحدید جس کی بنا معلومات عقلیہ و سمعیہ کی کلیات پر ہو، ایسی نہیں ہے جسے کتاب اللہ نے استعمال نہ کیا ہو، لیکن اسے اللہ تعالیٰ نے عرب کی عادت کے مطابق وارد کیا ہے نہ کہ حکماء و متکلمین کی دقیقہ سنجیوں کے طریقہ پر، اور اس کی دو وجہیں ہیں، ایک تو وہ جو اللہ کے اس قول سے ظاہر ہوتی ہے کہ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ اور دوسرے یہ کہ برہان و حجت پیش کرنے کے غامض طریقوں اور ثقیل انداز استدلال کو وہی اختیار کرتا ہے جو زبردست اور واضح ترین کلام کے ساتھ حجت قائم کرنے سے قاصر ہوتا ہے، ورنہ وہ شخص کبھی غامض کلام اور چیستاں بنانے کا وہ طرز اختیار نہیں کرے گا جسے معدودے چند افراد ہی سمجھ سکیں اور عظیم اکثریت اس کے فہم سے محروم رہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے سامنے دلائل بیان فرمانے کی صورت میں دقیق سے دقیق بات کو اتنے پاکیزہ، بلند ترین اور واضح ترین انداز سے بیان فرمایا جس سے عام لوگ اپنا اطمینانِ قلب کرلیں، اور ہر شخص کی فہم و عقل کے ظرف کے مطابق برہان و حجت کی اس میں سمائی ہوسکے، عقل عام بھی برہان و حجت کا حصّہ پائے اور خواص بھی اس خطاب سے ایسے مطالب سمجھ لیں جن کا ادراک حکماء کی فہم و عقل کرتی ہے ـــــــ

یہی وجہ ہے، کہ علوم میں جس کا جتنا حصہ ہوگا اتنا ہی زیادہ علم القرآن کا حصّہ اسے نصیب ہوگا، اور یہی وجہ ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں کہیں اپنی ربوبیت اور وحدانیت پر برہان و حجت پیش کی ہے، وہاں اس کے بعد کہیں تو یہ کہا ہے کہ اسے "اولوالعلم" (صاحبانِ علم) جان سکتے ہیں، کہیں محض سننے والوں کی طرف نسبت کی ہے اور کہیں "مفکرین" کا لفظ استعمال کیا ہے، ایسا اسی لئے ہے، تاکہ اس بات پر انتباہ ہوجائے، کہ ان قوتوں میں سے ہر قوت کے لیے اس کی حقیقت کا ادراک ممکن ہے، چنانچہ تم قرآن میں جابجا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ اور اس جیسی دوسری آیات دیکھوگے" ـــــــ

"جن احکام پر شرائع مشتمل ہیں وہ چھ ہیں، اعتقادات، عبادات، فطری خواہشات، معاملات، سزائیں، اور اخلاقی آداب ـــــــ پس، اعتقادات پانچ ہیں ـــــــ وجودِ باری تعالیٰ کا مع اس کی صفات کے ثبوت، فرشتوں کا اثبات جو اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے درمیان سفیر کی حیثیت رکھتے ہیں، کتاب، رسول اور قیامت۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ان سب کا تذکرہ ہے۔ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ـــــــ الآیہ عبادات آٹھ ہیں ـــــــ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، جہاد، اعتکاف، نوافل اور کفارے، اور فطری خواہشات کے ضمن میں یہ چار چیزیں آتی ہیں، کھانے، پینے، نکاح اور لباس سے متعلق امور، اور معاملات کے دائرہ میں یہ چار ہیں، معاوضات جیسے خرید و فروخت اور اجرت وغیرہ، منازعات جیسے دعوے اور شہادتیں، امانتیں جیسے عاریت اور ترکے جیسے وراثت اور وصیت اور سزائیں پانچ طرح کی ہیں، وہ سزا جو قتلِ نفس کی پاداش میں دی جائے تاکہ انسانی جان کی حرمت و حفاظت قائم رہے، وہ سزائیں جو حفظِ ناموس کو بحال رکھنے کے لئے عزتوں پر حملہ کرنے کے جرم میں دی جائیں، جیسے تہمت کی سزا حفظِ نسب کے مقصد کو مختل ہونے سے بچانے کی خاطر زنا پر جو سزائیں مقرر ہیں جیسے کوڑے مارنا، حفظِ مال کی راہ میں کاٹ

بننے والے افعال کے استیصال کے لئے جو سزائیں مقرر ہیں، جیسے ہاتھ کاٹنا اور دین وملّت اور الجماعت کی حفاظت و حمایت کے پیشِ نظر فتنہ وفساد کے استیصال کیلئے مجوزہ سزائیں جیسے قتلِ مُرتد اور باغیوں سے قتال ——

رہے اخلاقی آداب تو وہ تین قسم کے ہیں، ایک قسم تو وہ ہے جو انسان کی اپنی ذات اور اس کے اخلاق کی اصلاح کے لئے ہے جیسے علم وحلم، سخاوت وعفت، شجاعت، وفائے عہد اور تواضع وغیرہ، دوسرے وہ اخلاق جن کا تعلق خاندان اور افرادِ معاشرہ کے باہمی تعلّقات سے ہے جیسے والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک، صلۂ رحمی، پڑوسی کی حفاظت؛ حقوق کا لحاظ، اہلِ فقر کے ساتھ ہمدردی مظلوم کی مدد، پریشان حال کی دستگیری وغیرہ اور تیسرے وہ جو رعیّت کے معاملات اور مُلکی سیاست کے باب میں اربابِ اقتدار کے ساتھ مخصوص ہیں ——

شریعت (قانون) اور آداب واخلاق میں فرق یہ ہے کہ شریعت کا دائرۂ مقدار اور کیفیّت میں محدود ہے اور اس کے ترک واعراض پر مقرّرہ عقوبت (سزا) ہے، لیکن اخلاقی آداب کی تو نہ کیفیّت محدود ہے اور نہ مقدار ان سے غفلت کرنے والے کے لئے سزا مقرر نہیں ہے، بلکہ انہیں پاک نفوس کے حوالہ کر دیا گیا ہے کہ جو جتنا اُونچا جا سکتا ہے ہو جائے وما یعقلها الا العالمون اور یہ تمام امور، اعتقادات، عبادات وغیرہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات میں جمع ہیں —— ان پانچوں انواع میں اوّل واشرف اعتقادات ہیں کیونکہ وہ دائرۂ علم میں ہیں اور باقی دائرۂ عمل میں اور علم اساس ہے اور عمل عمارت اور عمارت بغیر اساس کے ممکن نہیں، البتہ بُنیاد بغیر عمارت کے ہو سکتی ہے اور یہ کہ علم اصل ہے اور عمل فرع اور فرع کو اصل کے بغیر ثبات نہیں جیسے اصل کا کمال بغیر فرع کے متحقق نہیں ہوتا اور سب کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اعتقاد عمل پر مقدم ہے، یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان مُسلم وغیر مسلم کا یہ فرق کہ اسلام مفید ہے اور کفر نقصان رساں ہے، اعتقاد ہی کے اعتبار سے ہے، عمل کے اعتبار سے نہیں۔ اور حد یہ ہے کہ اعتقاد خراب ہو تو آدمی کے اچھے اعمال (سوئے اعتقاد کے سبب بُرے اعمال بن جاتے ہیں —— مثلاً یہ کہ شرک کے عقیدے کے ساتھ کوئی بھی اچھا عمل قبول نہیں ہوتا بلکہ سب اعمالِ حسنہ ضائع ہو جاتے ہیں ——

پھر اعتقاد کے بعد عبادت کا درجہ ہے، اور اسی لئے نماز روزہ اور غسلِ جنابت میں خلل ڈالنے والا مسلمانوں کی نگاہ میں مرتکبِ ظلم سے زیادہ گناہ گار ہے۔ اسی طرح یہود کے نزدیک ہفتہ کی تعظیم سے اعراض اور نصاریٰ کے نزدیک عبادت کا ترک، اور مجوسیوں کے نزدیک زمزمہ[۱] کا ترک انسانوں پر ظلم کرنے سے بڑھ کر گناہ ہے، کیونکہ عبادت اللہ کے حق کی حفاظت ہے اور لوگوں پر ظلم کرنے سے بچنا، حقوق العباد سے متعلق اللہ کے احکام کی حفاظت ہے (اور حقوق اللہ حقوق العباد سے مقدم ہیں، اس لئے) عابد کا درجہ ظلم سے بچنے والے سے اعلیٰ ہے۔

(مقدمۃ التفسیر ص)

---

۱ قاموس میں ہے کہ کھانے کے وقت مجوسیوں کا ایک خاص طریقہ سے گنگنانے کا نام زمزمہ ہے، اس طرح کہ وہ مُنہ بند رکھتے ہیں اور زبان اور ہونٹ کو استعمال نہیں کرتے لیکن ایک ایسی آواز ہوتی ہے جو ان کے نتھنوں اور حلق میں گردش کرتی رہتی ہے جس سے ایک دوسرے کے مفہوم کو سمجھ لیتے ہیں)۔

مُتشابہ آیاتؑ کی علمی تشریح

مولانا حالیؒ فرماتے ہیں :—

محکمات و متشابہات کے الفاظ جو قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں اُن سے کیا مُراد ہے۔؟ شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک جیسا کہ حجۃ اللہ البالغہ میں مذکور ہے :۔

محکمات آیتیں وہ ہیں جن میں ایک معنی سے زیادہ کا احتمال نہ ہو —— متشابہات وہ ہیں جن میں متعدد معنوں کا احتمال ہو مگر مقصود ایک معنی سے زیادہ نہ ہوں —— اس سے ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں جس قدر آیتیں ایسی ہیں جن میں معنی متعددہ کا احتمال ہو سکتا ہے وہ سب متشابہات کے تحت مندرج ہیں :—

دوسرے یہ کہ قرآن مجید میں متشابہات کے لانے سے شارع کا کیا مقصد تھا؟ امام رازیؒ نے اس کی کئی وجوہ بیان کی ہیں مگر سب سے عمدہ وجہ جس کو انہوں نے تمام وجوہ پر ترجیح دی ہے وہ یہ ہے کہ "قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس میں خواص و عوام سب کو حق کی طرف بُلایا گیا ہے اور عوام کی طبیعتیں ادراکِ حقائق سے بعید ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر اُن کے سامنے ایک ایسی ہستی کا بیان کیا جائے جو نہ جسم ہے نہ کسی مکان میں ہے اور نہ اس کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔ تو ان کو یہی خیال ہوگا کہ ایسی چیز معدوم محض کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟ پس مقتضائے حکمت یہی تھا کہ اُن کو ایسے الفاظ کے ساتھ خطاب کیا جائے جو من وجہ اُن کے خیالات سے مناسبت رکھتے ہوں —"

شاہ صاحبؒ نے اسی مطلب کو حجۃ اللہ البالغہ میں اسی طرح بیان کیا ہے کہ :——

" شارع نے محض لوگوں کی معمولی سمجھ کے موافق جو دقائقِ علم و حکمت تک پہنچنے سے پہلے اُن کی اصل فطرت میں ودیعت تھی اُن سے خطاب کیا ہے۔ اور اسی لئے (اُن کی سمجھ کے موافق) اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى " وہ رحمٰن عرش پر مستوی ہُوا —

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ :۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حبشی عورت سے پوچھا کہ " خدا کہاں ہے؟ اُس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا، آپؐ نے فرمایا " یہ مومنہ ہے " یعنی آنحضرتؐ نے باوجود کہ آپؐ خدا تعالیٰ کو کسی خاص جہت میں ہونے سے منزّہ جانتے تھے اس کے آسمان کی طرف اشارہ کرنے کو اُس کے ایمان کے لئے کافی سمجھا اور اس دقیق بات کے سمجھانے کو مناسب نہ جانا کہ وہ ذاتِ اقدس جہت اور مکان سے پاک ہے —" ان سب حوالوں سے ظاہر ہے کہ قرآنِ حکیم میں وہ تمام روحانی اور اعلیٰ مقاصد جو عموماً انسان کی فہم و ادراک سے اور خاص کر عرب کے اُمیوں کی سمجھ سے بالاتر تھے اور جن پر بالاجمال ایمان لانا کافی تھا، اُن کو مجاز و استعارہ اور تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے تاکہ اُمّی اور حکیم دونوں اپنی اپنی سمجھ کے موافق اس سے ہدایت حاصل کر سکیں —

عہدِ عتیق کی کتابیں جن کو مسلمان، یہودی اور عیسائی سب آسمانی کتابیں مانتے ہیں۔ چونکہ وہ اس زمانے میں القا کی گئی تھیں جبکہ انسان کی عقل نہایت ابتدائی حالت میں تھی اس لئے اُن میں قرآن سے کہیں زیادہ کلام کی بُنیاد مجاز اور استعارے پر رکھی گئی ہے۔ تمام عہدِ عتیق کی کتابیں اور صحیفے متشابہات سے بھرے ہُوئے ہیں۔ جیسا کہ بائبل میں ہے :——

" خدا طوفانِ نوحؑ پر اس قدر رویا کہ اُس کی آنکھیں آشوب کر آئیں۔ ایک دوسرے موقع پر اُس کا ایسا ہنسنا کہ کلیاں نظر آنے لگیں۔

ـــ سرکشوں کا اس کو بھڑکا کر غصّہ دلانا اور اس کی ناک میں دھوئیں کا اُٹھنا ـــ خدا کے سانس کا گندھک کے سیلاب کی مانند ہونا ـــ
ـــ شہرِ آشور کا اس کی آواز سے تباہ ہونا اور اس کا آشور والوں کو لٹھوں سے مارنا وغیرہ وغیرہ ـــ
ـــ زبور میں ایک جگہ خدا تعالیٰ داؤدؑ کے مقرّب اور محبوب ہونے کو اس طرح بیان کرتا ہے "میں نے تجھے جنا ہے، میں آج کے دن تیرا باپ ہوا" ـــ دوسری جگہ زبور ہی میں خدا کے انتقام لینے کا بیان اس طرح ہے۔ "آخر خدا وند خواب سے بیدا ہوا اور اس پہلوان کی طرح جو شراب پی کر عربدہ کرے اور اپنے دشمنوں کے پچھاڑ مارے" ـــ

غرض کہ تمام عہدِ عتیق کی کتابیں اسی قسم کے متشابہات سے مالا مال ہیں جن میں روحانی تعلیم جسمانیات کے پیرائے میں لکھی گئی ہے، اسی لئے شاہ ولی اللہؒ صاحب انبیاء کے خواص کے ذکر میں لکھتے ہیں: "وَمِنْ سِيَرِهِمْ أَنْ لَا يُكَلِّمُوا النَّاسَ إِلَّا عَلَىٰ قَدْرِ عُقُولِهِمُ الَّتِي خُلِقُوا عَلَيْهَا وَعُلُومِهِمُ الَّتِي هِيَ حَاصِلَةٌ عِنْدَهُمْ بِأَصْلِ الْخِلْقَةِ۔ ؎۱ ـــ تیسرے یہ بات بھی سمجھ لینی ضرور ہے کہ متشابہات کی تاویل جس کی نسبت قرآن مجید میں کہا گیا ہے۔ "وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ" اس سے کیا مُراد ہے؟ ظاہر ہے کہ اس آیت کے یہ معنی قرار دینے تو بالکل غلط ہیں کہ متشابہات کی تاویل کا علم اجمالاً یا تفصیلاً کسی طرح پر بھی انسان کو نہیں دیا گیا ورنہ مسلمانوں کا یہ دعویٰ غلط ہو جائے گا کہ ہمارے دین میں عیسائیوں کے مسئلۂ تثلیث کی مانند کوئی ایسا رازِ سربستہ نہیں ہے جو انسان کی عقل اور سمجھ سے بالاتر ہو ـــ

امام نوویؒ شرحِ مسلم میں تاویلِ متشابہات کے متعلق لکھتے ہیں: ـــ
يَبْعُدُ أَنْ يُخَاطِبَ اللَّهُ عِبَادَهُ بِمَا لَا سَبِيلَ لِأَحَدٍ مِنَ الْخَلْقِ إِلَىٰ مَعْرِفَتِهِ وَقَدِ اتَّفَقَ أَصْحَابُنَا وَغَيْرُهُمْ مِنَ الْمُحَقِّقِينَ عَلَىٰ أَنَّهُ يَسْتَحِيلُ أَنْ يَتَكَلَّمَ اللَّهُ تَعَالَىٰ بِمَا لَا يُفِيدُ ـــ

"یعنی بعید از عقل ہے کہ اللہ جل شانہٗ اپنے بندوں سے ایسے کلام کے ساتھ خطاب کرے جس کے معنے سمجھنے کی کوئی سبیل مخلوق کے لئے نہ ہو ـــ" اور علمائے مذہب اور اُن کے سوا اور محققین اس بات پر متفق ہیں کہ خدا تعالیٰ کا ایسے کلام کے ساتھ متکلّم ہونا جو مفید معنی نہ ہو محال ہے" ـــ غرض کہ آیۃ مذکور کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان کو تاویل متشابہات کا علم مطلقاً نہیں دیا گیا بلکہ یہ معنی ہیں کہ خاص کر مبدأ و معاد کے متعلّق جو باتیں انسان کی سمجھ بوجھ سے باہر ہیں اور جن کا بیان آیاتِ متشابہات میں بطور مجاز و استعارہ کے واقع ہوا ہے اور جن پر ایمان لانے کو يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اُن کی حقیقت اور کنہ خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ اور اس لئے انسان جن الفاظ و عبارات سے اُن حقائق کو تعبیر کرے گا وہ تعبیر ناقص اور معنی مقصود سے قاصر ہوگی ـــ علامہ طیبیؒ نے شرحِ مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ "المتشابہ الذی یحذر منہ ھو صفات اللہ تعالیٰ التی لا کیفیۃ لھا والاوصاف القیمۃ التی لا سبیل الی ادراکھا بالقیاس والاستنباط ولا سبیل الی استحضارھا فی النفوس ـــ یعنی جن متشابہات کے اتباع سے بچنے کا حکم ہے وہ صفاتِ باری تعالیٰ یا قیامت کے حالات کا بیان ہے جو قیاس اور استنباط سے دریافت نہیں ہو سکتا اور نہ لوگوں کو اُس کا تصوّر دلانے کی کوئی سبیل ہے"۔

لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انسان یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ آیاتِ متشابہات میں وہ اسرار و حقائق بطور استعارہ یا تمثیل کے

؎۱۔ انبیاءؑ کی سیرت میں یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں سے ان کی عقل و فہم کے مطابق بات کرتے ہیں یعنی ان کی فطری استعداد کو ملحوظ کرتے ہوئے ان کو ہر بات سمجھاتے ہیں ـــ

بیان ہوئے ہیں اور الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال نہیں ہوئے مثلاً سورۃ کُوِّرَتْ میں ہولِ قیامت کا بیان ان لفظوں میں کیا گیا ہے۔ وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ یعنی جب کہ عنقریب بیاہنے والی اونٹنیاں چھٹی پھریں گی اور ان کی کوئی خبر نہ لے گا" بیشک ہولِ قیامت کی جس کیفیت کو اس تمثیل میں بیان کیا گیا ہے اس کے ادراک سے انسان کی عقل قاصر ہے اور اس کی قدرت سے باہر ہے کہ اس کیفیت کو کسی لفظ یا عبارت کے ذریعے سے پورا پورا ادا کر سکے لیکن یہ سمجھنا اس کی طاقت سے باہر نہیں ہے، بلکہ یہ بیان اس کیفیت کی تمثیل ہے کہ ایک اونٹ چرانے والی قوم جس کی دولت اونٹ اور اونٹنیوں کے سوا کچھ نہ تھی، اس کو ہولِ قیامت کا تصور دلانے کے لئے کوئی اسلوب اس سے زیادہ بلیغ نہیں ہو سکتا کیوں کہ عرب اپنی معروف عادات کے سبب اس بات کو ناممکن سمجھتے تھے کہ جب اونٹنی بیاہنے کے قریب ہو اس وقت مالک اس کی نگرانی سے غافل ہو جائے، پس انہوں نے اس وقت کو کیسا ہولناک تصور کیا ہوگا جب کہ ایسی اونٹنیوں کی خبر گیری کیلئے خبر گیری کا کچھ بھی ہوش باقی نہ رہے گا ——

لیکن یہاں یہ شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر تاویل متشابہات کا علم خدا تعالیٰ کے ساتھ مخصوص نہ تھا تو سلفِ صالح تاویل کرنے کو کیوں ناجائز سمجھتے تھے اور جو تاویل کا مرتکب ہوتا تھا اس سے کس لیے مواخذہ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے صبیغ کو اتباعِ متشابہات پر سزا دلوائی اور مدینہ منورہ سے جلاوطن کر کے بصرے کو بھجوا دیا۔ اور جب امام مالکؒ سے استوی علی العرش کا مطلب پوچھا گیا، تو انہوں نے اس کے سوا کوئی جواب نہیں دیا کہ "استواء" کے معنی معلوم ہیں اور اس کی کیفیت مجہول ہے ——

اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس سے سوال کرنا بدعت ہے"۔ سو اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ جس زمانے میں قرآن نازل ہوا اس وقت اہلِ کتاب تحریفِ کتب مقدسہ کے سبب سے نہایت بدنام تھے۔ وہ اکثر اپنے اغراضِ فاسدہ کے لیے کتب مقدسہ کے معنی لوگوں کو غلط بتاتے تھے اور اس طرح دین میں رخنہ ڈالتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جا بجا ان پر تحریف کا الزام لگایا گیا ہے اور بہت سی حدیثیں اس مضمون کی صحاح وغیرہ میں موجود ہیں بلکہ خود اہلِ کتاب نے تسلیم کیا ہے، کہ بلاشبہ قدیم یہودی اور عیسائی عالم بائیبل کی کتابوں میں تحریفِ معنوی کے مرتکب ہوتے تھے ظاہر ہے کہ تحریف سے زیادہ کوئی چیز دین کے حق میں خطرناک نہیں ہو سکتی۔ اور اہلِ کتاب اس کی مثال قائم کر چکے تھے اور چونکہ مسلمانوں کو بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی اجازت تھی اور دونوں اصلِ دین میں عموماً باہمد گر مشابہت رکھتے تھے اس لیے مسلمانوں کا سب سے زیادہ میل جول اہلِ کتاب کے ساتھ تھا لہذا ان میں تحریف کا فتنہ پھیلنے کا قوی احتمال تھا۔ چنانچہ منجملہ بہت سی بندشوں کے جو شارع نے اسلام میں انسدادِ تحریف کے لیے باندھیں ایک یہ تھی کہ آیاتِ متشابہات کے معنی میں چھان بین کرنے کی مذمت کی گئی اور قرآن میں صاف کہہ دیا گیا کہ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ اور آنحضرت نے عموماً قرآن کی تفسیر کی نسبت فرمایا کہ مَنْ فَسَّرَ الْقُرْاٰنَ بِرَاْیِهٖ فَلْیَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ —— اور جھوٹی روایت کرنے کی نسبت فرمایا مَنْ كَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ ——

اسی بنا پر سلفِ صالح متشابہات کی تاویل سے کوسوں دور بھاگتے تھے باوجود یہ کہ وہ تشبیہ کے عقیدے سے بالکل مبرا تھے اور جس بات میں تشبیہ کا ادنیٰ شائبہ پاتے تھے اس سے حذر کرتے تھے پھر بھی جو آیتیں تشبیہ پر دلالت کرتی تھیں ان کی تاویل سے ہمیشہ سکوت کرتے اور ان کے ظاہری معنوں سے ہرگز تجاوز نہ کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم آیاتِ متشابہات کے ظاہری معنوں پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کے اصلی معنوں کی جو خدا نے مراد رکھی ہے تصدیق کرتے ہیں اور ان کا علم خدا پر چھوڑتے ہیں کیونکہ ان کے سمجھنے کی ہم کو تکلیف نہیں دی گئی بعضے یہاں تک احتیاط کرتے تھے کہ مثلاً ید یا وجہ یا استوا کا ترجمہ تک دوسری

زبان میں نہیں کرتے تھے ۔ اگر کسی ایسی آیت کے ترجمے کی ضرورت ہوتی تھی تو انہیں الفاظ کو بعینہ ترجمے میں رکھ دیتے تھے حالانکہ عربی زبان جو نزولِ قرآن کے وقت حدِ کمال کو پہنچ چکی تھی ، استعارہ وکنایہ اور اقسام مجاز سے مالا مال تھی اور اسی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا باوجود اس کے علمائے سلف محض اس نیت سے کہ دین میں فتنہ پیدا نہ ہو اور اہلِ اسلام میں مثل اہل کتاب کے تحریف کا باب مفتوح نہ ہونے پائے ، تاویل متشابہات اور تفصیل بالرائے سے اجتناب کرتے تھے اور جہاں تک ممکن ہوتا تھا متشابہات قرآن کے الفاظ کو ان کے حقیقی معنوں پر مقرر رکھتے تھے اور بغیر سخت ضرورت کے ان کو مجازی معنوں پر محمول نہ کرتے تھے اور کسی آیت کے تفسیر کرنے پر جب تک کوئی روایت اس کی مؤیّد نہ ہو عموماً مبادرت نہ کرتے تھے ۔ حالانکہ تفسیر بالرائے سے ممانعت ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کسی آیت کے معنی جب تک کہ اس کی تفسیر کسی قول سے ثابت نہ ہو بیان کرنے جائز نہیں ہیں چنانچہ امام غزالی اور دیگر محققین نے تصریح کی ہے کہ اگر حدیث مذکور کے یہ معنی ہوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ابن عباس کے حق میں یہ دعا کرنا کہ اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِی الدِّینِ وَعَلِّمْهُ التَّاوِیْلَ نعوذ باللہ بے کار ٹھیرتا ہے باوجود اس کے کہ سلفِ صالحین جہاں تک ہو سکتا تھا بغیر روایت تفسیر قرآن میں دم نہ مارتے تھے تاکہ جس مصلحت سے شارع نے تفسیر بالرائے کی ممانعت فرمائی ہے وہ مصلحت فوت نہ ہو اور تحریف کا رستہ مسدود رہے ـــــــ

لیکن یہ مصلحت اسی وقت تک محدود رہ سکتی تھی جب تک کوئی اور اس سے بھی زیادہ ضروری اور مہتم بالشان مصلحت پیش نہ آتی چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جو آیتیں بظاہر تشبیہ پر دلالت کرتی تھیں جب ان کے اصلی معنی بیان کرنے سے علماء نے سکوت کیا اور ان کو محض حقیقی معنوں پر مقصود رکھا تو ایک طرف تو خود مسلمانوں میں حشویہ اور غلاۃ شیعہ عقیدہ تشبیہ میں غلو کرنے لگے اور دوسری طرف جوں جوں یونانی فلسفے کا رواج زیادہ ہوتا گیا اسی قدر آیاتِ متشابہات کے معنوں پر زیادہ چون چرا ہونے لگی اور مخالفین طرح طرح کے شبہات قرآن پر وارد کرنے لگے اب علمائے اسلام کو اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ سلفِ صالح نے جو محض از راہِ مصلحت زبانوں پر مہر لگا رکھی تھی اس کو توڑ دیا جائے اور جو الفاظ قرآن مجید میں درحقیقت مجاز واستعارہ کے طور پر اطلاق کئے گئے ہیں بقدر ضرورت ان کے اصلی معنی صاف صاف بیان کئے جائیں ۔ چنانچہ سب سے پہلے علمائے معتزلہ نے تاویل متشابہات کی راہ کھولی ـــــــ

آخر کو اسلام میں عموماً یہ قاعدہ مسلّم ٹھہر گیا کہ جب نقل اور عقل میں تعارض واقع ہو تو عقل کے ایسے معنی لینے چاہئیں جن سے وہ تعارض رفع ہو جائے ، یعنی جب نصِّ شرعی کے حقیقی معنی دلیلِ قاطع عقل کے خلاف ہوں تو اس کو اصولِ عربیت کے موافق مجازی معنوں پر محمول کرنا چاہیئے اور یہی معنی تاویل کے ہیں ـــــــ یہ اصول علمِ کلام کی عام کتابوں مثل مقاصد ، مواقف ، تفسیر کبیر ، دُرر غرر تہافۃ الفلاسفہ اور فصل المقال قاضی ابن رشد وغیرہ وغیرہ میں مفصل بیان کیا گیا ہے ۔ اور شیخ حسین آفندی طرابلسی نے جو ابھی ایک کتاب موسوم بہ حمیدیہ حکمائے زمانہ حال کے مقابلے میں لکھی ہے اس میں بھی اس اصول کو قاعدۂ مسلمۂ اہلِ اسلام قرار دیا ہے ، بلکہ شیخ موصوف نے اپنے ملک کے تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کو جو معجزاتِ حسیہ کو علومِ جدیدہ کے خلاف سمجھتے ہیں یہ ہدایت کی ہے ، کہ علیھم ان یقنعوا بما تقبله عقولھم وما لم تقبله ویرفضه البرھان العقلی القاطع یرجعون فیه الی التاویل الجامع بین النقل والعقل ۔ (حمیدیہ ، صفحہ ۳۸) یعنی ان کو چاہیئے کہ جس کو ان کی عقل قبول کرے اس پر قناعت کریں اور جس بات کو وہ قبول نہ کرے اور برھانِ عقلی اس کے منافی ہو تو تاویل کی طرف رجوع کریں جس سے عقل اور نقل میں تطبیق ہو جائے ۔ ـــــــ

اگرچہ ابو الحسن اشعری جو فرقہ اشاعرہ کے امام ہیں متشابہات کی تاویل کو جائز نہیں سمجھتے مگر ان کی یہ ممانعت صرف ان راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے لئے مخصوص معلوم ہوتی ہے جن کے دل [illegible]

کیا اشعری اور کیا اور اسلامی فرقے سب کو ناگزیر متشابہات کتاب وسنت کی تاویل کرنی پڑتی ہے امام غزالیؒ جو خود بھی اشعری المذہب ہیں رسالہ التفرق بین الاسلام والزندقہ میں لکھتے ہیں کہ "اسلام کا کوئی فرقہ ایسا نہیں جو تاویل کا محتاج نہ ہو اور سب سے زیادہ تاویل سے بچنے والے امام احمد بن حنبلؒ ہیں۔ باوجود اس کے وہ سب سے زیادہ بعید تاویلات کرنے پر مجبور ہوئے ہیں ــــــ

اس مقام پر ہم ایک آیت بطور مثال کے اس غرض سے لکھتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ آیات متشابہات کے معنی ابتدا میں کیا سمجھے جاتے تھے اور پھر رفتہ رفتہ علم و حکمت کی ترقی اور زمانے کی ضرورتوں سے ان کے کیا معنی قرار دیئے گئے ــــــ

آیۃ الکرسی میں جو جملہ "وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" آیا ہے اس کی تفسیر میں امام رازی نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ کرسی کو پہلے ایک جسم عظیم جو آسمان و زمین پر محیط ہی سمجھا جاتا تھا بعضے اسی کو عرش اور بعضے عرش و کرسی دونوں کو جدا جدا جسم سمجھتے تھے، بعضے کرسی کو خدا کے قدم رکھنے کی جگہ کہتے تھے یہاں تک کہ مسلمانوں میں علوم حکمیہ نے رواج پایا اور علما کو زمانے کی ضرورتوں نے مجبور کیا کہ مہر سکوت کو توڑ دیا جائے اور عرش و کرسی وغیرہ الفاظ سے جو معنی اصل مقصود ہیں وہ صاف صاف بیان کیے جائیں۔ چنانچہ امام رازی نے علمائے شافعیہ میں سے قفّال کا یہ قول آیۃ مذکور کی تفسیر کے متعلق نقل کیا ہے کہ "خدا تعالیٰ نے اپنی ذات وصفات کے بیان میں لوگوں سے ایسے الفاظ کے ساتھ خطاب کیا ہے جن کو وہ امراء وسلاطین کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اس نے کعبہ کو اپنا گھر بتایا ہے اور اس کی زیارت کا حکم دیا جس طرح وہ بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں

۔ اسی طرح قیامت کے حساب کتاب کے موقع پر ملائکہ اور انبیاء اور شہداء کا حاضر ہونا بیان فرمایا اور اسی طرح اپنے لیے عرش یعنی تخت قرار دیا اور فرمایا کہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی پھر اپنے تخت کی نسبت یہ کہا کہ وَکَانَ عَرْشُہٗ عَلَی الْمَآءِ اور پھر فرمایا وَتَرَی الْمَلٰٓئِکَۃَ حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّھِمْ اور فرمایا وَیَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّکَ فَوْقَھُمْ یَوْمَئِذٍ ثَمٰنِیَۃٌ اور کہا اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَہٗ اور اپنے لیے کرسی قرار دی اور فرمایا وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اس کے بعد امام رازی کہتے ہیں اذا عرفت ھذا فنقول کل ما جاء من الالفاظ الموھمۃ التشبیہ فی العرش والکرسی فقد ورد مثلہا بل اقوی منہا فی الکعبۃ والطواف ولما توافقنا ھھنا علی ان المقصود تعریف عظمۃ اللہ وکبریائہ مع القطع بانہ منزہ عن ان یکون فی الکعبۃ فکذا الکلام فی العرش والکرسی یعنی جب تم قفال کا قول سن چکے تو اب میں کہتا ہوں کہ جتنے الفاظ موہم تشبیہ عرش و کرسی کے متعلق واقع ہوئے ہیں ویسے ہی بلکہ ان سے زیادہ موہم تشبیہ کعبہ اور طواف کے متعلق آئے ہیں۔ پس جب ہم نے یہاں اتفاق کر لیا کہ الفاظ سے محض خدا کی عظمت و کبریائی کا تصوّر دلانا ہے اور خدا کی نسبت یقین ہے کہ وہ کعبے میں ہونے سے پاک ہے، تو ہم کو ایسا ہی عرش و کرسی کی نسبت سمجھنا چاہیئے ــــــ

لیکن چونکہ اُس زمانے کی علمی تحقیقات نہایت محدود تھی اس لئے بہت سے شبہات جو اِس زمانے میں قرآن کی نسبت پیدا ہو سکتے ہیں، اُس زمانے میں اُن کا خطرہ بھی کسی کے دِل میں نہیں گزرتا تھا اور اسی وجہ سے بہت سی آیاتِ متشابہات جو درحقیقت تاویل طلب تھیں اُن کی تاویل کرنے کی ضرورت علمائے سلف کو محسوس نہیں ہوئی، مثلاً جب تک یونانی فلسفہ اسلام میں نہیں پھیلا اور الفاظ قرآنی میں شک اور وسوسے نے راہ نہیں پائی لوگ اُن آیتوں کے الفاظ کو جن سے زمین کا مثل فرش کے بچھا ہُوا ہونا مفہوم ہوتا ہے ان کے حقیقی معنوں پر محمول کرتے تھے ــــــ

اور اب تک بھی ان ملکوں کے بعض علماؔ[1] جہاں کسی زمانے میں یونانی فلسفے کا رواج نہیں ہوا زمین کو مثل فرش کے بچھا ہوا سمجھتے ہیں ــــــ جب علم و حکمت کا مسلمانوں میں رواج ہوا اور دلائل قاطعہ سے زمین کی کرویت ثابت ہوگئی تو علمائے متکلمین کو تصریح کرنی پڑی کہ قرآن میں جو زمین کی نسبت الفاظ فرشنٰھا اور دحاھا اور طحٰھا اطلاق کئے گئے ہیں وہ اپنے حقیقی معنوں پر محمول نہیں ہیں لیکن چونکہ اس وقت زمین کی حرکت کا مسئلہ سائنس کے درجے تک نہیں پہنچا تھا اس لئے قرآن کے بعض الفاظ جو بظاہر زمین کے ساکن ہونے پر دلالت کرتے ہیں اُن کی کچھ تاویل نہیں کی گئی، یا مثلاً جن آیتوں سے مینہ کا آسمان سے برسنا سمجھا جاتا ہے جب تک قرآن کے الفاظ میں کسی نے چوں وچرا نہیں کی، لوگ اُن آیتوں کو اُن کے حقیقی معنوں پر محمول کرتے تھے، مگر جب دلائل سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ مینہ دراصل آسمان سے نہیں برستا تو لفظ سَمَآء جو قرآن میں وارد ہوا ہے اُس سے مجازی معنی یعنی جانبِ فوق مُراد لی گئی ہے چونکہ اس وقت یہ تحقیق نہیں ہوا تھا کہ آسمان درحقیقت کوئی جسم محیطِ عالم مثل گول گنبد کے جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے نہیں ہے بلکہ تمام ثوابت اور سیارے فضائے بسیط میں بکھرے ہوئے اور ایک عجیب کرشمۂ قدرت جس کا نام جاذبیۃ یعنی کشش ہے اپنی اپنی جگہ قائم ہیں اس لیے جو الفاظ کہ آسمان کے موجود یا مجسم ہونے پر بظاہر دلالت کرتے تھے ان کی کچھ تاویل نہیں کی گئی ــــــ

اسی سبب سے قرآن مجید کی بہت سی آیتیں اور بہت سے الفاظ ایسے باقی رہ گئے جن میں درحقیقت تاویل کی ضرورت تھی مگر چونکہ وہ ضرورت کسی کو محسوس نہیں ہوئی اس لیے ان کی تاویل کرنے کا کسی کو خیال نہیں آیا۔

اور معتزلہ جنہوں نے ملاحدہ اور دیگر مخالفینِ سلام کے مقابلے میں سب سے پہلے تاویلِ متشابہات کی ضرورت کو محسوس کیا تھا اور ان کو عندالضرورت واجب سمجھتے تھے جوں جوں اشاعرہ کے مذہب کو ترقی ہوتی گئی اسی قدر وہ اُن کا مذہب اور ان کے اصول اور اُن کی تصنیفات ناپید ہوتی گئیں۔ اکثر بادشاہوں نے جبراً اشعری مذہب کو رواج دیا اور معتزلہ کے اصول کا استیصال کیا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ دنیا سے معدوم ہوگئے یہی وجہ ہے کہ آج تمام اسلامی دنیا میں زیادہ تر اشاعرہ کی تفسیریں پائی جاتی ہیں جن میں بغیر سخت ضرورت کے متشابہات کی تاویل میں کسی نے دم نہیں مارا اور جس قدر تاویلات ان تفسیروں میں منقول ہیں ان کا ماخذ زیادہ تر وہی معتزلہ کی تفاسیر ہیں جو ایک آدھ کے سوا اب بالکل مفقود ہیں، صرف ان کے اقوال جستہ اشاعرہ کی تفسیروں میں پائے جاتے تھے ہیں، چنانچہ قفّال جن کا قول کرسی کی تفسیر میں امام رازی نے نقل کیا ہے وہ بھی محققین میں شمار کئے گئے ہیں ــــــ

اگرچہ امام ابوالحسن اشعری سے جیسا کہ علامہ شہرستانی نے ملل ونحل میں لکھا ہے ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ عندالضرورت تاویل کرنی جائز ہے اور اسی بناء پر اشاعرہ بھی مثل دیگر فرقوں کے جہاں نقل وعقل میں تعارض واقع ہو تاویل کو جائز سمجھتے ہیں لیکن جہاں تک دیکھا جاتا ہے وہ متشابہات کی تاویل پر حتی المقدور جرأت نہیں کرتے ــــــ شاہ ولی اللہ صاحبؒ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:۔

من اصول الدین ترک الخوض بالعقل فی المتشابہات من الکتاب السنۃ۔ اس کے بعد فرماتے ہیں۔

---

[1] شیخ حسین آفندی نے رسالہ حمیدیہ میں اپنے زمانے کے ایک قشری عالم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ دینِ اسلام میں امریکہ کے وجود پر اعتقاد رکھنا جائز نہیں کیونکہ اس سے زمین کی کرویت کا اعتقاد کرنا لازم آتا ہے جو اسلامی عقیدے کے خلاف ہے۔" شیخ اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ "اس نادان نے اپنی جہالت سے مسلمانوں کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ ایک محسوس چیز کا انکار کر دیں اور اپنے دین کو لوگوں کی نظر میں مضحکہ بنائیں۔

ومن ذلك المتشابهات) امور كثيرة لايدرىء اهى يه حقيقة الكلام و اقرب مجاز اليها و ذلك فيما لو يجمع عليه الامته لو ترتفع فيه الشبهة۔ یعنی قرآن اور حدیث میں از قبیل متشابہات بہت سے بیانات ہیں جن کی نسبت نہیں معلوم کہ اُن کے حقیقی معنی مقصود ہیں۔ ایسے مجازی معنی جو حقیقت سے قریب تر ہوں۔ اور یہ تردد اُن بیانات میں ہے جن کی نسبت اجماعِ اُمّت سے فیصلہ نہیں ہُوا، اور اشتباہ رفع نہیں ہُوا۔"

شاہ صاحبؒ کے اس قول سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک قرآن مجید میں بہت سے مقامات ایسے باقی ہیں جن میں حقیقی اور مجازی دونوں معنوں کا احتمال ہے اور باوجودیکہ صدہا تفسیریں نہایت مبسوط لکھی جا چکی ہیں مگر آج تک کسی مفسر نے اس بات کا فیصلہ نہیں کیا کہ اُن مقامات پر جو الفاظ حقیقی اور مجازی دونوں کو متحمل ہیں اُن سے درحقیقت حقیقی معنی مقصود ہیں یا مجازی ۔۔۔

قطع نظر اس محققانہ کلام کے جو شاہ صاحبؒ نے متشابہات کے باب میں لکھا ہے۔ تفسیر کبیر اور حجۃ اللہ البالغہ کے دیگر حوالوں سے جو ہم پہلے دے چکے ہیں صاف پایا جاتا ہے کہ خدا کا کلام جو کافۂ انام کی ہدایت کے لئے نازل ہوتا ہے اس کا طرزِ بیان ایسا ہونا چاہیئے کہ ہر طبقے اور ہر درجے اور ہر زمانے کے لوگ اپنی اپنی سمجھ اور اپنی اپنی معلومات کے موافق اُس سے ہدایت پاسکیں جب انسان کی معلومات نہایت محدود اور اُس کی سمجھ محض ابتدائی حالت میں ہو اُس وقت بھی اُس کی تعلیم سے وہی نتیجہ حاصل ہو جو علم انسانی کے منتہائے ترقی پر پہنچنے کے وقت حاصل ہو۔ ورنہ اُس کی نسبت یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ کافۂ انام کی ہدایت کے لئے نازل ہُوا ہے اور اُس تقدیر پر امکان سے خارج ہے کہ جب تک انسان میں علمی ترقی کرنے کی قابلیت باقی ہے کلامِ الٰہی نئی تفسیروں سے بالکل مستغنی ہو جائے کیونکہ جس قدر انسان پر حقائق موجودات زیادہ منکشف ہوتے جائیں گے اُسی قدر کلامِ الٰہی کے معنوں سے زیادہ پردے مرتفع ہوں گے ۔۔۔

علامہ ابن الحاج اپنی مشہور کتاب "مدخل" میں لکھتے ہیں: قال علیه الصلوٰة والسلام فی القرآن "لا تنقضی عجائبه ولا یخلق علی کثرة الرد فعجائب القرآن لا تنقضی الی یوم القیٰمة فکل قرنٍ لا بدّ له ان یاخذ منه فوائد جمّة خصّه الله تعالیٰ بها وضعها الیه برکة هذه الامة مستمرة الی یوم الساعة ۔۔۔

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے باب میں فرمایا ہے کہ "اس کے عجائب یعنی دقائق و اسرار جو اس میں مضمر ہیں ختم نہ ہوں گے اور وہ باوجود بار بار دُہرانے کے پُرانا نہ ہوگا۔" پس قرآن کے عجائب قیامت تک ختم ہونے والے نہیں ہیں۔ اور اس لئے ہر زمانے کے لوگوں کو چاہیئے کہ اُس سے فوائدِ کثیرہ جو اُن کے حصّے میں آئے ہیں حاصل کریں تاکہ اس اُمّت کی برکت روزِ قیامت تک جاری رہے ۔۔۔" اس کے بعد علامہ موصوف لکھتے ہیں؛ قال علیه الصلوٰة والسلام مثل امتی کمثل المطر لا یدری اوله خیر ام آخره، یعنی فی البرکة والخیر والدعوة الی الله تعالیٰ وتبیین الاحکام۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت کی شان بارش کی سی ہے جس کا نہیں معلوم اوّل بہتر ہے یا آخر"۔ یعنی برکت اور خیر میں لوگوں کو خدا کی طرف بُلانے میں اور احکامِ الٰہی کے بیان کرنے میں ۔۔۔

دونوں مذکورۂ بالا حدیثوں سے جو علامہ ابن الحاج نے نقل کی ہیں صاف ظاہر ہے کہ قرآن کے عجائب اور دقائق ہمیشہ وقتاً فوقتاً انسان پر ظاہر ہوتے رہیں گے اور جس طرح اُمّت کے اوّل قرنوں میں قرآن کے بہت سے دقائق و اسرارِ حقیقت پر ظاہر ہوئے ہیں اسی طرح اس کے اخیر قرنوں میں بہت سے دقائق و اسرار دنیا پر منکشف ہوں گے ۔۔۔ حجۃ الاسلام امام غزالیؒ اس باب میں لکھتے ہیں کہ من معانٍ دقیقة من اسرار القرآن یخطر علی قلب المتجردین للذکر والفکر یخلو عنها الخ... یعنی قرآن کے ایسے بہت سے دقائق و اسرار جن سے تفسیر کی کتابیں خالی ہوتی ہیں اور بڑے بڑے مفسرین کو انکی خبر نہیں ہوتی ان لوگوں کے دلوں پر کھلتے ہیں جو ہمہ تن قرآن کے ذکر اور فکر میں محو ہو جاتے ہیں۔ (جواہر القرآن)

(از مقالات حالی)

مُحکم اور مُتشابہ اور آیاتِ صفات

(مُتشابہ آیات کی علمی تشریح)

پروفیسر لطفی اپنے علمی مقالے میں لکھتے ہیں :—

علم الاصول میں محکم اور متشابہ کا لفظ زیادہ تر اسی خاص اصطلاح کے لیے مستعمل ہے، دوسری اصطلاح جس کو عام کہا گیا ہے یہ ہے کہ محکم ہر وہ آیت ہے جو اپنے مدلول میں اتنی واضح اور صریح ہو جس کے لئے کسی تفسیر اور تاویل کی ضرورت نہ پیش آئے اور جس کے مفہوم اور مدلول کے سمجھنے میں عربی زبان کے ماہر کو کسی طرح کا تردد اور تذبذب نہ ہو —

اس موقع پر حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں، کہ آیت کے مفہوم اور مدلول سمجھنے کا معیار صرف عربی زبان دانی اور مہارت تامہ ہے نہ کہ نکتہ سنجی اور قیاس آرائی کیونکہ بعض حضرات اپنی بے محل موشگافیوں اور بے ضرورت قیاس آرائیوں کی وجہ سے محکم کو متشابہ اور آسان کو مشکل اور صاف اور واضح بات کو مبہم بنا دیتے ہیں جس سے قریب الفہم مطلب بعید از فہم معلوم ہونے لگتے ہیں —

متشابہ ہر وہ آیت ہے جو اپنے مدلول اور معنی کے لئے محتاجِ بیان ہو، کیونکہ اس میں بیک وقت ایک سے زائد معنی سمجھے جا سکتے ہیں اور ظاہر میں ایسا کوئی قرینہ نہیں ہوتا جس سے کسی ایک معنی کے حق میں قطعی فیصلہ کیا جا سکتا ہو —

متشابہ میں اس قسم کے احتمالات مختلف اسباب کی بناء پر پیدا ہو سکتے ہیں جیسا کہ شاہ ولی اللہؒ کی کتاب "الفوز الکبیر" احتمالات اور ان کے اسباب کو بطور نمونہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے —

(۱) یہ اشتباہ اس وقت بھی ہوتا ہے جب کلام میں کوئی ایسا لفظ استعمال کیا گیا ہو جس کے ایک سے زائد معنی پائے جائیں اور تمام معانی کی حیثیت مساوی ہو جیسے قرآن کی آیت " او لامستم النساء " میں لفظ لامستم کے معنی چھونے کے بھی ہیں جیسے کہ اس کے معنے ہمبستری کے بھی ہیں ایسی صورت میں جب تک کوئی ایسا قرینہ یا توجیہ نہ کی جائے گی جس سے ایک معنی کو متعین کیا جائے اس وقت تک اس آیت کا واضح مفہوم سمجھ میں نہیں آ سکتا —

(۲) کبھی اشتباہ اس وجہ سے بھی ہوتا ہے کہ جملہ میں کوئی ایسا لفظ استعمال کیا گیا ہو جس کا عطف مختلف کلمات پر ہو سکتا ہو اس وقت کسی ایسے قرینہ کی ضرورت ہو گی جس سے معلوم ہو سکے کہ دونوں کلمات میں سے کس کلمہ پر عطف مُراد ہے۔ جیسے قرآن کی آیت وامسحوا برؤسکم وارجلکم میں لفظ ارجل کا عطف رؤس پر بھی کیا جا سکتا ہے اور اس صورت میں ارجل مجرور ہو گا، اور اس کا تعلق امسحوا فعل سے ہو گا اور پاؤں کا مسح کرنا فرض ہو گا، شیعہ کے نزدیک یہ صحیح ہے —

اس کے برخلاف ارجل کا عطف ایدیکم اور وجوہکم پر بھی ہو سکتا ہے۔ اور اس وقت یہ منصوب ہو کر اغسلوا فعل کا مفعول ہو گا اور پاؤں کا دھونا فرض قرار پائے گا، چنانچہ علمائے اُمّت نے یہاں متعدد قرائن سے واضح کیا ہے کہ آیت میں یہی آخری شق مُراد ہے۔ اور شیعہ کا استدلال کمزور ہے —

(۳) جملہ میں کسی جگہ ضمیر کا استعمال اس طرح ہو کہ اس سے قبل دو اسم ذکر کیے گئے ہوں اور دونوں اسم اس ضمیر کا مرجع بن سکتے ہوں تاوقتیکہ اس کی وضاحت نہ کی جائے کہ یہ ضمیر کس اسم سے متعلق ہے۔ جملہ کا مفہوم اور آیت کا مدلول واضح نہیں ہو سکتا۔ جیسے: إن الامیر امرنی ان العن فلانًا لعنه الله (مجھے امیر نے حکم دیا کہ میں فلاں آدمی پر لعنت کروں، اللہ اس پر لعنت کرے۔) لعنہ میں کا ضمیر کا مرجع امیر بھی ہو سکتا ہے اور فلاں بھی تاوقتیکہ اس کی وضاحت کسی قرینہ سے نہ ہو کہ کہنے والے کی مراد اس ضمیر سے کون ہے امیر یا فلاں؟ اشتباہ اور احتمال قائم رہے گا ——

(۴) اشتباہ اس وجہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ آیت میں کوئی فقرہ استعمال کیا گیا ہو جس میں اس فقرہ اور حصہ کی مستقل حیثیت بھی قرار دی جا سکتی ہے کہ اس کو جملہ متانفہ کہا اور اس امر کا بھی احتمال ہے کہ اس کا عطف اپنے ماقبل پر کیا جائے۔ دونوں صورتوں میں آیت کے معنی مختلف ہوں گے۔ مثلاً قرآن کی آیت " لا یعلم تاویله الا الله والراسخون فی العلم " میں یہ بھی احتمال ہے کہ " والرسخون فی العلم " کا عطف " اللہ " پر ہو۔ جو ماقبل میں مذکور ہے، اس صورت میں آیت کے معنے ہوں گے کہ اس کی تاویل اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور وہ لوگ جانتے ہیں جو علم میں مہارت رکھتے ہیں اور یہ بھی احتمال ہے کہ " والراسخون فی العلم " جملہ متانفہ ہو، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے تو پھر یہ ایک علیحدہ مستقل کلام قرار پائے گا اور آیت کا مفہوم ہو گا کہ " اس کی تاویل بجز خدا کے دوسرا کوئی نہیں جانتا، اور راسخون فی العلم کہتے ہیں کہ ہمارا اس پر ایمان ہے جو بھی خدا کے نزدیک اس کا مفہوم ہے۔ محققین کے نزدیک پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

غرض کہ اصطلاح عام کی رو سے متشابہ اس آیت کو کہا جائے گا جو ان احتمالات کی وجہ سے تشریح اور توضیح کی محتاج ہو اور جب تک اس کی تشریح نہ کی جائے اس کا مفہوم واضح نہ ہو —— مفسرین کے نزدیک محکم اور متشابہ کے الفاظ سے یہی دوسری اصطلاح مراد ہوتی ہے " جسے عام " کہا گیا ہے اس عام اصطلاح کی بناء پر مجمل، عام اور مطلق تمام آیتیں متشابہ قرار پاتی ہیں کیونکہ عام میں تخصیص کی گنجائش ہے، مطلق میں تقیید کی اور مجمل میں تفصیل کی ——

اشتباہ کی مندرجہ بالا صورتوں میں سے بیشتر صورتیں ایسی ہیں جن میں بیان کے ذریعہ آیت کے تشابہ کو رفع کر دیا گیا ہے۔ مثلاً مطلق میں جو اشتباہ ہوتا ہے، تقیید کے آنے کے بعد وہ تشابہ زائل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مجمل کے تشابہ کو بیان اور تشریح سے رفع کر دیا جاتا ہے اور اس قسم کے تشابہ کا کسی کلام میں پایا جانا اس کلام کی افادیت اور معنویت پر کسی اعتبار سے بھی اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ بلاغت کے اعتبار سے کلام کے بلیغ ہونے کا ثبوت ہے —— قرآن حکیم میں جو متشابہ آیات ہیں، یا جن آیات کو متشابہ قرار دیا جاتا ہے ان کی دو قسمیں ہیں

(۱) ایک قسم ان آیات کی ہے جن کا تعلق احکامی آیتوں سے ہے۔ اس قسم کی تمام متشابہ آیتوں کی وضاحت کر دی گئی ہے یعنی ان کے تشابہ کو تعیین مراد کے ذریعہ رفع کر دیا گیا ہے۔ محققین علماء ایسی ہی آیات میں غور و فکر کرتے ہیں اور ان آیتوں کے تشابہ کے رفع کرنے کے لئے دلائل اور قرائن کی جستجو کرتے ہیں، یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی اس جستجو میں علماء کے درمیان نظریات میں اختلاف ہوتا ہے اور کبھی تمام علماء نتائج و نظریات پر باہم متفق بھی ہو جاتے ہیں ——

تعیین مراد کی اس جستجو اور طلب کو اصطلاح میں " رد المتشابہ الی المحکم " سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اسی کو علامہ راغب اصفہانی نے " من وجہ محکم، من وجہ متشابہ " سے تعبیر کیا ہے (۲) دوسری قسم ان متشابہ آیات کی ہے جن کا تعلق احکامی آیات اور قوانین شرع سے نہیں ہے، بلکہ صفات باری تعالیٰ سے ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات ہیں۔ " الرحمٰن علی العرش استوی "، " اینما تولوا فثم وجه الله "، " کل شیء هالك الا وجهه " یداللّٰہ فوق ایدیهم " " والسموات مطویات بیمینه "، " ویبقی وجه ربك ذوالجلال والاکرام "، " یوم یکشف عن ساق " وغیرہ ——

مذکورہ بالا آیتیں اور اس قسم کی دوسری آیتیں جو بظاہر اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ کے خلاف معلوم ہوتی ہیں اور جن میں اللہ تعالیٰ کے لئے وہ چیزیں ثابت کی گئی ہیں جو مخلوقات کے لئے ثابت ہیں، جن سے خدا کا مجسم اور ممکنات سے ہونے کا شُبہ ہوتا ہے۔ ان تمام آیتوں کو علامہ راغبؒ نے "مطلقاً متشابہ" آیات میں شمار کیا ہے ——

ان آیتوں میں بندوں سے کسی قسم کے عمل کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے، اس لئے بعض صحابہؓ اور تابعینؒ ایسی آیتوں میں توقف کرتے ہیں اور ایسی آیات کے معانی اور مُراد کو ظاہر کرنے کے بجائے ان کے مفہوم اور معانی کو اللہ کے حوالے کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم ان آیتوں پر کیفیّت اور حقیقت کے جانے کے بغیر ایمان لاتے ہیں جیسا کہ امام مالکؒ سے آیت (الرَّحمٰن علی العرش استوی) میں اَستواء کی کیفیّت کے متعلّق پوچھا گیا تو جواب میں آپ نے فرمایا کہ "استواء" معلوم ہے اور اس کی کیفیّت مجہول ہے۔ اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس میں غور وخوض کرنا ممنوع ہے" ——

لیکن جب یونانی فلسفہ کے اثر سے ذہنوں میں انتشار پیدا ہونے لگا اور صحابہؓ اور تابعینؒ کا یہ سادہ طریقہ متاثرہ ذہنوں کو مطمئن نہ کر سکا اور قرآن حکیم کی اس قسم کی آیتیں کجرو دماغوں کے لئے مزید تشویش کا باعث بن گئیں جن آیات کے استعمال سے بظاہر اللہ تعالیٰ کے لئے جسمیت جہت اور مکانیت ثابت ہونے کا شُبہ پیدا ہوتا ہے اور جن کی وجہ سے مشبہہ اور مجسّمہ دو گروہ پیدا ہو گئے، تو علمائے متاخرین نے تفحص و تلاش کے بعد محاورات کلام اور استعمالات عرب کے مطابق ایسی آیات کی اس طرح توجیہیں کیں جن سے ان شکوک و شبہات کا ازالہ ہو جائے، چنانچہ امام اشعریؒ، امام غزالیؒ اور دوسرے متکلمین نے ان آیات پر اور ان کی تاویلات و توجیہات پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں، ان کی بحثوں کی تلخیص دو طرح پر کی جا سکتی ہے ——

پہلا طریقہ "استعارہ" ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے الفاظ یدؔ وجہؔ کشفؔ ساقؔ اور استویٰ اپنے حقیقی اور وضعی مفہوم کے اعتبار سے استعمال نہیں کئے گئے ہیں بلکہ ان الفاظ سے ان کے مجازی معنی مُراد ہیں۔ نہ کہ وضعی حقیقی معنی ——

لفظ یدؔ قدرت کے معنے کے لئے، لفظ وجہؔ ذات کے مفہوم کے لئے، اَستواء غلبہ اور اقتدار کے مفہوم کے لئے اور کشفؔ ساق شدت کے لئے استعارۃً استعمال کئے گئے ہیں۔ امام رازیؒ کے نزدیک دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس قسم کے تمام الفاظ کا استعمال خُدا کی نسبت، غایات کے اعتبار سے ہے نہ کہ مبادی کے اعتبار سے۔ ہر لفظ کا ایک مبداء ہوتا ہے اور اس کی ایک غایت ہوتی ہے۔ جیسے لفظ یدؔ کا مبداء ایک جسمانی عضو ہے جو گوشت و پوست سے بنا ہے۔ اس کی غایت قبضہ و قدرت ہے۔ خدا کی نسبت لفظ یدؔ کا اطلاق غایت کے اعتبار سے ہے۔ مبداء کے اعتبار سے نہیں۔ اسی طرح وجہؔ وغیرہ الفاظ میں خدا کی طرف ان کی نسبت سے مُراد ان کی غایات ہوں گی نہ کہ ان کے مبدا مُراد ہوں گے۔ اور یہ قاعدہ کچھ ان ہی الفاظ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ جتنے الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کے حق میں بولے جاتے ہیں سب میں یہی اصول جاری ہوگا۔ جیسے اَستحیا، سمعؔ بصرؔ، علمؔ وغیرہ الفاظ ہیں۔ علم کا مبداء ذہنی صورت ہے اور اس کی غایت انکشاف ہے۔ اللہ کے لئے جب اس لفظ کو بولا جائے گا تو اس سے علم کی غایت یعنی انکشاف مُراد ہوگا ——

جہاں تک متشابہات کی متذکرہ بالا قسم اوّل کا تعلق ہے یعنی ایسی متشابہ آیات جن کا تعلّق احکام اور قوانین شرع سے ہے اور جن کو علّامہ راغبؒ نے "من وجہ محکم من وجہ متشابہ" لکھا ہے۔ ان کے مفہوم و مُراد کی بابت غور و فکر کرنا اور ان کی تاویل تعیین مُراد کے لئے فکر و نظر کے باب میں سلف سے خلف تک سب کا اتفاق ہے۔ ان میں غور و فکر کرنا جائز ہی نہیں بلکہ ضروری[1] ہے، کیونکہ ان

[1] البتہ اس غور و فکر کے لئے اہلیت شرط ہے، کیونکہ کسی بھی فن میں نااہل کی رائے مردود ہوتی ہے۔

ان آیات میں بندوں سے عمل کا مطالبہ کیا گیا ہے جو بغیر واضح علم ناممکن ہے اس لئے ان آیات کے واضح معانی اور متعیّن مفہوم کا علم حاصل کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور درحقیقت تفسیر و تاویل کا اصل میدان ہی یہ ہے اور اس قسم کی آیات متشابہات کی تنزیل میں بہت سی حکمتیں مخفی ہیں جن میں سے چند حکمتیں درج کی جاتی ہیں :——

(۱) ایک حکمت یہ ہے کہ علماء محققین کے لئے غور و فکر کی دعوت کا موجب ہے، جس سے قرآن حکیم کے بہت سے مخفی اسرار کا پتہ چلتا ہے —(۲) ایک حکمت یہ ہے کہ اس قسم کی آیات سے انسانوں کی فہم اور ان کے علمی مرتبوں کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔ ورنہ اگر تمام قرآنِ حکیم صرف محکم آیات سے بھرا ہوا ہوتا جن میں غور و فکر اور بیان و تشریح کی ضرورت پیش نہ آتی تو اس کے سمجھنے میں تمام لوگوں کا درجہ مساوی ہوتا اور اہل علم کے علم و فہم اور ان کے ادراک کے درجات کا پتہ نہ چلتا — (۳) ایک حکمت یہ ہے کہ متشابہات کا بیان کرنا معانی اور مُراد کی گہرائی تک پہنچنے کے لئے مزید مشقّت اور دقتِ نظر کا باعث ہوتا ہے۔ اور جتنی مشقّت اور محنت و کاوش زیادہ ہوگی اتنا ہی ثواب بھی زیادہ ملے گا — (۴) ایک حکمت یہ ہے کہ قرآن میں متشابہ آیتوں کی وجہ سے ان کی تاویل کے طریقوں کا علم، ایک آیت کو دوسری آیت پر ترجیح دینے کا اصول معلوم کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور یہ علم زبان دانی قواعد صرف و نحو، علم بیان، علم اصول تفسیر و فقہ وغیرہ علوم حاصل کرنے پر موقوف ہے۔ اگر متشابہ آیات نہ ہوتیں تو مذکورہ بالا علوم کے حاصل کرنے کی طرف ہماری توجّہ نہ ہوتی۔ یہ آیات متشابہات ہی کی برکت ہے کہ لوگ ان علوم کو سیکھتے ہیں اور فوائد کثیرہ حاصل کرتے ہیں ——

متشابہات کی دوسری قسم یعنی قرآن کی وہ آیات جن کا تعلّق احکام و قوانین سے نہیں اور جو بندوں سے کسی عمل کا مطالبہ نہیں کرتیں مثلاً وہ آیات جن میں صفاتِ الٰہی کا ذکر ہے اور جو بظاہر اللہ سبحانہ، کی تنزیہہ شان کے خلاف معلوم ہوتی ہیں اور ان کے علاوہ قرآنی سورتوں کے بیشتر ابتدائی کلمات جن کو فواتح سور اور حروفِ مقطعات کہا جاتا ہے اور علّامہ راغب اصفہانیؒ کے الفاظ میں "مطلقاً متشابہ" میں شامل ہیں، اس قسم کے بارے میں علماء کے درمیان یہ اختلاف رائے ہے کہ آیا قرآن کی ایسی متشابہ آیات کے معنی و مدلول پر آگہی ممکن ہے اور کیا ان کے معنی و مُراد کی تفسیر و تاویل کے لئے جدّ و جہد اور غور و فکر کرنے کا دروازہ کھلا ہوا ہے، یا ان کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں اور ان کی تفسیر و تاویل کے لئے سعی و جستجو کرنے کا دروازہ بندوں کے لئے بند ہے ——

یہ اختلاف دراصل نتیجہ ہے قرآن حکیم کی مندرجہ آیات " والراسخون فی العلم" کے سمجھنے کے بارے میں اختلاف کا..... کیونکہ اس سلسلہ میں علماء کے دو مسلک ہیں :——

(الف) " والراسخون فی العلم" میں واؤ عاطفہ ہے اور یہ جملہ معطوف ہے اور اس کا عطف اپنے ماقبل لفظ پر اللہ ہے گویا اللہ کا لفظ معطوف علیہ ہے، اس صورت میں " الراسخون فی العلم" اپنے ماقبل لا یعلم فعل کا فاعل ہوگا اور معنی ہوں گے کہ "متشابہ کے مفہوم اور تاویل کو اللہ تعالیٰ اور ماہرینِ علم کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ——

(ب) آیت " والراسخون فی العلم" میں واؤ عاطفہ نہیں، استینافیہ ہے۔ اور یہ پورا کلمہ مبتدا ہے اور اس کے بعد میں جو یقولون مذکور ہے، وہ اس کی خبر ہے۔ اس صورت میں معنی یہ بنیں گے کہ متشابہ کے مفہوم اور مُراد کو بس اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اور ماہرینِ علم اس قسم کی آیات پر ایمان رکھتے ہیں کہ جو بھی ان کی مُراد اور مفہوم عند اللہ ہو وہ حق اور درست ہے ——

پہلے خیال والے علماء، کا جن میں مشہور مفسّر مجاہدؒ اور امام نوویؒ بھی شامل ہیں، ان کا قول یہ ہے کہ متشابہ کی دوسری قسم کے مفہوم و مُراد پر آگاہ ہونا ممکن ہے اور ان آیات کی تفسیر و تاویل کے لئے سعی و جستجو کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور اس کے لئے راسخینِ علم کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ اس کے معانی میں غور و فکر کریں، کیونکہ یہ بات قیاس اور فہم سے بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ایسے الفاظ و کلام سے

سے خطاب کرے، جن کو بندوں میں سے کوئی جان ہی نہ سکے. محققین کے نزدیک راجح قول یہی ہے ——

دوسرے خیال والے علماء جن میں بعض صحابہؓ اور تابعینؒ شامل ہیں، ان کی رائے یہ ہے کہ متشابہات کی مذکورہ دوسری قسم کے مفہوم اور معانی کا علم سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو حاصل نہیں. اور ان کی تفسیر و تاویل میں جد وجہد کرنا انسان کو فتنہ میں مبتلا کرنے کا سبب ہے اس لئے ان آیات میں یہ ایمان رکھنا چاہیئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ آیات ہیں اور جو بھی ان کا مفہوم عند اللہ ہے. ہمارا اس پر ایمان و یقین ہے. اکثر سلفیہ اور اہلِ حدیث کا یہی مسلک ہے لیکن ان کی بعض توجیہات سے خدا تعالیٰ کی تجسیم ثابت ہو جاتی ہے اس لئے ان کو ایسے غلو سے اجتناب کرنا چاہیئے ——

اب آخر میں ایک دلچسپ اختلاف کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، جو علماء کے درمیان ہے :——

(الف) تمام قرآن محکم ہے جیسا کہ اس آیت سے واضح ہوتا ہے کتابٌ احکمت آیاته — (جزء ۱۱)

(ب) تمام قرآن متشابہ ہے جیسا کہ آیت مندرجہ سے ثابت ہوتا ہے، کِتابًا متشابهًا مثانی۔ (جزء ۲۳)

(ج) قرآن میں محکم اور متشابہ دونوں قسم کی آیتیں موجود ہیں جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت اشارہ کرتی ہے :——

مِنه آیاتٌ محکماتٌ هن اُم الکتابِ و اُخر متشابهات "— (جزء ۳)

آخر الذکر قول (ج) صواب اور مختار ہے. اور پہلے اور دوسرے اقوال میں جن آیتوں سے تمام قرآن کا محکم ہونا یا تمام قرآن کا متشابہ ثابت کیا گیا ہے. ان کا جواب یہ ہے محکم سے مراد یہ ہے کہ قرآن میں کسی طرح کا آیتوں میں تضاد اور اختلاف نہیں ہے اور نہ اس میں کمی بیشی کی کوئی گنجائش ہے اور متشابہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی آیتیں حق و صداقت میں معجزہ ہونے میں باہم ایک دوسرے کے متشابہ ہیں ——

(فوز الکبیر، اتقان ملخص از پروفیسر لطفی)

عہدِ صحابہؓ میں قرآن کے اصول

مفکرِ اسلام احمد امین مصری اپنی علمی کتاب "فجر الاسلام" میں لکھتے ہیں:۔

قرآن عربی زبان میں عربوں کے اسلوب کلام کے مطابق ہوا تھا، اس کے تمام الفاظ عربی ہیں باستثناء ان قلیل التعداد الفاظ کے جو غیر عربی یعنی دوسری زبانوں سے لئے گئے تھے لیکن عربوں نے انہیں اپنا لیا تھا اور ان پر اپنے قواعد جاری کر دیئے تھے قرآن کا اسلوب بیان خالص عربی اسلوب ہے اس میں حقیقت و مجاز اور کنایہ وغیرہ سب ہی موجود ہیں اور یہ سب چیزیں اسی طریقے سے استعمال ہوئی ہیں جس طرح عرب انہیں استعمال کرتے تھے یہ بات بالکل فطری ہے کیونکہ قرآن اولاً عربوں ہی کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے آیا تھا لہٰذا ضروری تھا کہ وہ ایسی زبان میں ہوتا جسے عرب کے لوگ سمجھ سکتے:۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۔	اور ہم نے تمام رسولوں کو ان کی قوم کی زبان ہی میں بھیجا تھا تاکہ وہ ان کے سامنے خدائی احکام کو پیش کر سکیں۔

پورا قرآن ہر صحابیؓ کی ذہنی اور عقلی گرفت میں نہیں آسکتا تھا

اس کے باوجود (یہ حقیقت ہے کہ) قرآن تمام صحابہؓ کی ذہنی اور عقلی گرفت سے باہر تھا یعنی سب میں یہ اہلیت نہیں تھی کہ وہ سارے قرآن کو اجمالاً اور تفصیلاً ایک مرتبہ سن لینے کے بعد فوراً سمجھ سکیں، ابن خلدون کا یہ قول صحیح نہیں ہے کہ "قرآن عربوں کی زبان میں ان کی بلاغت کے اسلوبوں کے مطابق نازل ہوا تھا اور وہ سب کے سب اسے سمجھتے اور اس کے مفردات اور ترکیبات میں اس کی معانی و مطالب کو جانتے تھے" کیونکہ عربی زبان میں قرآن کا نازل ہونا اس امر کا متقاضی نہیں کہ عرب کے تمام آدمی قرآن کو اس کے مفردات اور ترکیبات کے ساتھ سمجھ سکتے ہوں۔ اس کی دلیل ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ہر کتاب جو کسی زبان میں لکھی گئی ہو ضروری نہیں کہ اس زبان والے سب کے سب اُسے سمجھ سکیں۔ کتنی انگریزی اور فرانسیسی کتابیں ہیں جنہیں انگریز اور فرانسیسی بھی خود نہیں سمجھ سکتے، کیونکہ کسی کتاب کا سمجھنا صرف اس زبان کے جاننے پر موقوف نہیں ہوتا جس میں وہ کتاب لکھی گئی ہے بلکہ اس کے لئے ایک خاص عقلی درجہ کی ضرورت ہوتی ہے کہ پڑھنے والوں کی عقل کا درجہ اور اس کتاب کا درجہ ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو۔ قرآن کے سامنے یہی حالت عربوں کی تھی وہ سب کے سب قرآن کو اجمالی اور تفصیلی طور پر سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ اپنے عقلی درجے کے مطابق قرآن کو سمجھنے کے سلسلہ میں مختلف مدارج پر تھے، قرآن کے تمام الفاظ کے معانی بھی عرب کے سارے باشندے نہیں سمجھتے تھے، کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ کسی قوم کا ہر فرد اپنی زبان کے سارے الفاظ کو سمجھ سکتا ہے اس دعوے کے ثبوت میں ہمارے لئے وہ روایت کافی ہے جو انس بن مالکؓ نے بیان کی ہے کہ ایک آدمی نے حضرت عمرؓ بن الخطاب سے قرآن کی آیت وَفَاكِهَةً وَّاَبًّا" کے متعلق پوچھا کہ اَبٌّ سے کیا مراد ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہمیں تکلف اور تعمق سے منع کیا گیا ہے۔" حضرت عمرؓ ہی سے روایت ہے کہ وہ منبر پر کھڑے ہوئے اور انہوں نے

دورانِ تقریر میں یہ آیت پڑھی " اَوْ یَاْخُذَهُمْ عَلٰی تَخَوُّفٍ " پھر انہوں نے لوگوں سے تَخَوُّفٍ کے معنی پوچھے۔ بنو ہذیل کے ایک آدمی نے بتایا کہ ہمارے ہاں تَخَوُّفٌ کے معنی کم کرتے رہنے اور گھسنے کے ہیں ——

ہمیں معلوم ہے کہ دین اور علم میں حضرت عمرؓ کا رُتبہ کیا تھا مگر انہیں بھی قرآن کے بعض آیت کے معانی دوسرے صحابہؓ سے پوچھنے پڑتے تھے، اسی سے دوسرے صحابہؓ کا اندازہ کر لیجئے، اکثر صحابہؓ آیت کے اجمالی معنوں پر اکتفا کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن کی آیت وَفَاكِهَةً وَّ اَبًّا میں وہ اتنا سمجھ لینے پر اکتفا کرتے تھے کہ اس آیت میں خدا کی نعمتیں شمار کی گئی ہیں وہ اپنے نفسوں پر اس بات کو لازم نہیں سمجھتے تھے کہ وہ تمام آیات کے تفصیلی معانی کو سمجھیں ——

مزید برآں قرآن میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن کے سمجھنے کے لئے محض زبان کے الفاظ اور ان کے اسلوبوں کو سمجھنا ہی کافی نہیں مثلاً وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا" وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا " کے معانی اور یہ کہ" وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ" میں دس راتوں سے کیا مراد ہے؟ اور" لَيْلَةُ الْقَدْرِ" سے کیا مراد ہے؟ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ اس میں بہت سے اشارے ان چیزوں کی طرف ہیں جن کا ذکر تورات اور انجیل میں آیا ہے اور ان کی تردید مقصود ہے۔ ان آیات کو سمجھنے کے لئے محض زبان جاننا کافی نہیں۔ حق تعالیٰ تو فرماتے

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ ..... (الآیہ) ——

(خدا وہ ہے جس نے اے پیغمبر اسلام! تم پر الکتاب نازل کی ہے اس کی کچھ آیات محکمات ہیں اور وہی کتاب کا اصل الاصول ہیں۔ اور دوسری آیات ملتی جلتی سی ہیں۔ جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ کی خواہش اور ان کا مطلب متعین کرنے کی خاطر ان ملتی جلتی آیات کے پیچھے لگ جاتے ہیں حالانکہ ان کا مطلب خدا اور راسخین فی العلم کے سوا کوئی نہیں جانتا الخ

واقعہ یہ ہے کہ یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم قرآن کو سمجھنے کی قدرت اور اس کے معانی و مطالب کی معرفت میں بڑا تفاوت رکھتے تھے —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پورے قرآن کو حفظ کرنے کا رواج نہیں تھا جیسا کہ آگے چل کر ہوا اس زمانہ میں لوگ ایک سورت یا چند آیات یاد کر لیا کرتے اور ان کے مطالب و معانی کو سمجھ لیا کرتے تھے جب انہیں اس میں مہارت حاصل ہو جاتی تو آگے بڑھتے اور اس طرح کچھ اور سورتیں سیکھ لیا کرتے تھے۔ اس طرح قرآن کریم کا حفظ صحابہؓ پر منقسم تھا۔ ابو عبدالرحمٰن سلمیؒ کا بیان ہے کہ ہم سے ان لوگوں نے بیان کیا ہے جو قرآن کریم کو پڑھتے تھے (جیسے حضرت عثمان بن عفان اور عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما وغیرہ) کہ جب وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ آیتیں پڑھ لیتے تھے تو اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک علم و عمل کی وہ باتیں جان نہ لیں جو ان آیات میں ہوتی تھیں۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ جب کوئی آدمی سورۂ بقرہ اور آلِ عمران پڑھ لیا کرتا تھا تو ہماری نگاہوں میں اس کی عزت بہت بڑھ جایا کرتی تھی۔ (یہ روایت امام احمدؒ نے مسند میں بیان کی ہے۔) حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کو صرف سورۂ بقرہ کو یاد کرنے میں آٹھ سال لگ گئے تھے[1] یہ اسی وجہ سے تھا کہ ابن عمرؓ اس طرح حفظ کرتے تھے کہ جب تک اچھی طرح سمجھ نہیں لیتے تھے ایک آیت سے دوسری آیت کی طرف منتقل نہیں ہوتے تھے ——

قرآن کریم میں بہت سی آیات محکم اور واضح المعنی ہیں۔ یہ وہ آیتیں ہیں جن کا اصولِ دین اور اصولِ احکام سے ہے۔ خصوصیت کے ساتھ مکی آیتیں جو اصولِ دین کی طرف دعوت دیتی ہیں۔ جیسے سورۂ انعام وغیرہ۔ اس قسم کی آیات کو جمہور عوام سمجھ سکتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ

[1] الاتقان، ص ۲۰۸ ج ۲۔

وہ لوگ جو اپنے سلیقہ کے اعتبار سے عرب ہوں۔ قرآنِ کریم میں بعض آیات ایسی بھی ہیں جن کے معانی دقیق ہیں۔ انہی آیات کو متشابہ کہا گیا ہے، ان کو سمجھنا دشوار ہے، ان کو سمجھنا خاص لوگوں ہی کا کام ہوتا ہے ــــ صحابہؓ کو عموماً قرآن کو سمجھنے کی زیادہ قدرت تھی ــــ

صحابہؓ کا قرآن فہمی میں تفاوت

کیونکہ قرآن ان کی زبان میں نازل ہُوا تھا اور انہوں نے حالات کا مشاہدہ کیا تھا جن میں قرآن نازل ہُوا تھا ــــ اس کے باوجود قرآن کو سمجھنے کے اسباب و ذرائع سب کو یکساں حاصل نہیں تھے یعنی ــــ

(۱) ــــ عربی زبان کو جاننے میں ان میں باہم تفاوت تھا، اگرچہ عربی ان سب کی زبان تھی مگر ان میں کچھ تو ایسے لوگ تھے جو ادبِ جاہلی کے اچھے عالم تھے اور غریب الفاظ کو جانتے تھے اور اس طرح قرآن کے مفردات کو سمجھنے کی زیادہ صلاحیّت رکھتے تھے۔ ان میں سے دوسرے وہ صحابہؓ تھے جنہیں یہ مواقع حاصل نہیں تھے، اسبابِ نزول کی معرفت آیت کا مقصود سمجھنے میں بڑی مددگار ہوتی ہے اور ان اسباب سے ناواقفیت بسا اوقات انسان کو غلطی میں ڈال دیتی ہے۔ روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے قدامہؓ بن مظعون کو بحرین کا گورنر بنایا تو جارودؓ حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ قدامہؓ نے شراب پی ہے اور انہیں نشہ ہو گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس کا گواہ کون ہے؟ جارودؓ نے کہا کہ میرے اس بیان پر ابوہریرہؓ شہادت دیں گے، حضرت عمرؓ نے کہا، اے قدامہؓ! میں تمہارے کوڑے ماروں گا۔ اس پر قدامہ نے کہا کہ خدا کی قسم جبکہ یہ لوگ کہہ رہے ہیں اگر میں نے شراب پی بھی ہے تب بھی آپ کو یہ حق نہیں کہ آپ میرے کوڑے ماریں حضرت عمرؓ نے کہا کہ کیوں؟ ــــ قدامہؓ نے کہا اس لئے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ــــ

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ــــ"

(القرآن الکریم)

(ان پر کوئی مضائقہ نہیں ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے اگر وہ کچھ لیں لیں جبکہ وہ قانونِ خداوندی کی نگہداشت کر رہے ہوں اور ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں، پھر قانونِ خداوندی کی نگہداشت کریں اور ایمان لائیں۔ پھر قانونِ خداوندی کی حفاظت نگہداشت اور حسن کارانہ کام کریں ــــ

"۔ اور میں انہی لوگوں میں سے ہوں جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے، پھر قانونِ خداوندی کی نگہداشت کی اور ایمان لائے پھر قانونِ خداوندی کی نگہداشت کی اور حسن کارانہ کام کئے۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگِ بدر، جنگِ اُحد، اور جنگِ خندق اور تمام غزوات میں شریک رہا ہوں" ــــ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ کوئی شخص ان کو جواب کیوں نہیں دیتا؟ تو ابنِ عباسؓ نے کہا کہ یہ آیتیں ان لوگوں کے عذر کے طور پر نازل ہوئی تھیں جن کا شراب کی حرمت نازل ہونے سے پہلے انتقال ہو چکا تھا اور باقی لوگوں پر حجّت ہیں۔ کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ــــ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ــــ (القرآن الکریم)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! واضح رہے کہ شراب، جوا، بتوں کے چڑھاوے اور پانسے سب کے سب گندی چیزیں اور شیطانی کام ہیں ــــ

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے ابنِ عباسؓ، تم نے سچ کہا۔ ایک آدمی ابنِ مسعودؓ کے پاس آ کر کہنے لگا کہ مسجد میں ایک آدمی قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کر رہا ہے۔ وہ اس آیت "يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ" کی تفسیر میں کہہ رہا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کے سامنے ایک دُھواں آئے گا جس سے اُن کے سانس گھُٹ جائیں گے حتّٰی کہ انہیں زکام سا ہو جائے گا، اس پر ابنِ مسعودؓ

نے فرمایا کہ کسی کو کچھ معلوم ہو تو وہ بیان کرنا چاہیئے، لیکن جسے معلوم نہ ہو اُسے کہہ دینا چاہیئے کہ خُدا زیادہ جاننے والا ہے۔" اس آیت کے متعلق واقعہ یہ ہے کہ قریش نے جب رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی نافرمانی کی تو آپ نے انہیں سالہائے یوسفؑ کی طرح کے قحط زدہ سالوں کی بددعا دی۔ چنانچہ انہیں قحط اور مشقّت نے آپکڑا حتیٰ کہ وہ ہڈیاں کھانے پر مجبور ہُوئے۔ ان دنوں کی بات ہے کہ آدمی آسمان کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھتا تھا تو اُسے بُھوک کی مشقّت کی بناء پر اپنے آسمان کے درمیان بجز ایک دھوئیں کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا[1]

(۲) — عربوں کے گُفتار و کردار میں ان کی عادتوں کو جاننے میں بھی اختلاف تھا۔ جو لوگ (مثلاً) زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے حج کی عادات و رسوم کو جانتے تھے، وہ بہ نسبت ان لوگوں کے جو ان کی عادات کو نہیں جانتے تھے حج کی آیات کو زیادہ سمجھ سکتے تھے، یہی حال ان آیتوں کا ہے جو عربوں کے دیوتاؤں اور دیویوں اور عربوں کے طریقۂ عبادت کے بارہ میں نازل ہوئی ہیں کہ ان کو مکمّل طور پر وہی لوگ سمجھ سکتے تھے جو جانتے تھے کہ عرب کے لوگ کیا کچھ کیا کرتے تھے —

(۳) — قرآنی آیات کے نازل ہونے کے زمانہ میں جزیرۂ عرب میں یہود و نصاریٰ کیا کچھ کیا کرتے تھے، ان کا جاننا بھی ضروری ہے، کیونکہ قرآن کی بہت سی آیات میں انہی کے اعمال کی طرف اشارہ ہے اور انہی پر رَد کیا گیا ہے۔ ان آیات کو اس وقت تک سمجھنا بہت ہی دُشوار ہے جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ یہود و نصاریٰ کیا کچھ کیا کرتے تھے۔ نیز صحابہؓ کے درمیان فہم و بصیرت کے لحاظ سے بھی بہت تفاوت ہوتا تھا اور تابعینؒ اور تابعینؒ کے بعد کے لوگوں میں یہ تفاوت اور شدید ہو گیا تھا —

سرچشمہ ہائے تفسیر یہاں تفسیر سے مُراد بالمنقول ہے جس سے علماء کی مُراد (اوّلاً) وہ تفسیر ہے جو خود رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے نقل کی گئی ہے مثلاً حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے منقول ہے کہ اَلصَّلٰوۃُ الْوُسْطٰی سے مُراد نمازِ عصر ہے یا حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ میں نے رسولُ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے پوچھا کہ یَوْمُ الْحَجِّ الْاَکْبَرِ سے کیا مُراد ہے آپ نے فرمایا کہ یوم النحر مُراد ہے۔ یا یہ کہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے پوچھا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے اپنے خُسر سے معاہدہ کر کے کونسی مدّت کو پُورا کیا تھا (آٹھ سال یا دس سال) —

تفسیر بالروایت آپ نے فرمایا کہ وہ مدّت پُوری کی تھی جس میں پُوری پُوری ادائیگی اور وُسعت تھی۔ (یعنی دس سال کی مدّت) اس طرح کی بہت سی روایات ہیں جو صحاح ستہ کی کتابوں میں منقول ہیں۔ ان روایات میں قصّہ گو لوگوں اور روایات گھڑنے والوں نے بہت کچھ اضافے بھی کئے ہیں، علمائے حدیث ان پر تنقید کی ہے۔ کچھ روایات کو انہوں نے صحیح اور کچھ کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اس اَمر کی دلیل کہ اس باب میں موضوع روایات بہت داخل ہوئی ہیں یہ ہے کہ ایک ہی آیت کی تفسیر میں دو دو متناقض تفسیریں نقل کی گئی ہیں جو ناممکن ہے کہ رسولُ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے صادر ہوئی ہوں۔ مثلاً حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ رسولُ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے اَلْقَنَاطِیْرُ الْمُقَنْطَرَۃُ مِنَ الذَّھَبِ وَالْفِضَّۃِ — کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ قنطار ایک ہزار اوقیہ کو کہتے ہیں۔ مگر دوسری طرف ابوہریرہؓ سے نقل کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ قنطار بارہ ہزار اوقیہ کو کہتے ہیں[2]۔ بلکہ اس بناء پر بعض علماء نے تو سرے سے اس باب کا انکار ہی کر دیا ہے، یعنی انہوں نے ان روایات کی صحت ہی کا جو محدّثین اس باب میں بیان کرتے ہیں سرے سے انکار کیا ہے۔

تفسیری روایات قابلِ اعتماد نہیں چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ سے روایات ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ تین باتوں کی کوئی اصل نہیں ہے۔ تفسیر[1]، ملاحم[2] اور مغازی[3]۔ اس بات کی دلیل کہ خود مفسّرین نے اس باب میں نقل شدہ

[1] موافقات صفحہ ۲۰۱ ج ۳ و مابعد [2] پہلی حدیث کو حکم نے اور دوسری حدیث کو احمد اور ابن ماجہ نے بیان کیا ہے باقی اگلے صفحہ پر

روایات پر اعتماد نہیں کیا یہ ہے کہ وہ ان تفسیروں پر رُک کر کھڑے نہیں ہو گئے جو روایات کے ذریعہ سے ان تک پہنچی تھیں بلکہ اس کے ساتھ ہی انہوں نے وہ تفسیریں بیان کی ہیں جن تک انہیں خود ان کے اجتہاد نے پہنچایا تھا۔ اگر روایات کی تفسیریں ان کے نزدیک صحیح ہوتیں تو نص کے ذریعہ ایک تفسیر معلوم ہو جانے کے بعد ان کو ٹھہر جانا چاہیئے تھا اور خود اپنی رائے سے کوئی تفسیر بیان کرنے کی جرأت نہ کرنی چاہیئے تھی مگر مفسّرین نے ایسا نہیں کیا ——

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا منقولی تفسیر کا یہ مجموعہ صحیح ہوتا چلا گیا بعد میں اس مجموعہ میں وہ تفسیریں بھی شامل ہو گئیں جو صحابہؓ تابعینؒ اور دوسرے آئمہ سے منقول تھیں۔ حتیٰ کہ ابتدائی زمانہ کی تمام تفسیر کی کتابیں اسی نہج پر مرتّب کی گئی ہیں ——

تفسیر بالرائے

(دوم) اجتہاد بھی تفسیر کے سرچشموں میں سے ہے۔ اسے آپ "رائے" بھی کہہ سکتے ہیں۔ مفسّر عربوں کے اسلوبِ بیان سے واقف ہو۔ عربی الفاظ اور ان کے معانی کو وہ جانتا ہو۔ اسے یہ معلوم ہو کہ یہ الفاظ جاہلی اشعار وغیرہ میں کہاں کہاں اور کس کس انداز سے استعمال ہوئے ہیں۔ صحیح اسناد کے ساتھ آیات کے اسبابِ نزول کے بارہ میں جو روایات پائی جاتی ہیں اسے ان کا بھی علم ہو۔ ان تمام اسباب کے مہیّا ہو جانے کے بعد وہ اپنے اجتہاد سے قرآنی آیات کی تفسیر کرتا ہو۔ زیادہ تر صحابہؓ اسی طریقہ سے قرآن کی تفسیر کیا کرتے تھے، چنانچہ ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ سے جو تفسیریں منقول ہیں وہ اسی قسم کی تفسیریں ہیں، مثال کے طور پر آپ دیکھئے کہ آیت " وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ" کی تفسیر میں مفسّرین نے اَلطُّوْرَ کے لفظ کی مختلف تفسیریں کی ہیں۔ چنانچہ مجاہد نے اَلطُّوْرَ کی تفسیر مطلقاً پہاڑ سے کی ہے، لیکن ابن عباسؓ نے ایک خاص پہاڑ کے ساتھ کی ہے۔ دوسرے مفسّرین نے کہا ہے کہ اَلطُّوْر اس پہاڑ کو کہتے ہیں جس پر سبزہ اُگا ہوا ہو۔ وہ کہتے ہیں۔ وہ خشک اور ننگے پہاڑوں کو اَلطُّوْر نہیں کہتے —— آپ نے دیکھا کہ تفسیروں کا یہ اختلاف دراصل رائے میں اختلاف کا نتیجہ ہے منقولات میں اختلافات کا نتیجہ نہیں ہے جیسا کہ الفاظ کے معانی میں اختلاف کا آپ نے یہ ایک نمونہ دیکھا ہے۔ اسی طرح یہ حضرات آیات کے مطالب بیان کرنے میں بھی مختلف راستے اختیار کرتے ہیں ——

تفسیر بالرائے کے متعلّق صحابہؓ کے مُختلف نظریات

یہ ضرور ہے کہ صحابہؓ اور تابعینؒ دو گروں میں بٹے ہوئے تھے، ان میں ایک گروہ ایسا بھی موجود تھا جو قرآن کے بارے میں اپنی رائے سے کچھ کہنے سے احتراز کرتا تھا، چنانچہ سعید بن المسیبؒ کے متعلق نقل کیا جاتا ہے کہ جب ان سے قرآن کے متعلق پوچھا جاتا تو فرما دیا کرتے: "میں قرآن کے بارے میں کچھ نہیں کہتا"۔ ابن سیرین کہتے ہیں کہ میں نے عبیدہ سے قرآن کی کوئی بات کو ہاتھ سے نہ دے، وہ لوگ گذر گئے جنہیں معلوم تھا کہ قرآن کن کن حالات و ظروف میں نازل ہوا تھا۔

" ہشام بن عروہ ابن الزبیر سے نقل کیا جاتا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ "میں نے اپنے والد کو کبھی نہیں دیکھا کہ انہوں نے کتاب اللہ کی کسی آیت کا مطلب اپنی طرف سے بیان کیا ہو"۔ لیکن ان کے پہلو بہ پہلو وہ حضرات بھی تھے جو اسے جائز سمجھتے تھے اور ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ابن مسعودؓ، ابن عباسؓ، اور عکرمہؒ وغیرہ کی رائے یہی تھی۔ البتہ یہ اور ان جیسے دوسرے لوگ اس بات کو بُرا سمجھتے تھے کہ صلاحیت اور اسباب نہ رکھتے ہوئے کوئی شخص قرآن کی تفسیر بیان کرنے کی جُرأت کرے، مثلاً کسی شخص کو عربی زبان کی اتنی معرفت حاصل نہیں ہے کہ وہ بات کو صحیح طور پر سمجھ سکے یا اس نے قرآن کو اس انداز سے نہیں پڑھا کہ اس کی مجمل چیزوں کو مفصّل چیزوں پر محمول کر سکے۔ ایسے

حاشیہ ۵۲ مغازی اتقان صفحہ ۲۱۱ ج ۲۔ بیان کیا جاتا ہے کہ امام احمدؒ کے شاگردوں میں سے محققین نے کہا ہے کہ امام صاحب کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے زیادہ تر روایتوں کی صحیح اور مستقل سندیں نہیں تھیں ——

لوگوں کو تفسیرِ قرآن کی جرأت نہیں کرنی چاہیئے ایسے ہی وہ اسے بھی بُرا سمجھتے تھے کہ کوئی شخص دینی مذاہب میں سے کسی خاص مسلک کا پیرو ہو جائے مثلاً اعتزال ارجاء تشیع وغیرہ اور پھر اپنے اس عقیدہ کو اصل قرار دے کر قرآن کی تفسیر اس کے مطابق کرنے لگے، حالانکہ ضروری ہے کہ عقیدہ کو قرآن کے تابع رکھا جائے، یہ نہیں کہ قرآن کو اپنے تابع کر دیا جائے ——

یہ اجتہاد ہی تھا جو صحابہؓ اور تابعینؒ کے درمیان الفاظ اور آیاتِ قرآنیہ کی تفسیر میں واضح اختلافات کا موجب بن گیا جس کا مظاہرہ آپ کو ابنِ جریر طبری کی تفسیر کے قریب قریب ہر صفحہ پر نظر آسکتا ہے ——

جاہلی ادب شعر میں ہو یا نثر میں، جاہلیت میں اور ابتداء اسلام میں عربوں کے عادات اور ان کے رسم و رواج حوادث و وقائع جو عربوں کو پیش آئے وہ عداوتیں، منازعتیں، ہجرت، جنگ اور فتنے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آئے۔ وہ واقعات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے دوران میں اور آیاتِ قرآنی کے نزول کا موجب بنے، غرضیکہ یہ تمام چیزیں علمائے صحابہؓ اور تابعینؒ کے لئے وہ سرچشمہ تھیں جن سے وہ قرآن کی تفسیر پر قدرت حاصل کرنے میں مدد لیتے تھے ——

اسرائیلیات

تفسیر کے سرچشموں میں ایک اور سرچشمہ بھی تھا جس سے مفسرین نے بکثرت مدد لی ہے۔ بات یہ ہے کہ عقول کے شغف اور مکمل معلومات حاصل کرنے کے شوق نے لوگوں کو قرآن کی بہت سی آیتوں کو سُننے کے بعد اس طرف دعوت دی کہ وہ اپنے آس پاس کے لوگوں سے ان کے متعلق سوالات کریں۔ چنانچہ جب انہوں نے اصحابِ کہف کے کتے کا ذکر سُنا تو کہنے لگے ... اس کا کیا رنگ تھا؟ جب انہوں نے فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا "سُنا تو ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ یہ بعض کونسا حصّہ تھا جس سے مقتول کی میّت کو چھُوا گیا تھا؟ نوح علیہ السلام کی کشتی کتنی بڑی تھی؟ اس لڑکے کا کیا نام تھا جسے ایک نیک بندہ نے موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں قتل کر دیا تھا؟ جب ان کے سامنے فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ پڑھا جاتا تھا تو وہ کہتے تھے کہ ان پرندوں کی انواع کیا تھیں؟ وہ ستارے کون سے تھے جنہیں یوسف علیہ السلام نے اپنے خواب میں دیکھا تھا؟ ایسے ہی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اُن کے سُسر کے قصہ میں قرآنی آیات سُنتے تھے کہ دونوں مدّتوں میں موسیٰ علیہ السلام نے کونسی مُدت پُوری کی تھی اور موسیٰ علیہ السلام نے ان کی چھوٹی صاحبزادی سے شادی کی تھی یا بڑی سے؟ اسی طرح جب انہیں قرآنِ کریم میں ابتداء آفرینش کا کوئی اشارہ ملتا تھا تو باقی قصہ کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتے تھے ایسے ہی جب ان کے سامنے کوئی ایسی آیت آتی تھی جس میں کسی نبی کے متعلق کسی حادثہ کا بیان ہُوا تھا تو وہ اس حادثہ کی تفصیلات کے پیچھے پڑ جاتے تھے، جو چیز لوگوں کی اس علمی طمع کو پُورا کر سکتی اور ان کی تشنگی کو فرو کر سکتی تھی وہ محض تورات اور اس کے متعلقہ حواشی اور شروح ہی ہو سکتی تھیں۔ بلکہ وہ افسانے اور کہانیاں بھی جو اس سلسلہ میں گھڑی گئی تھیں، کچھ یہودی مسلمان ہو چکے تھے ان کے ذریعہ سے نامحسوس طریقہ پر یہ تمام معلومات مسلمانوں میں گھستی چلی آئیں اور قرآن کی تفسیر میں داخل ہوتی چلی گئیں، اس میں بعض صحابہؓ نے بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھا کیونکہ اپنے خیال میں اس طرح تو وہ قرآن کی شرح و توضیح کو مکمل کر رہے تھے ——

بڑے بڑے صحابہؓ نے اسرائیلیات کو بیان کرنے میں باک نہیں کیا،

بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ جب تم سے اہلِ کتاب کوئی بات بیان کریں تو نہ اس کو سچ سمجھو نہ جھوٹ، لیکن بعض حضرات کا عمل اس کے بالکل برعکس تھا۔ یہ حضرات ان کی باتوں کو سچ سمجھتے اور ان سے نقل کرتے تھے۔ اس کے نمونہ کے طور پر تمہارا جی چاہے تو طبری وغیرہ کی ان روایات کو پڑھ جاؤ جو انہوں نے قرآنی آیات هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ کی تفسیر میں

بیان کی ہیں۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ کعب الاحبارؒ کے پاس اُٹھتے بیٹھتے اور اُن سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ اس بارہ میں مجھے ابن خلدون کا یہ قول بہت ہی پسند ہے کہ "عرب اہل کتاب اور اہل علم نہیں تھے، ان پر بدویت اور امیّت کا غلبہ تھا، جب انہیں کسی ایسی بات جاننے کا شوق ہوتا جن کا نفوسِ بشریہ کو شوق ہو جایا کرتا ہے مثلاً تکوین کے اسباب، ابتداء آفرینش اور وجود کے اسرار وغیرہ تو وہ اہل کتاب ہی کیطرف رجوع کرتے تھے، یہ لوگ یہود میں سے اہل تورات تھے۔ اور ان کے بعد نصاریٰ تھے، اہل تورات جو ان عربوں کے درمیان میں رہتے تھے وہ بھی ان کی طرح کے بدوی تھے، انہیں اس قسم کی کچھ زیادہ باتیں معلوم نہیں تھیں، وہ اتنا ہی جانتے تھے جتنا عام اہل کتاب جانتے تھے ان کا بڑا حصّہ بنو حمیر پر مشتمل تھا جنہوں نے یہودیت کو بطور اُپنے دین کے قبول کر لیا تھا، یہ لوگ جب مسلمان ہوئے تو اپنی ان تمام داستانوں اور کہانیوں کے ساتھ اسلام میں داخل ہوئے جن کا احکام شرعیہ سے کوئی تعلّق نہیں تھا۔ کہ اس میں وہ خاص احتیاط برتتے۔ مثلاً ابتداء آفرینش انتہا۔ دُنیا اور ملاحم وغیرہ۔ یہ لوگ کعب الاحبار، وہب بن منبہ، اور ان جیسے دوسرے لوگ تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں تفسیر کی کتابیں ان منقولات سے بھر گئیں، جو ان نومسلم یہودیوں نے ان سے بیان کی تھیں، ان کا تعلّق چونکہ احکام سے تو تھا نہیں کہ ان کی صحت کی جانچ پڑتال سختی سے کی جاتی کیونکہ احکام پر تو عمل کرنا واجب ہوتا ہے اور ان منقولات کا عمل سے کوئی تعلّق نہیں تھا، لہذا مفسّرین نے ان جیسی چیزوں کے نقل کرنے میں کافی تساہل سے کام لیا اور اپنی تفسیر کی کتابیں اس قسم کی خرافات سے بھر کر رکھ دیں الخ ——— (مقدمہ ص ۳۶۷)

اس عہد کے مفسّرین

صحابہؓ میں سے قرآن کی تفسیر بیان کرنے میں بہت تھوڑے سے آدمی مشہور ہیں۔ زیادہ تر جن لوگوں سے قرآن کی تفسیر نقل کی گئی ہے ان میں حضرت علی ابن ابی طالبؓ، عبداللہ ابن عباسؓ، عبداللہ ابن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ ہیں اور ان سے کم حضرت زید بن ثابتؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ اور عبداللہ ابن الزبیرؓ ہیں۔ بہتر ہوگا کہ ہم یہاں صرف ان چار حضرات پر اکتفا کریں جن کا پہلے تذکرہ کیا گیا ہے، کیونکہ یہی وہ حضرات ہیں جنہوں نے مختلف شہروں کے مدارس کے لئے تفسیر کی غذا مہیّا کی۔ وہ عام صفات جنہوں نے ان مذکورہ بالا چاروں حضرات کو تفسیر میں تبحّر کا درجہ عطا کیا یہ تھیں، عربی زبان پر ان کا عبور، کلامِ عرب کے اسالیب کا احاطہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا اس درجہ اختلاط کہ انہیں حوادث و وقائع کا پورا علم ہو سکا، جن کے بارہ میں آیاتِ قرآنیہ نازل ہوئی تھیں اجتہاد سے بے وجہ احتیاط نہ برتنا اور جس نتیجہ تک انہیں ان کا اجتہاد پہنچائے، اس کو جرأت کے ساتھ ظاہر کر دینا۔ تیسری خصوصیت میں ہم ابن عباسؓ کا استثناء کریں گے، کیونکہ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہ اختلاط نصیب نہیں ہو سکا جو دوسرے حضرات کو حاصل تھا تاہم اس کے عوض میں انہیں اپنے عنفوانِ شباب میں علمائے صحابہؓ کے ساتھ ایسا اختلاط حاصل رہا جس نے ایک حد تک اس کمی کی تلافی کر دی کیونکہ ابن عباسؓ نے علمائے صحابہؓ سے استفادہ کیا تھا اور وہ ان سے روایت کرتے تھے اگر ہم کثرتِ روایات کے اعتبار سے ان چاروں حضرات کی درجہ بندی کرنا چاہیں تو حضرت ابن عباسؓ کا درجہ سب سے اوّل رہے گا۔ پھر حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا درجہ آئے گا اور ان کے بعد حضرت علی ابن ابی طالبؓ کا اور ان کے بعد ابی بن کعبؓ کا۔ یہ درجہ بندی کثرت روایات کی بناء پر ہوگی صحتِ مرویات کی بناء پر نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے نام سے سب سے زیادہ اور ان کے بعد حضرت علیؓ کے نام سے روایات بہت زیادہ گھڑی گئی ہیں۔ اس کے چند اسباب تھے جن میں سے اہم ترین سبب تو یہ تھا کہ حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ کا تعلق بنوّت کے گھرانے سے تھا۔ ان کے ناموں سے روایات گھڑنا ان روایات کو وہ اعتماد اور تقدیس عطا کر دیتا تھا جو دوسرے حضرات کے نام سے حدیثیں گھڑنے میں ممکن نہیں تھی۔ لوگوں نے وہ تمام روایات گھڑنی اور ان کی طرف منسوب کرنی شروع کر دیں جن کے متعلق انہیں خیال ہوا کہ ان سے حضرت علیؓ کی علمی قدر میں اضافہ ہوگا۔ ابن عباسؓ کی نسل سے خلفاء عباسیہ تھے، لوگ ان کے دادا سے بکثرت روایتیں نقل کر کے خلفاء کا تقرب حاصل کرتے تھے۔ جی چاہے تو ذرا ابن ابی جمرہ کی یہ روایت حضرت علیؓ سے دیکھئے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر میں چاہوں کہ اُمّ القرآن (سورۃ فاتحہ) کی تفسیر سے ستّر اُونٹوں کا بوجھ بھر دوں تو میں ایسا کر سکتا ہوں"!

نیز ابو طفیل کی یہ روایت دیکھئے کہ میں حضرت علیؓ کے ایک خطبہ میں حاضر تھا جس میں انہوں نے ارشاد فرمایا کہ "تم مجھ سے کسی بات کے متعلق نہیں پوچھو گے مگر میں تمہیں اس کے متعلق بتا سکوں گا۔

ان دونوں روایتوں کو نقل کر دینا

ہی غالباً کافی ہوگا، ان پر مزید کسی حاشیہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے ——

حضرت ابن عباسؓ سے اس کثرت سے روایات نقل کی گئی ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ آیاتِ قرآنی میں سے کوئی ایک آیت ایسی نہیں نکلے گی جس میں حضرت ابن عباسؓ سے ایک قول یا چند اقوال مروی نہ ہوں۔ راویوں نے اس کثرت سے روایات نقل کی ہیں کہ وہ حد سے متجاوز ہو گئی ہیں اور ناقدین کو سلسلہ رواۃ کی تفتیش کرنی پڑی۔ چنانچہ کچھ سلسلوں کو انہوں نے معتبر اور کچھ کو ناقابلِ اعتبار قرار دیا ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ معاویہ ابن صالح عن علی ابن ابی طلحہ عن ابنِ عباسؓ سلسلہ اسناد ہے اس پر بخاریؒ نے بھی اعتماد کیا ہے جو بیر عن ضحاک عن ابن عباسؓ ناپسندیدہ سلسلۂ اسناد ہے۔ ابن جریج نے روایات کے جمع کرنے میں صحت کا اہتمام نہیں کیا ہر آیت کے متعلق جو کچھ انہیں ملا چاہے صحیح تھا اور چاہے ضعیف سب نقل کر دیا ہے۔ کلبی عن ابی صالح عن ابن عباسؓ سب سے واہیات ترین سلسلۂ اسناد ہے اگر اس کے ساتھ محمد بن مروان سدّی صغیر کی روایت بھی مل جائے تو پھر تو وہ محض جھوٹ کا پلندہ ہے۔ وغیر ذالک —— ابن عبد الحکم کی سند سے نقل کیا گیا ہے کہ میں نے امام شافعیؒ کو کہتے ہوئے سنا کہ ابن عباسؓ سے تفسیر میں سو حدیثوں کے لگ بھگ سے زیادہ ثابت نہیں ہے[1]۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حدیثیں گھڑنے والے کس قدر حدیثیں گھڑتے تھے اور حدیثیں گھڑنے کی حرکت کہاں تک پہنچ چکی تھیں ——

ان روایات کے گھڑے ہوئے ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ بعض اوقات آپ کو حضرت ابن عباسؓ کی ایسی دو روایتیں ملیں گی جو خود حضرت ابنِ عباسؓ سے نقل کی گئی ہوں گی اور دونوں باہم متناقض ہوں گی کہ ان دونوں کو حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب کرنا صحیح ہی نہیں ہو سکے گا۔ مثلاً ابنِ جریر طبری میں دیکھئے قرآن کی اس آیت کی تفسیر میں فَخُذْ أَرْبَعَةً مِنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا۔ "معاویہؓ نے علی ابن ابی طلحہ سے اور انہوں نے ابنِ عباس سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ یہ ایک مثال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان چاروں پرندوں کو کاٹ لو اور پھر ان کو دنیا کے چار کھونٹ میں رکھ دو، چوتھائی یہاں اور چوتھائی وہاں۔ پھر ان کو پکارو۔ تو وہ دوڑتے ہوئے آئیں گے ..... ذرا آگے چل کر ابن جریر کہتے ہیں کہ ہم سے محمد بن سعد نے حدیث بیان کی کہ میرے والد نے مجھ سے بیان کیا، انہوں نے کہا کہ میرے چچا نے مجھ سے بیان کیا اور انہوں نے اپنے والد سے بیان کیا کہ ابنِ عباسؓ فرماتے تھے کہ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ میں صُرْهُنَّ کی تفسیر یہ فرماتے ہیں کہ ان کو کاٹ ڈالو، اور دوسری جگہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ ان کو اچھی طرح باندھ لو[2]۔ یہ بات تکلف کے ساتھ بھی کہنی مشکل ہی ہے کہ حضرت ابنِ عباسؓ نے ایک وقت میں یہ تفسیر بیان کی ہو اور دوسرے وقت میں وہ اس کی مثال ابنِ جریر میں بڑی کثرت سے پائی جاتی ہیں ——

یہ الگ بات ہے کہ اس قسم کی موضوع تفسیریں —— حق بات تو بہر حال کہنی ہی پڑتی ہے۔ اپنی ایک علمی قیمت رکھتی ہیں جو تفسیریں گھڑی جاتی تھیں وہ یونہی بے سر و پا باتیں نہیں ہوتی تھیں بلکہ اکثر اوقات یہ موضوع تفسیریں ذہین لوگوں کے اجتہاد کا علمی اور

---

[1] الاتقان ص۲۲۵ ج ۲ —— [2] ابن جریر ص۲۷، ۲۸، ج ۳ ——

اور قیمتی نتیجہ ہوتی تھیں۔ ان میں وہ چیز جس کی درحقیقت کوئی قیمت نہیں ہے صرف وہ اسناد ہے جس کے ذریعہ سے انہیں حضرت علیؓ یا ابن عباسؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہے ـــــ جب ہم حضرت ابن عباسؓ وغیرہ سے منقول تفسیری روایات پر عام نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ان کا سرچشمہ وہی تین چیزیں ملتی ہیں جن کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں (۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل، یا ان حوادث و وقائع کی روایت جو ان کے سامنے پیش آئے تھے جن سے کسی آیت کے معنی کی توضیح ہو جاتی ہو۔ (۲) اُدب جاہلی پر اعتماد کرتے ہوئے فہم معنی میں اجتہاد اور عربی زبان اور عربوں کی عادات اور رسوم و رواج کی معرفت جو زمانۂ جاہلیت اور ابتداء اسلام میں عام تھیں۔ اور (۳) اسرائیلیات اور ان کے متعلقات ـــــ

مفسّرین تابعینؒ

عہدِ صحابہؓ کے بعد مذکورہ بالا صحابہؓ سے روایات کرنے میں بعض تابعینؒ نے خاص شہرت پائی۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے زیادہ تر مجاہد، عطاء ابن ابی رباح۔ عکرمہ مولیٰ ابن عباس اور سعید ابن جبیر نقل کرتے ہیں۔ یہ چاروں حضرات ابن عباسؓ کے شاگردوں میں سے ہیں جنہوں نے ان سے مکہ میں اکتسابِ علم کیا تھا اور سب کے سب موالی میں سے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو حضرت ابن عباسؓ سے بکثرت روایات کرتے ہیں اور کچھ کم۔ مجاہد، حضرت ابن عباسؓ سے سب سے کم روایت کرتے ہیں اور یہی سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تفسیر پر امام شافعیؒ اور امام بخاریؒ وغیرہ جیسے اہلِ علم بھی اعتماد کرتے تھے لیکن بعض علماء ایسے بھی تھے جو مجاہد کی تفسیر کو قبول نہیں کرتے تھے، چنانچہ ابن سعد نے اپنی طبقات میں نقل کیا ہے کہ اعمش سے پوچھا گیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ لوگ مجاہد کی تفسیر سے احتراز کرتے ہیں؟ اعمش نے بتایا کہ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ مجاہد تفسیر میں اہلِ کتاب سے پوچھا کرتے تھے اور ان کی باتیں نقل کیا کرتے تھے[1] لیکن ہم نے یہ کسی کو نہیں دیکھا کہ اس نے مجاہد کے صدق و امانت پر طعن کیا ہو۔ اسی طرح عطاء ابن ابی رباح اور سعید بن ابی جبیر بھی قابلِ اعتماد اور سچے بزرگ تھے۔ رہ گئے عکرمہؓ تو وہ ابن عباسؓ سے سب سے زیادہ روایتیں نقل کرتے ہیں اور یہ ان کے آزاد کردہ غلام بھی ہیں۔ ان کی اصل مغرب میں بربر سے تھی۔ ان کو قابلِ اعتماد شمار کرنے میں علماء کا اختلاف ہے کچھ لوگ ان پر اعتماد کرتے اور نہ ان سے کوئی روایت نقل کرتے ہیں۔ امام بخاریؒ انہیں قابلِ اعتماد سمجھتے ہیں اور ان سے روایت بھی کرتے ہیں دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ علم میں بڑے جرّی تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ قرآن میں وہ ہر چیز کو جانتے تھے۔ کسی شخص نے سعید بن المسیبؒ سے قرآن کی کسی آیت کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ مجھ سے قرآن کی کسی آیت کے متعلق نہ پوچھو، اس شخص سے پوچھو جو یہ سمجھتا ہے کہ اس پر قرآن کی کوئی بات مخفی نہیں ہے۔ یعنی عکرمہؓ سے۔ عبداللہ ابن مسعودؓ کے شاگردوں میں سے تفسیر میں عراق کے اندر مسروق ابن الاجدع زیادہ مشہور ہیں۔ یہ عربی النسل ہیں اور قبیلۂ ہمدان سے ان کا تعلق ہے، نہایت پرہیزگار، زاہد، ثقہ اور سچے آدمی تھے، کوفہ میں رہتے تھے اور شریح قاضی پیچیدہ معاملات و مسائل میں ان سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ اسی طرح قتادہ ابن دعامہ سدوسی اکمہ کی بھی بڑی شہرت تھی یہ بھی عربی الاصل تھے اور بصرہ میں رہتے تھے۔ تفسیر میں ان کی شہرت عربی زبان پر ان کی قدرت و عبور کی وجہ سے تھی۔ اشعار عرب ایام العرب اور انسابِ عرب پر ان کی معلومات نہایت وسیع تھیں، قابلِ اعتبار بزرگ تھے تاہم کچھ لوگوں نے ان کی روایتیں بیان کرنے سے احتراز برتا ہے کیونکہ قضاء وقدر کے مسائل میں غور و خوض کرتے تھے ـــــ

عہدِ تابعینؒ میں اسرائیلیات

اس عہد یعنی تابعینؒ کے عہد میں اسرائیلیات اور نصرانیات کی وجہ سے تفسیر کا باب بہت ہی ضخیم ہو چکا تھا، کیونکہ یہودی اور نصرانی بکثرت اسلام میں داخل ہو چکے تھے، لوگوں کو ان یہودی اور نصرانی حوادث و واقعات کی تفصیلات سننے کا شوق تھا جن کی طرف قرآن نے محض اشارہ کرنے پر اکتفاء کیا تھا۔ ہم نے تفسیر ابن جریر میں بہت سی ان آیتوں کو تلاش کیا ہے جو بنی اسرائیل کے متعلق وارد ہوئی ہیں تو یکایک ہم دیکھتے ہیں۔

---

[1] طبقات ابن سعدؒ ص ۲۴۴ ج ۵ ـــ [2] ابن خلکان ص ۴۵۵ ج ۱ ـــــ

ان کی تفسیر میں سرتاپا وہ باطل روایات بیان ہوئی ہیں جن کا انحصار محض وہب بن منبہ ہی پر ہے۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ وہب بن منبہ یمن کے ایک یہودی تھے جو مسلمان ہو چکے تھے۔ وہ یہودی کتابوں اور ان کے قصّوں کو بغیر دقیق احتیاط کے بیان کرتا ہے اور اپنی روایتوں کو علمی رنگ دینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتا۔ مسلمانوں نے ان روایتوں کو وہب بن منبہ سے لینے میں کافی تساہل برتا۔ جیساکہ ابن خلدون نے اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے کیونکہ ان روایات کے بیان کرنے پر ان کے خیال میں کسی حکم شرعی کا استنباط مرتب نہیں ہوتا تھا، جیساکہ ہم نے بہت سی ان آیات کو تلاش کیا، جو نصاریٰ کے متعلق وارد ہوئی ہیں تو یکایک ہم دیکھتے ہیں کہ طبری کی زیادہ تر روایات ابن جریج سے نقل کی گئی ہیں۔ یہ ابن جریج عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج ہے۔ امام ذہبیؒ تذکرۃ الحفاظ میں کہتا ہے کہ "یہ رومی نژاد تھے"۔ لہٰذا یہ نصرانی الاصل تھے، ان کے متعلق بعض علماء کہتے ہیں کہ وہ حدیثیں وضع کیا کرتا تھا، اس نے متعہ کے طریقے سے نوّے عورتوں سے شادی کی تھی، کہا جاتا ہے کہ ابن جریج پہلا شخص تھا جس نے اسلام میں کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی پیدائش ۸۰ھ میں ہوئی۔ اور تقریباً ۱۵۰ھ میں ان کا انتقال ہوا، وہ بہت سے شہروں میں گھومے پھرے، ان کی پیدائش مکّہ میں ہوئی اور بصرہ یمن اور بغداد کی طرف سفر کیا ـــــ صحابہؓ اور کبار تابعینؒ کے عہد کے بعد علماء نے تفسیر کی کتابیں تصنیف کرنا شروع کر دی تھیں، مگر ان کا انداز ایک سا ہی ہوتا تھا۔ وہ ایک آیت بیان کرتے تھے اور اس کی تفسیر میں صحابہؓ اور تابعینؒ سے جو کچھ نقل کیا جاتا تھا اُسے سند کے ساتھ بیان کرتے تھے، جیسے تفسیر سفیان ابن عیینہ تفسیر وکیع ابن الجراح، تفسیر عبدالرزاق وغیرہ۔ ہم تک یہ تفسیریں نہیں پہنچ سکیں۔ ہم تک وہ تفسیریں پہنچی ہیں جو اس طبقہ کے بعد لوگوں نے تصنیف کیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور ابن جریر طبریؒ کی تفسیر ہے ـــــ

اس کے بعد یہ بھی واضح رہے کہ قرآن کریم کی تفسیر ہر زمانہ میں اپنے دَور کی علمی حرکت سے متاثر ہوتی رہی ہے۔ ہر زمانہ کی تفسیریں ان علمی آراء و نظریات اور مذہب دینیہ کا ایک عکس اور پرتو ہوتی ہیں۔ جو اس زمانہ میں رواج پذیر ہوتے تھے، ابن عباسؓ سے لے کر استاد شیخ محمد عبدہٗ تک یہی چیز آپ کو نظر آئے گی۔ حتیٰ کہ اگر آپ کسی خاص زمانہ میں تالیف شدہ تمام تفسیروں کو جمع کر لیں تو ان سے آپ اس علمی حرکت کی مقدار وضاحت کے ساتھ تعین کر سکتے ہیں، جو اس زمانہ میں شائع اور مقبول تھیں اور اُن کا بھی جو غیر مقبول تھیں ـــــ

اگر آپ ان تفسیری روایات کو تلاش کریں جو صحابہؓ اور تابعینؒ کے صدرِ اوّل کے لوگوں سے نقل کی جاتی تھیں تو آپ ان میں دیکھیں گے کہ وہ حضرات کسی آیت کی تفسیر میں مختصر الفاظ میں محض لغوی معنی کی توضیح پر اکتفا کرتے تھے جو انہوں نے آیت سے سمجھے ہیں۔ مثلاً غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ کی تفسیر میں وہ کہیں گے "کسی معصیت سے تعرض نہ کرنے والے"۔ اور مثلاً حق تعالیٰ کے اس ارشاد: وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ "کی تفسیر میں وہ بیان کریں گے کہ زمانۂ جاہلیت میں جب کوئی سفر میں باہر جانے کا ارادہ کرتا تو ایک تیر لیتا اور کہتا کہ یہ تیر تو سفر کرنے کا حکم دیتا ہے، اگر یہ تیر نکل آیا تو میرا سفر میں جانا ٹھیک ہے اور مجھے بھلائی حاصل ہوگی۔ اور ایک دوسرا تیر لیتا اور کہتا کہ یہ تیر سفر نہ کرنے کا حکم دیتا، اگر یہ تیر نکل آیا تو مجھے سفر میں کوئی بھلائی نہیں ملے گی اور ایک تیر سادہ لے لیتا جس پر کوئی نشان نہیں ہوتا تھا، حق تعالیٰ نے اس آیت میں اس فعل سے منع فرمایا ہے"۔ اگر وہ اس کے ساتھ کچھ اور بھی بیان کرنا چاہتے تو آیت کا سبب نزول بیان کر دیتے تھے لیکن بعد کے مصنّفین اور راویوں نے اس میں بڑی وسعت پیدا کر لی تھی، چنانچہ بے تکان یہود و نصاریٰ کی روایات بیان کی جانے لگی تھیں۔ لیکن اُس دَور میں بھی تفسیر میں ان لوگوں کی جانب سے آپ کو کہیں فقہی مسئلہ کے علمی استنباط کا نشان تک بھی نہیں ملے گا اور وہ ہی کسی دینی مسلک کی تائید۔ لیکن اس کے بعد کے زمانہ میں جبکہ تقدیر وغیرہ کے مسائل پر بحثیں ہونے لگی تھیں، آپ دیکھیں گے کہ لوگوں کو دراصل یہ مذاہب ہی تفسیریں لکھنے پر راغب کرتے تھے ہر شخص اپنے مذہب و مسلک ـــــ جبر و اختیار وغیرہ کے مطابق تفسیریں کرنے لگا تھا پھر جب فقہی حرکت شاندار طریقہ پر شروع ہوئی تو آپ مفسّرین فقہاء کو دیکھیں گے کہ وہ آیات کو بیان کرنے لگتے ہیں تو ان سے جو فقہی احکام مستنبط ہوتے ہیں، ان کو بھی ذکر کرتے جاتے ہیں، بالکل یہی کچھ قواعد نحو، قواعد بلاغت اور قواعد اخلاق کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے

چند تفسیری مباحث

① تفسیر قرآن میں اختلاف کے اسباب

علامہ ابنِ تیمیہ اصولِ تفسیر میں فرماتے ہیں :-----

"سب سے پہلے یہ معلوم کرلینا ضروری ہے کہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے اصحاب کو قرآن کے معانی و مطالب کی تعلیم دی جس طرح آپؐ نے اُن تک اس (قرآن) کے الفاظ پہنچائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے قول لتبیّن للناس ما نزل الیھم میں الفاظ و مُراد دونوں شامل ہیں۔ چنانچہ ابوعبدالرحمٰن السلمی کہا کرتے کہ جن صحابہؓ نے ہمیں قرآن کی تعلیم دی ہے مثلاً عثمان بن عفانؓ اور عبداللہ بن مسعود وغیرہ، وہ (صحابہ) فرمایا کرتے کہ جب نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم سے دس آیتیں سیکھ لیتے، تو جب تک وہ ان آیتوں کا علم و عمل مکمّل نہ کرلیتے اُس وقت تک آگے نہ بڑھتے، اس کے بعد ابوعبدالرحمٰن کہتے کہ اسی طرح (صحابہؓ سے) ہم نے بھی قرآن اور علم و عمل سب سیکھا ہے ——

پھر کون نہیں جانتا کہ ہر کلام سے مقصود اس کے معانی کا سمجھنا ہوتا ہے نہ کہ اس کے صرف الفاظ کا سُن لینا، پس قرآن تو سب سے بڑھ کر اس بات کا مستحق ہے کہ اس کے معانی و مطالب سمجھے جائیں، نیز الفاظ کے سُن لینے پر اکتفا کرنا عادت کے بھی خلاف ہے مثلاً طب اور حساب وغیرہ کی کوئی کتاب پڑھی جائے تو کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ لوگ اُس کی شرح و تفہیم نہ چاہتے ہوں، تو اللہ کی اُس کتاب کے ساتھ محض الفاظ ---------- کے سُن لینے یا طوطے کی طرح رَٹ لینے کا طرزِ عمل کس طرح رَوا ہوسکتا ہے، جو مسلمانوں کے لئے (خسران و نامرادی سے بچنے کی گویا) ڈھال ہے جس کے ساتھ ان کی سعادت و نجات وابستہ ہے اور جس پر ان کے دین و دُنیا کے قیام کا دارو مدار ہے ——

صحابہؓ کے درمیان تفسیرِ قرآن کے باب میں بہت کم اختلاف تھا، اور وہ اگرچہ تابعینؒ میں بہ نسبت صحابہؓ کے زیادہ تھا، مگر ان کے بعد والوں کے لحاظ سے پھر بھی کم ہی تھا اور زمانہ جتنا بہتر ہوگا، اتفاق و یک جہتی اور علم و بیان کی کثرت رہے گی —— بہت سے تابعین وہ ہیں جنہوں نے صحابہؓ سے پوری تفسیر حاصل کی، جیسا کہ مجاہد (متوفی ۱۰۳ھ) کا بیان ہے کہ میں نے ابن عباسؓ پر مصحف (قرآن) پیش کیا، ہر آیت پر اُن کو ٹھہراتا تھا اور اس آیت سے متعلق اُن سے پوچھتا تھا، اسی لیے امام ثوریؒ نے فرمایا ہے، کہ جب تم کو مجاہد کے ذریعہ تفسیر پہنچے تو وہ تمہارے لئے کافی ہے اور اسی لئے ان کی تفسیر پر امام شافعیؒ اور بخاری وغیرہ اہلِ علم اعتماد کرتے ہیں اور اسی طرح امام احمدؒ وغیرہ، جنہوں نے تفسیر میں کتاب تصنیف کی ہے، وہ دوسرے طریقوں کی بہ نسبت مجاہد سے زیادہ اخذ کرتے ہیں ——

غرض، تابعین نے صحابہ سے تفسیر بھی حاصل کی، جس طرح انہوں نے ان سے علمِ سُنت حاصل کیا اگرچہ وہ اس

(صحابہ سے حاصل کردہ تفسیر) میں کہیں کہیں اپنے طور پر استنباط و استدلال سے بھی کام لیتے ہیں ــــــ

ہاں، تو کہنا یہ ہے کہ سلف کے درمیان تفسیر میں کم اختلاف ہے اور اختلاف سے زیادہ احکام میں اختلاف ہے، اور تفسیر میں ان کے مابین جس قسم کے اختلاف کا ثبوت ملتا ہے، وہ زیادہ تر متنوع کا اختلاف ہے نہ کہ تضاد کا۔ اور اس اختلاف کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ تعبیر کے معاملہ میں ایک نے جو عبارت اختیار کی وہ مُسمّیٰ کے ایسے گوشۂ مفہوم پر دلالت کرتی ہے جو مختلف ہے دوسرے کے اس گوشۂ مفہوم سے جس پر دوسرے کی عبارت دلالت کر رہی ہو لیکن اس کے باوجود مسمّیٰ کا اتحاد ہے۔ جیسے وہ اسماء، جو مترادف ہونے کے باوجود مختلف صفات پر دلالت کرنے کی بنا پر مختلف بھی ہیں، مثلاً سیف اور صارم اور مہند کہ ان سب کا مسمّیٰ تو تلوار ہی ہے۔ مگر تلوار کی مختلف صفتوں کو بتانے کے لیے یہ مختلف اسماء ہیں۔ یہی صورتِ حال اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف اسمائے گرامی اور قرآن کے مختلف اسماء کا ہے۔ اور دوسری قسم یہ ہے کہ ہر مفسر نے اسمِ عام کی بعض انواع کو بطورِ تمثیل ذکر کر دیا اور اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس طرح مخاطب پوری نوع کو سمجھ لے گا نہ یہ کہ اس کی جامع و مانع تعریف مدِ نظر ہوتی ہے۔ جیسے کوئی عجمی لفظ خبز (روٹی) کی بابت پوچھے تو اس کو ایک روٹی دکھا کر کہا جائے کہ یہ خبز ہے، اس سے مقصود اسے روٹی کی نوع بتانا ہوتا ہے نہ کہ ہاتھ میں اٹھائی ہوئی وہ خاص روٹی۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے۔ کہ ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا فمنھم ظالم لنفسہ ومنھم مقتصد ومنھم سابق بالخیرات [1]

تو کھلی ہوئی بات ہے کہ ظالم لنفسہ (اپنے نفس پر ظلم کرنے والا) وہ ہے جو واجبات کو ضائع کرنے والا اور محرمات کا ارتکاب کرنے والا ہے، اور مقتصد (میانہ روی اختیار کرنے والا) وہ ہے جو واجبات کو ادا کرے اور محرمات سے احتراز کرے اور سابق بالخیرات (نیکیوں میں زیادہ سے زیادہ حصّہ لینے والا) میں ہر وہ شخص داخل ہوتا ہے جو صرف واجبات پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ نوافل کی حیثیت رکھنے والی حسنات کے ذریعہ خدا کا قرب حاصل کرتا ہے ــــــ

پس مقتصد تو اصحابِ یمین ہیں اور سابق وہ ہیں جو والسابقون السابقون اولٰئک المقربون۔ (٥٦/١١) کے مصداق ہیں۔ اب ہر مفسر سمجھانے کے لیے عبادات کی کسی ایک نوع کو اختیار کر لیتا ہے، مثلاً کوئی یہ کہتا ہے کہ سابق وہ ہے جو اوّل وقت نماز پڑھے اور مقتصد وہ ہے جو عصر کو آفتاب کے بالکل زرد ہو جانے تک ٹالتا رہے [2]"

پھر علامہ ابن تیمیہ آگے چل کر اپنی کتاب کے ص ١٣ پر فرماتے ہیں کہ: ــــــ

" تفسیر میں اختلاف دو قسم کا ہے۔ بعض تو وہ ہیں جن کا مدار صرف نقل پر ہے اور بعض وہ ہیں جن کا علم نقل کے بغیر

---

[1] پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کا وارث ٹھہرایا جن کو اپنے بندوں میں سے برگزیدہ کیا تو کچھ لوگ تو ان میں سے اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں اور کچھ میانہ رو ہیں اور کچھ نیکیوں میں آگے بڑھ جانے والے ہیں .... (فاطر۔٣٢)

[2] اور جو کوئی یہ کہتا ہے کہ وہ سابق ہے جو زکوٰۃ کے علاوہ بھی انفاق فی سبیل اللہ میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتا ہے، اور مقتصد وہ ہے جو پابندی کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرتا رہتا ہے اور اسی پر اکتفا کرتا ہے اور ظالم لنفسہ وہ ہے جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتا ظاہر ہے کہ یہ تفسیریں بطور تمثیل ہیں، ان سے مقصود یہ نہیں کہ نماز یا زکوٰۃ ہی میں سابق، مقتصد اور ظالم لنفسہ کی تقسیم محدود ہے۔ سارے حقوق اللہ اور سارے حقوق العباد کے لحاظ سے سابق، مقتصد اور ظالم لنفسہ کی یہ تقسیم ہے۔ نماز یا زکوٰۃ کا تذکرہ محض سمجھانے کے لئے بطور مثال ہے (مترجم)

حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ علم کا سرچشمہ یا تو مستند نقل ہوتا ہے یا تحقیق شُدہ استدلال — اور منقول یا تو رسولِ معصوم سے ہوگا یا کسی غیر معصوم سے ——

تو قسم اوّل (منقولات) سے متعلق یا تو اس کے صحیح اور ضعیف ہونے کی معرفت ممکن ہوگی یا ممکن نہ ہوگی، اور منقول کی یہ دوسری قسم یعنی جس کی تصدیق کا کوئی یقینی ذریعہ ہمارے پاس موجود نہیں، تو اس پر گفتگو اور بحث بے فائدہ اور فضول ہے، کیونکہ ایک مسلمان کے لئے جس کا جاننا ضروری ہے، وہ ایسی چیز نہیں جو بے دلیل ہو یا جس کی صحت معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ ہو بلکہ اس کے حق ہونے پر اللہ کی طرف سے دلیل قائم ہو چکی ہے ——

ایسی بے فائدہ چیز جس کی صحت پر کوئی دلیل نہیں ہے اور اس کے باوجود اُسے موضوعِ بحث بنایا گیا ہے، اس کی مثال مفسرین کا وہ اختلاف ہے جو اصحابِ کہف کے حالات کے بارے میں ہے، یا یہ اختلاف کہ حضرت موسیٰؑ نے مذبوح گائے کے کس حصّہ کو مقتول کے جسم پر مارا تھا یا حضرت نوحؑ کی کشتی کی لمبائی اور چوڑائی کے باب میں اختلاف اور یہ کہ اس کشتی کے تختے کس درخت کے تھے، یا اس لڑکے کے نام کے بارے میں اختلاف جس کو خضر نے قتل کیا تھا۔ وغیر ذلک ——

کھُلی ہوئی بات یہ ہے کہ یہ اور ان جیسے امور کے علم کا ذریعہ نقل ہی ہے، تو جو نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم سے صحیح طور سے منقول ہوگا اور جو معلوم ہے، وہ قابلِ قبول ہوگا جیسے یہ کہ حضرت موسیٰؑ کے رفیقِ سفر کا نام خضر تھا لیکن جو ایسا نہ ہوگا بلکہ اہلِ کتاب سے ماخوذ ہوگا جیسے کعبؒ اور وہبؒ اور محمّد بن اسحاق وغیرھم کی منقولات ——

اسی طرح جو باتیں تابعین سے منقول ہیں، اگرچہ انہوں نے اس کا ذکر نہ کیا ہو کہ انہوں نے اہلِ کتاب سے لیا ہے اور جب تابعینؒ باہم اختلاف کریں تو بعض کا قول بعض پر حجت نہ ہوگا، لیکن اس بارے میں اگر صحابہؓ سے صحت کے ساتھ کچھ منقول ہو تو وہ کسی تابعی سے منقول ہونے کی بہ نسبت زیادہ قابلِ اطمینان ہوتا ہے، کیونکہ اس میں اس بات کا احتمال ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے سُنا ہو یا ایسے کسی شخص سے سُنا ہو جس پر انہیں پُورا اعتماد ہو کہ اس نے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم سے یقیناً سُنا ہوگا۔

رہیں قسمِ اوّل کی وہ منقولات، جن کی صحت کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے، تو بحمد اللہ کہ وہ اتنی موجود ہیں جتنے کی ہمیں حاجت ہے غرض، تفسیر و حدیث اور غزوات میں بہت سے ایسے امور ملتے ہیں جو ہمارے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم اور دیگر انبیاء صلوات اللہ علیہم اجمعین کی طرف منسوب ہیں لیکن نقلِ صحیح سے ان کا رَدّ بھی کیا جا سکتا ہے، اگرچہ یہ انہی منقولات میں ملی جُلی موجود ہیں جن کا مستند نقل ہے اور جس کے بارے میں نقل کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی صحیح صورتِ حال کا پتہ چلایا جا سکتا ہے ——

اب رہ جاتا ہے اختلافِ تفسیر کے اسباب میں سے دوسری قسم کا سبب، یعنی وہ جس میں ذریعۂ علم استدلال ہوتا ہے نہ کہ نقل۔ تو اس میں زیادہ تر غلطیاں دو جہتوں سے ہوئی ہیں اور صحابہؓ، تابعین اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے تبع تابعین کی تفاسیر کے بعد ہوئی ہیں کیونکہ وہ تفاسیر جن میں صرف انہی اسلاف (صحابہ، تابعین اور تبع تابعین) کا کلام ذکر کیا جاتا ہے، ان میں ان دو جہتوں کی قبیل کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ جیسے تفسیر عبدالرزاق، تفسیر وکیع، تفسیر عبد بن حمید اور تفسیر عبدالرحمٰن بن ابراہیم اور جیسے تفسیر امام احمد تفسیر اسحاق بن راہویہ، تفسیر بقی بن مخلد، تفسیر ابوبکر بن المنذر، تفسیر سفیان بن عیینہ، تفسیر السدی، تفسیر ابن جریرؒ تفسیر ابن ابی حاتم، تفسیر ابوسعید الاشج، تفسیر ابوعبداللہ بن ماجہ اور تفسیر ابن مردویہ ——

متذکرہ بالا دو جہتوں پر عمل کرتے ہوئے تفسیر کرنے والے یہ دو گروہ ہیں :——

ایک گروہ تو وہ ہے جس نے اپنے ذہن میں پہلے ہی سے ایک نظریہ قائم کر رکھا ہے، پھر قرآنی الفاظ کو کھینچ تان کر اس

پر منطبق کرتا ہے اور دوسرا گروہ وہ ہے جس نے قرآن کی تفسیر محض اس امر کے ساتھ کی جس کو ایک عربی بولنے والا مُراد لیتا ہے بغیر اس امر کا لحاظ کئے ہوئے کہ کس متکلّم کا یہ قرآن ہے اور کس پر نازل ہُوا ہے اور اس کے مخاطبین اوّل کیسے لوگ تھے۔

تو اوّل الذکر لوگوں نے تو صرف اس مطمحِ نظر کی رعایت کی جسے پہلے ہی اذہان میں جما لیا گیا تھا، بغیر یہ دیکھے ہوئے کہ قرآنی الفاظ اپنی دلالت و بیان کے اعتبار سے اُس نظریہ کے متحمل بھی ہو سکتے ہیں یا نہیں جسے انھوں نے ذہنوں میں قائم کر رکھا ہے اور دوسرے حضرات نے محض الفاظ کی رعایت کی اور صرف یہ پیشِ نظر رکھا کہ اس سے ایک عَرب کیا مُراد لیتا ہے بغیر یہ لحاظ کئے ہوئے کہ قرآن کے متکلّم کا مقصد اور سیاق کلام کیا ہے ـــــ

پھر ان دونوں گروہوں میں سے اگرچہ اوّل الذکر کی نظر پہلے معنی کی طرف ہوتی ہے اور ثانی الذکر کی پہلے لفظ کی طرف ہوتی ہے، تاہم یہ ثانی الذکر لوگ اکثر لغوی طور پر لفظ کو اس معنی پر محمول کرنے میں ویسی ہی غلطی کر جاتے ہیں جیسی غلطی اس میں اوّل الذکر حضرات سے سرزد ہوتی ہے، اوّل الذکر حضرات اس معنی کی صحت میں جس کے ساتھ انھوں نے قرآن کی تفسیر کی ہے، ویسی ہی غلطی کر بیٹھتے ہیں جیسی غلطی ثانی الذکر گروہ نے کی ہوتی ہے ـــــ

پہلے گروہ والے دو طرح کے لوگ ہیں کبھی تو وہ قرآنی الفاظ سے اس کے وہ مدلول و مُراد سلب کر لیتے ہیں جو اُس کے مدلول و مُراد ہیں اور کبھی وہ قرآنی الفاظ کو ایسے معنی پر محمول کرتے ہیں جس پر نہ لفظ کی دلالت ہوتی ہے اور نہ وہ مُراد لیا جا سکتا ہے اور دونوں حالتوں میں کبھی وہ معنی سرے سے باطل ہوتا ہے جسے نفی کی صورت میں یا اثبات کی صورت میں انھوں نے مُراد لیا ہے تو وہ اس صورت میں دلیل اور مدلول دونوں میں وہ غلط کار ہُوا کرتے ہیں اور کبھی وہ معنی سرے سے باطل تو نہیں، بلکہ حق ہی ہوتا ہے اور ایسی صورت میں غلطی مدلول میں چاہے نہ ہو، مگر دلیل میں وہ بر سرِ غلط ہوتے ہیں ـــــ

پس جن لوگوں نے دلیل اور مدلول دونوں میں ٹھوکر کھائی ہے، مثلاً اہلِ بدعت کا گروہ تو انھوں نے ایک ایسا مسلک اختیار کر رکھا ہے جو اُس کے حق میں منافی ہے جس پر اُمّتِ وسط فائز ہے، جو گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی، جیسا کہ ائمۂ سلف اور اُن کے ائمہ ہیں ـــــ ان اہلِ بدع نے قرآن کو اپنا تختۂ مشق اس طرح بنایا کہ وہ اپنے نظریات کے مطابق کھینچ تان کر قرآن کی تاویل کرتے ہیں اور اس باب میں کبھی تو اپنے مسلک کی تائید کے لئے آیات سے اس قدر دور از کار استدلال کرتے ہیں کہ وہ (آیات) اس کی متحمل نہیں ہوتیں اور کبھی ایسا کرتے ہیں کہ اپنے مسلک کے خلاف پڑنے والی آیات میں ایسی تاویل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے جو تحریف کے شمار میں آتی ہے ـــــ

غرض، مقصود یہ ہے کہ تفسیرِ قرآن کے باب میں ان (اہلِ بدع) کی روِش یہ ہے کہ انھوں نے ذہنوں میں جو ایک خود ساختہ رائے پہلے ہی سے جما رکھی ہے۔ قرآن کو اس پر چسپاں کرتے چلے گئے، حالانکہ نہ ان کی رائے کی موافقت میں اور نہ ان کی تفسیر کی تائید میں صحابہؓ یا تابعینؒ یا ائمۂ مسلمین سے کوئی دلیل فراہم ہوتی ہے اور ان کی تفاسیرِ باطلہ میں سے کوئی ایسی تفسیر نہیں جس کا بطلان بہت سی وجوہ سے ظاہر نہ ہوتا ہو ـــــ

ان تفاسیر کے بطلان کے ظاہر ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ان کی بیان کی ہوئی تفسیر کے غلط ہونے کا علم حاصل ہو جائے اور دوسری یہ کہ ان کی تفسیر یا تو اپنے باطل مسلک پر دلیل بنتی ہو یا مدِ مقابل کے جواب میں بیان کی گئی ہو ـــــ پھر ان میں سے بعض ایسے ہیں جو عبارت آرائی میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں اور بڑی فصیح عبارت لکھتے ہیں، مگر ساتھ ہی ساتھ اپنے باطل عقائد کو اپنی تحریر میں اس طرح چھپا دیتے ہیں کہ اکثر لوگ اس زہر کو نہیں معلوم کر سکتے۔ ۱؎ ـــــ (حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں) ـــــ

پھر علامہ ابنِ تیمیہ کہتے ہیں کہ :—

" فلاسفہ، قرامطہ اور رافضیوں کا معاملہ تو اور زیادہ بڑھ گیا ہے، کیونکہ انہوں نے ایسے عجیب وغریب طریقوں سے قرآن کی تفسیر کی ہے کہ ناطقہ سر بگریباں ہے، اسے کیا کہیئے، مثلاً تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ[1] سے متعلق رافضیت کا یہ تفسیری شاہکار کہ اس (دونوں ہاتھ) سے مُراد ابوبکرؓ وعمرؓ ہیں —"

حاصل کلام یہ ہے کہ صحابہؓ وتابعینؒ کے مذاہب اور ان کی تفسیر سے تجاوز کرکے اس کے مخالف کو جو اختیار کرتا ہے. تو اس بارہ میں وہ خطاکار اور بدعتی سمجھا جائے گا، اگرچہ وہ اجتہاد کی راہ سے ایسا کرتا ہے، اور غلط اجتہاد اگرچہ عنداللہ قابلِ معافی ہوتا ہے، لیکن یہاں مقصود تو بتانا ہے کہ علم کے طریقے اور اس کے دلائل اور صواب کی روش کیا ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن کو صحابہؓ اور تابعین اور ان کے تابعین نے پڑھا تھا اور یہ کہ اس کی تفسیر اور اس کے معانی کو کس طرح سب سے زیادہ جانتے تھے جس طرح وہ اس حق کو سب سے بڑھ کر جانتے تھے جسے دے کر اللہ نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مبعوث فرمایا تھا، لہٰذا جو شخص ان کے قول کی مخالفت کرتا ہے اور ان کی تفسیر قرآن کے علی الرغم تفسیر کرتا ہے تو وہ دلیل اور مدلول سب میں غلطی کا ارتکاب کرتا ہے[2]۔

رہے وہ لوگ جن سے مدلول میں نہیں بلکہ دلیل میں غلطی ہوئی، تو ان کی مثالیں صوفیاء اور واعظین اور فقہاء وغیرہم میں بہت ہیں کہ ان کی تفسیر قرآن معانی پر مشتمل ہونے کے باوجود ایسی ہوتی ہے کہ قرآنی الفاظ ان معانی پر دلالت نہیں کرتے، جن کی بکثرت مثالیں ابوعبدالرحمٰن سلمی کی "حقائق التفسیر" میں ملتی ہیں۔ اور جب یہ لوگ اپنی تفسیر میں غلط معانی بھی بیان کرتے ہیں تو پھر وہ قسم اوّل کے لوگوں میں داخل ہوجاتے ہیں، یعنی وہ جو دلیل اور مدلول دونوں میں غلط کار ہیں، کیونکہ جو معنی ان کے مدِنظر ہوتے ہیں وہ سرے سے فاسد ہوتے ہیں —"

(۲) — اصولِ تفسیر

پھر علامہ ابنِ تیمیہؒ اپنی مذکورہ کتاب میں تفسیر کے صحیح طریقے کی جانب اس طرح رہنمائی کرتے ہیں کہ :—

" تفسیر کے لئے بہترین طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کی جائے، کیونکہ قرآن میں اکثر وبیشتر یہ بات ہے کہ اگر ایک جگہ اجمال سے کام لیا ہے تو دوسری جگہ اس کی تفصیل کردی گئی ہے اور کہیں ابہام ہے تو دوسری جگہ اس کی تشریح وتوضیح مل جاتی ہے اور اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو پھر سُنّت کی طرف رجوع کرو کیونکہ وہ قرآن کی شرح اور اس کی وضاحت کرتی ہے بلکہ امام شافعیؒ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیا ہُوا ہر حُکم قرآن کی تفسیر میں شامل ہے۔

اور جب تفسیر نہ قرآن میں ملے اور نہ سُنّت میں تو پھر ہمیں اقوالِ صحابہؓ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے کیونکہ وہی قرآن کی زندہ

---

[1] (حاشیہ گذشتہ صفحہ) اس دَور میں پرویزی کا اندازِ تحریر ایسا ہے کہ وہ ادبی اسلوب میں سب کچھ کہہ جاتا ہے، ہمارے وہ نوجوان جن پر مغربی افکار کا غلبہ ہے ایسی اَدبی تحریروں سے اپنے ایمان کو برباد کرتے رہتے ہیں۔ (اسدی)۔ [2] ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹیں۔

[3] صرف دلیل میں غلطی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ معنی ومضمون (تفسیر) تو اپنی جگہ صحیح ہے لیکن قرآن کے الفاظ اس پر دلالت نہیں کرتے اور دلیل ومدلول دونوں میں غلطی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مفہوم بذات خود بھی ہے اور قرآن کے الفاظ بھی اس پر دلالت نہیں کرتے —

— (مترجم)

تفسیر (رسولؐ کی زندگی) کے عینی شاہد ہیں اور ان احوال وظروف اور اسباب سے بخوبی واقف تھے، جن میں قرآن کا نزول ہوا ہے نیز فہم تام کے مالک اور علم صحیح کے حامل تھے، خصوصاً اُن کے علماء واکابر مثلاً ائمہ اربعہ، یعنی خلفائے راشدین اور ہدایت یافتہ ائمہ جیسے عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ ——— ابن جریر طبری نے اپنی اسناد سے روایت کیا ہے کہ "عبداللہ بن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے کہ اُس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، کہ کوئی آیت کتاب اللہ کی ایسی نازل نہیں ہوئی ہے جس کے متعلق مجھے علم نہ ہو کہ کس کے بارے میں نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی اور اگر میں کسی ایسے شخص سے واقف ہوتا جو مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کا عالم ہوتا اور اس کے پاس پہنچنے کے لیے سواری پر جایا جا سکتا تو میں ضرور اس کے پاس جاتا ——— نیز ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ہم میں سے جب کوئی شخص دس آیتیں سیکھ جاتا تو آگے نہیں بڑھتا تھا تاوقتیکہ ان کے معانی نہ جان لیتا اور اس پر عمل نہ کر لیتا" اور انہی ہدایت یافتہ ائمہ میں سے حبر الامۃ عبداللہ بن عباسؓ ہیں۔ چنانچہ ابن مسعودؓ فرمایا کرتے کہ "ابن عباسؓ کیا ہی خوب ترجمان القرآن ہیں"۔

رہی یہ صورت کہ تفسیر نہ قرآن میں ملے، نہ سنت میں اور نہ اقوال صحابہؓ میں، تو ایسی حالت میں اکثر ائمہ نے اقوال تابعینؒ کی طرف رجوع کیا ہے۔ مثلاً مجاہد بن جبیر کی طرف، چنانچہ محمد بن اسحاق نے اپنی اسناد سے روایت کیا ہے کہ مجاہد کہا کرتے کہ میں نے مصحفِ قرآن کا از ابتداء تا انتہا تین مرتبہ ابن عباسؓ سے اس طرح دور کیا ہے کہ ہر آیت پر انہیں ٹھہراتا اور اس کی بابت تشریح وتفسیر پوچھتا

اسی طرح دوسرے تابعین ہیں مثلاً سعید بن جبیرؒ، عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ، عطاء بن ابی رباح، حسن بصری (متوفی ۱۱۰ھ) مسروق بن الاجدع (متوفی ۶۳ھ) سعید بن المسیب، ابو العالیہ (متوفی ۹۰ھ) ربیع بن انس (متوفی ۱۳۹ھ) قتادہ اور ضحاک بن مزاحم (متوفی ۱۰۵ھ) وغیرہم اور ان کے تبع تابعین کے علماء تفسیر۔ کہ یہ وہ جلیل القدر علماء ہیں جن کے اقوال آیت کی تفسیر میں نقل کیے جاتے ہیں، لیکن مختلف الفاظ پر مشتمل ان کی عبارتیں دیکھ کر بے علم لوگ اس وہم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کا آپس میں اختلاف ہے۔ اس بناء پر ان اقوال کو اختلافات کا رنگ دے کر نقل کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے، کیونکہ کوئی تو چیز کے لازم یا نظیر کو بیان کرتا ہے اور کوئی بعینہٖ اس چیز کو۔ اس طرح الفاظ تو مختلف ہوتے ہیں مگر سب کا مرجع ایک ہی معنی ہوتا ہے جسے جدا جدا لفظوں میں ظاہر کیا گیا ہوتا ہے، لہٰذا عاقل اور فہیم وہ ہے جو اسے اچھی طرح سمجھ لے اور خیال رکھے ——— لیکن محض رائے سے خود ساختہ تفسیر کرنا حرام ہے، چنانچہ عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو شخص بغیر علم کے قرآن میں گفتگو کرتا ہے وہ اپنے لیے جہنم میں ٹھکانا بنالے"۔ اور اسی لیے سلف کی ایک جماعت ایسی تفسیر سے قطعاً گریز کرتی ہے جس کا انہیں علم نہیں ہوتا تھا ———

لیکن جس شخص کو لغت اور شرع کا اچھی طرح علم ہو، اور وہ تفسیر کے باب میں گفتگو کرتا ہے، تو ایسے شخص کے لیے کوئی مضائقہ نہیں ہے ---------- یہی وجہ ہے کہ سلف کی اسی مذکورہ جماعت سے تفسیری اقوال بھی روایت کیے گئے ہیں اور دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، اس لیے کہ وہ انہی امور میں بولتے تھے، جنہیں وہ جانتے تھے، اور جس کا انہیں علم نہیں ہوتا تھا اس کی بابت سکوت اختیار کرتے اور ایسا ہی طرزِ عمل ہر شخص پر واجب ہے۔"

تفسیر بالروایات میں محدثین کا تساہل

تفسیر میں جو روایتیں ہیں ان کے متعلق ائمہ حدیث کی شہادت ہے کہ وہ بالعموم ضعیف بلکہ موضوع ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جو امیر المؤمنین فی الحدیث کہے جاتے ہیں، ان کا قول ہے کہ :—

"تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں —— ملاحم، مغازی اور تفسیر۔ (اتقان)

عام خیال یہ ہے کہ "صحاح ستہ" میں جو روایات ابواب التفسیر میں آئی ہیں وہ صحیح ہیں مگر ان پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ بھی امام موصوف کے اس قول سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ چنانچہ صحاح ستہ سے تفسیر بالروایات کی چند مثالیں نکال کر پیش کی جاتی ہیں۔ جن میں سے کچھ تو خود قرآن کے مخالف ہیں، کچھ دوسری حدیثوں سے متعارض اور بعض علم و عقل کے خلاف، جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تفسیریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہرگز نہیں ہو سکتیں ——

(۱) وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ۔ قَالَ بَلٰی وَلٰكِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ (۲/۲۶۰)

اور جب کہا ابراہیمؑ نے اے میرے رب! مجھے دکھلا دے کہ تو کس طرح مُردوں کو زندہ کرتا ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ کیا تو ایمان نہیں لایا ہے۔ ابراہیمؑ نے کہا کہ بیشک (میں ایمان لایا ہوں) لیکن چاہتا ہوں کہ میرا دل مطمئن ہو جائے ——

اس کی تفسیر میں حضرت ابوہریرہؓ سے صحیح بخاری میں یہ روایت درج کی گئی ہے کہ: ——

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم ابراہیمؑ سے زیادہ شک کرنے کا حق رکھتے ہیں جبکہ انہوں نے کہا کہ 'اے رب مجھے دکھلا دے تو کس طرح مُردوں کو زندہ کرتا ہے' ——"

یہ روایت قرآن کے بھی خلاف ہے اور عقل کے بھی، کیونکہ قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کے ایمان کی تصریح کر دی اور وہ بھی بَلٰی کے لفظ کے ساتھ، یعنی بے شک میں مؤمن ہوں اور ایمان نام ہے علم الیقین کا جس میں کوئی شائبہ شک کا نہ ہو ——

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا —— (۴۹/۱۵)

مؤمن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انہوں نے شک نہ کیا ——

چہ جائے کہ حضرت ابراہیمؑ جیسے اولوالعزم رسول کا ایمان اللہ کے مُردوں کے زندہ کرنے پر جو بادشاہ سے اسی مسئلہ پر بحث کر چکے تھے جس کا ذکر اس سے پیشتر کی آیات میں ہے، ان کو اس کے اُوپر علم الیقین اور ایمان کامل حاصل تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ صرف اطمینان اور عین الیقین، نہ کہ کسی شک کا ازالہ، مگر یہ روایت ظاہر کرتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو شک تھا ——

(۲) وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی تِسْعَ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ (۱۷/۱۰۱) اور ہم نے موسیٰؑ کو نو کھلی ہوئی نشانیاں دیں۔

اس کی تفسیر روایت کے ساتھ اس طرح کی گئی ہے :——

"ایک دفعہ آنحضرتؐ تشریف فرما تھے، سامنے سے دو یہودی گزرے، ایک نے دوسرے سے کہا کہ چلو اس پیغمبر سے

کچھ سوال کریں۔ دوسرے نے کہا کہ پیغمبر نہ کہو، سُن لے گا تو اس کی چار آنکھیں ہوجائیں گی (یعنی خوش ہوگا) اس کے بعد وہ آپ کی خدمت میں آئے اور دریافت کیا کہ موسیٰ کو نو آیتیں کون سی دی گئی تھیں؟ آپ نے فرمایا وہ یہ ہیں کسی کو خدا کا شریک نہ بناؤ، زنا نہ کرو، کسی بے گناہ کو قتل نہ کرو چوری نہ کرو، جادو نہ کرو، کسی حاکم کے پاس بے جرم کی چغلی نہ کھاؤ۔ سود نہ کھاؤ، کسی پاک دامن پر تہمت نہ لگاؤ اور میدانِ جہاد سے نہ بھاگو (اس نویں حکم میں راوی کو شک ہے) اور خاص تمہارے لئے اے یہود! دسواں حکم یہ ہے کہ سبت کے دن زیادتی نہ کرو، یہ سُن کر دونوں یہودیوں نے آپ کے دست و پا کو بوسہ دیا ——— (یہ حدیث جامع ترمذی، مسند امام احمد، نسائی ابن ماجہ اور ابن جریر میں ہے) ———

حضرت موسیٰؑ کے تسع آیات کی تفسیر توریت کے احکام تسعہ کے ساتھ جو اس حدیث میں کی گئی ہے اور جس کو امام ترمذیؒ نے "حسن صحیح" کہا ہے نہ صرف یہ کہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ قرآن کی رُو سے اس کا صحیح ہونا ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ یہ نو نشانیاں حضرت موسیٰؑ کو اس وقت ملی تھیں جب مدین سے مصر جاتے ہوئے اللہ نے ان کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا اور اس وقت تک نہ تورات نازل ہوئی تھی اور نہ اس کے احکام عشرہ تھے۔ ان دونوں باتوں کی تصریح قرآن میں موجود ہے۔ سورہ نمل میں ہے: ———

فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ (۲۷/۱۲) ——— نو نشانیاں لے کر فرعون اور اس کی قوم کی طرف ———

پھر سورۂ اعراف میں حضرت موسیٰؑ کا قصہ تفصیل کے ساتھ بیان کرکے ان نشانیوں کو گنا دیا ہے، یعنی عصا، ید بیضا، قحط، نقص ثمر، طوفان، ٹڈی، جوں، مینڈک اور خون ———

اس کے مدتوں بعد حضرت موسیٰ اللہ کے حکم سے بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر نکلتے ہیں۔ فرعون معہ اپنے لشکر کے ان کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں غرق ہوتا ہے اور حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو لئے ہوئے کوہِ طور کی طرف آتے ہیں۔ وہاں اللہ ان کو میقات پر بُلاتا ہے اور بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے تورات عطا کرتا ہے ———

یٰمُوْسٰۤی اِنِّی اصْطَفَیْتُكَ عَلَی النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَبِكَلَامِیْ فَخُذْ مَاۤ اٰتَیْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِی الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِیْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ (۷/۱۴۴، ۱۴۵)	اے موسیٰ! میں نے تجھ کو اپنے پیغامات اور ہمکلامی کیلئے لوگوں پر چُن لیا، سو جو کچھ میں تجھ کو دیتا ہوں لے اور شکر کر اور ہم نے اس کے لئے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر شے کی تفصیل لکھ دی ———

علاوہ بریں اس روایت میں سود نہ کھاؤ، جادو نہ کرو، میدانِ جہاد سے نہ بھاگو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے احکام عشرہ میں سے گنائے گئے ہیں، حالانکہ ان تینوں میں سے ایک بھی ان میں سے نہیں ہے، احکام عشرہ یہ ہیں:-

میرے آگے تیرا کوئی دوسرا خدا نہ ہو، تو خداوند اپنے خدا کا نام بے سبب نہ لے (جھوٹی قسم نہ کھا) سبت کے دن کو یاد رکھ، اپنے باپ اور ماں کو عزت دے، خون نہ کر، زنا نہ کر، چوری نہ کر، اپنے ہمسایہ کی جورو کو مت چاہ، اپنے ہمسایہ پر جھوٹی گواہی نہ دے، اپنے ہمسایہ کے کسی مال کا لالچ نہ کر ——— (تورات سفر استثنا ۵-۶)

۴ ——— بدقسمتی سے مسلمانوں میں عہدِ صحابہؓ ہی میں ابوبکرؓ و علیؓ کے جھگڑے پیدا ہوگئے جس کی وجہ سے اشخاص کے مناقب قرآنی آیات سے بھی نکالنے کی کوشش ہونے لگی تھی، چنانچہ بہت سی آیتوں کی تفسیر ایسی روایتوں کے ذریعہ کی گئی ہیں جن سے متعقد علیہ شخصیتوں کے فضائل ثابت ہوں۔ سورۂ حج میں ہے: ———

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ | کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں وہ اللہ ہی کو سجدہ

فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ؕ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِیْ رَبِّهِمْ (۲۲ / ۱۸-۱۹)

کرتے ہیں اور سُورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور جاندار اور بہت سے آدمی اور بہتوں پر عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے اور جس کو اللہ ذلیل کرے اس کو کوئی عزّت دینے والا نہیں۔ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ یہ دونوں فریق جنہوں نے اپنے رَبّ کے بارے میں جھگڑا کیا ہے ـــــ

آیت میں " هٰذٰنِ " کا مشارٌ الیہ موجود ہے کہ بنی نوعِ انسان میں بہت سے ایسے ہیں جو اپنے رَبّ کو سجدہ کرتے ہیں۔ اور بہت سے نہیں کرتے۔ یہ دونوں ہیں کہ ان میں باہمی نزاع رَبّ کے بارے میں ہے مگر روایت یہ کہتی ہے کہ: ـــــ

" یہ آیت جنگ بدر میں حضرت علیؓ اور حضرت حمزہؓ اور عبیدہؓ کے متعلق نازل ہوئی جو شیبہ اور عتبہ اور ولید کے مقابلے کیلئے گئے تھے"

مشکل یہ ہے کہ سورۂ حج مکّی ہے اور جنگ بدر مدینہ میں ہوئی۔ اس لئے یہ شانِ نزول کیسے ہو سکتا ہے، لیکن چونکہ یہ روایت بخاری میں ہے اس وجہ سے علّامہ جلال الدین سیوطیؒ کو " هٰذٰنِ " سے تین اور جامع البیان کو چھ آیتوں کو مدنی قرار دینا پڑا متاخرین نے تو پوری سورہ کو مدنی کہہ دیا، چنانچہ مصاحف میں مدنی ہی لکھا جاتا ہے ـــــ

اذنِ قتال سے جو اس سورہ میں مسلمانوں کو دیا گیا ہے، یہ خیال ہو سکتا تھا کہ یہ مدنی ہے۔ کیونکہ یہ اجازت مدینہ ہی میں مل سکتی تھی، مگر جامع ترمذی میں روایت ہے کہ یہ اجازت مکّہ سے نکلتے وقت ملی۔ اس لئے اس بُنیاد پر بھی اس سورہ کو مدنی کہنا صحیح نہ ہوگا بالفرض اگر یہ آیات مدنی بھی ہوں تو قرآن سے عدول کرنا جس میں " هٰذٰنِ " کا مشار الیہ مذکور ہے کس طرح جائز ہو سکتا ہے

۶- قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ؕ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ـــــ (۲۱ / ۶۲-۶۳)

بُت پرستوں نے پوچھا کہ اے ابراہیم! کیا تُو نے ہمارے بُتوں کے ساتھ یہ کیا ہے؟ (ابراہیمؑ نے) کہا بلکہ اس بڑے نے کیا ہے۔ ..... ان ٹوٹے ہوئے بُتوں) سے پوچھو اگر بول سکتے ہوں ـــــ

اس کی تفسیر میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ: ـــــ

ابراہیمؑ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا مگر تین بار، انہوں نے کہا کہ میں بیمار ہوں حالانکہ بیمار نہ تھے اور (اپنی بیوی) سارہؓ کو بہن بتایا، پھر بُتوں کو خود توڑا اور جب بُت پرستوں نے پوچھا تو کہا کہ اس بڑے بُت نے توڑا ہے "۔

یہ روایت قرآنِ کریم کے بالکل خلاف ہے کیونکہ اس میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہے ـــــ

اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا۔ (۱۹ / ۴۱) ـــــ حقیقت یہ ہے کہ وہ نہایت سچے نبی تھے۔

اللہ جس کو تحقیق کے ساتھ سچا قرار دے یہ کیسے ممکن ہے رسولِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم جو اسی کی اولاد اور اسی کی مِلّت کے پیرو تھے، اس کو کاذب کہیں؟ یہ تین کذب حضرت ابراہیمؑ کے جو بیان کئے گئے ہیں، ان میں سے حضرت سارہ کو بہن بنانے کا واقعہ قرآن میں نہیں ہے اور جس طرح پر یہ قصّہ بیان کیا جاتا ہے اس سے صاف طور پر اس کا مجعول ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ دوسرا جھوٹ کہ انہوں نے کہا کہ میں بیمار ہوں تو کیا بیماری کوئی ایسی چیز ہے جو انسان میں نادر و نایاب ہے؟ ہزار ہا قسم کی چھوٹی بڑی بیماریاں ہیں جن سے کمتر کوئی انسان خالی ہوتا ہے اگر اسوقت جبکہ مُشرک ان کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے، انہوں نے اپنی بیماری کا عُذر کیا تو اس کو کذب قرار دینے کی کیا دلیل ہے۔؟ تیسرا جھوٹ کہ انہوں نے بُتوں کو خود توڑا اور الزام لگایا بڑے بُت پر۔ تو یہ طریق معرضِ بحث میں مخالفوں کو ساکت کرنے کے لئے اختیار

کیا تھا جس سے بہتر احقاقِ حق کی اور کوئی صورت نہ تھی، چنانچہ اس کو مشروط کر کے اس طرح فرمایا کہ یہ بڑے بُت کا فعل ہے۔ اگر یہ بت بول سکتے ہوں تو ان سے پوچھ دیکھو۔ جس کو سُن کر مشرکوں نے کچھ دل میں سمجھا اور سر جھکا لیا اور کہا کہ تمہیں تو یہ معلوم ہے کہ یہ بولتے نہیں، اس لئے اس قول کو دُنیا میں کوئی صاحبِ عقل جھوٹ نہیں کہہ سکتا۔ امام رازیؒ نے اس کو اپنی تفسیر میں اصولِ مناظرہ کے لحاظ سے معارضہ قرار دیا ہے اور پانچ وجوہ سے ثابت کیا ہے کہ یہ جھوٹ نہیں ہے۔ آخر میں یہ بھی کہا ہے کہ بجائے ایک صدّیق نبی کے اس روایت کے راویوں کو جھوٹا کہنا زیادہ آسان ہے ۔۔۔

(۷) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا (۳۳/۶۹) | اے مومنو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جنہوں نے موسیٰؑ کو اذیت دی، سو اللہ نے اس کو ان کی تہمت سے بری کر دیا۔

اس کی تفسیر میں جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ :۔۔۔

"حضرت موسیٰ علیہ السّلام بڑے حیادار تھے، اس طرح جسم کو چھپائے رکھتے تھے کہ کوئی حصّہ اس کا دکھائی نہیں دیتا تھا، بنی اسرائیل کے لوگوں نے ان کو ستانا شروع کیا اور کہا کہ یہ اس قدر اپنے بدن کو چھپائے رکھتے ہیں تو اس کی وجہ ہے کہ ان کو برص یا اور اس قسم کی کوئی بیماری ہے۔ اللہ نے چاہا کہ موسیٰؑ کو ان کی تہمت سے بری کرے، سو موسیٰؑ ایک دن تنہائی میں اپنے کپڑوں کو ایک پتھر پر رکھ کر غسل کرنے لگے۔ جب فارغ ہوئے اور کپڑے لینے کو اس کی طرف بڑھے تو پتھر ان کے کپڑوں سمیت بھاگا۔ موسیٰؑ لٹھ لے کر اس کے پیچھے دوڑے یہ کہتے ہوئے کہ اے پتھر! میرے کپڑے، اے پتھر! میرے کپڑے، یہاں تک کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت میں پہنچ گئے، انہوں نے ان کو برہنہ دیکھ لیا اور ان پر ظاہر ہو گیا کہ وہ ساخت میں سب سے بڑھ کر حسین تھے، اس طرح اللہ نے ان کے الزام سے موسیٰؑ کو بری کر دیا۔ اس جگہ پہنچ کر پتھر رُک گیا۔ موسیٰؑ نے اپنے کپڑے لے کر پہنے۔ پھر پتھر کو لٹھ سے مارنے لگے، اللہ کی قسم اس میں ان کی لاٹھی کے نشانات ہیں۔ تین، چار یا پانچ"۔۔۔

اس روایت میں غور کرنے کے قابل یہ اُمر ہے کہ راوی قسم کھا کر بیان کرتا ہے کہ پتھر میں ان کی ضرب کے نشانات ہیں اس جزم و یقین کے ساتھ کہ گویا اس نے خود مارتے دیکھا ہے۔ اور یہ اس کے سچے ہونے کی نشانی نہیں ہے۔ علاوہ بریں۔ پتھر بے جان، بے ارادہ شئے ہے اس کا کپڑوں کو لے کر بھاگنا ایک معجزانہ اُمر ہوگا، جو منجانب اللہ ہی ہو سکتا ہے اور یہ چیز حضرت موسیٰؑ جیسے اولوالعزم رسول پر مخفی نہیں رہ سکتی تھی، پھر اس کو لٹھ مارنے کے کیا معنی؟ غرض امارات کذب اس روایت میں واضح ہیں ۔۔۔

"وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ" کی تفسیر میں جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ کسی نے سوال کیا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے، پھر اپنا ہاتھ سلمان (فارسی) کے اُوپر رکھا اور فرمایا کہ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر ایمان ثریّا پر بھی معلق ہو تو اس کی قوم میں ایسے لوگ ہوں گے جو اس کو پالیں گے" ۔۔۔ پھر آیتِ ذیل کی تفسیر میں ہے :۔

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ (۴۷/۳۸) | اور اگر تم پیٹھ موڑو گے تو تمہارے سوا کسی اور قوم کو اللہ تمہارے عوض میں بدل لے گا ۔

یعنی اے اہلِ عرب! اگر تم اللہ کے اُن فرائض کی تبلیغ وغیرہ میں جو اس نے تمہارے ذمّہ عائد کئے ہیں اور جن کی ادائیگی کی وجہ سے تم کو "خیر اُمّت" کا لقب دیا ہے، کوتاہی کرو گے تو وہ تم کو چھوڑ کر کسی دوسری قوم کو امام الاقوام بنا دے گا جو ان فرائض کو اچھی طرح ادا کرے گی۔

امام ترمذیؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت لکھتے ہیں کہ :۔ ــــــ
"لوگوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ کس قوم کو اللہ ہماری جگہ چن لے گا؟ آپؐ نے سلمانؓ کے مونڈھے پر ہاتھ مار کر فرمایا ــــ "اس کی قوم کو، اس کی قوم کو ــــ"

ان روایات سے اہلِ فارس کے ایمان کی پختگی، ان کی دماغی برتری اور ذہنی فوقیت کی سند رسول اللہ کی زبان سے مہیا کرنا مقصود ہے۔ کیونکہ وہی خلافتِ عباسیہ میں جملہ مناصب حکومت پر قابض تھے اور رواۃِ حدیث بھی زیادہ ترعجم ہی سے تھے ــــ

(۹) جب یہ آیت نازل ہوئی یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (۳۳/۵۶) اے مومنو! نبی پر درود بھیجو اور سلام، تو حضرت بشیر بن سعدؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ہم کس طرح آپؐ کے اُوپر درود بھیجا کریں؟ آپؐ نے دیر تک سکوت کیا، پھر فرمایا کہ کہو اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاهِیْمَ (الیٰ آخرہ) یہ وہی درود شریف ہے جس کو مسلمان نمازوں میں پڑھا کرتے ہیں ــــ

ہرچند کہ یہ روایت صحیح بخاری اور جامع ترمذی دونوں میں ہے لیکن اس درود کے یہ الفاظ اس آیت کی تفسیر نہیں ہوسکتے کیونکہ صَلُّوْا عَلَیْهِ میں صرف رسُول کا ذکر ہے، اس کے ساتھ آل کا ذکر نہیں ہے اس آیت کے مطابق درود کے الفاظ اس طرح پڑھے جائیں گے، اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ۔ لفظ بارک تسلیم میں شامل ہے۔ یہ درود جو نمازوں میں پڑھا جاتا ہے۔ اس کے الفاظ صرف حدیث سے ثابت ہیں۔ اس درود کو اس آیت کی تفسیر نہیں کہہ سکتے۔

(۱۰) قُلْ لَّاۤ اَسْئَلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰى ــــ (۴۲/۲۳) | کہہ دے کہ اس (تبلیغ) پر میں کوئی اُجر تم سے نہیں مانگتا، بجز رشتۂ سلوک کے ــــ

حضرت ابن عباسؓ نے اس کی تفسیر کی ہے کہ ــــ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت جملہ بطون قریش میں تھی۔ اللہ نے آپؐ کی زبان سے اعلان کرایا کہ کہدو کہ میں تبلیغ قرآن اور تعلیم دین پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، صرف رشتہ داری کا برتاؤ میرے ساتھ رکھو ــــ
امام ترمذیؒ نے اس کو درج کرنے کے باوجود سعید بن جبیرؒ سے نقل کیا ہے کہ :ــــ
"قربیٰ" کے معنی اس آیت میں "اٰلِ محمدؐ" کے ہیں، یعنی میری تبلیغ کا اجر کچھ نہیں سوائے اس کے کہ میری اولاد کے ساتھ محبت رکھو"

یہ بھی دراصل وہی پروپیگنڈا ہے اور قرآن کی سراسر تحریف۔ کیونکہ قرآن میں "اِلَّا الْمَوَدَّةَ لِاَقْرَبَائِیْ" نہیں ہے بلکہ اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰى" ہے اور قربیٰ کے معنی رشتہ کے ہیں، رشتہ داروں کے نہیں۔ عترت کی محبت لازمی گردانے سے ان کو خلافت دینا بھی اُمت کا فریضہ ہوجاتا ہے اور یہی ان کا مقصود تھا ــــ

جامع البیان میں اس آیت کی تفسیر میں ہے کہ :ــــ
"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ کسی شخص کے دل میں ایمان اسوقت تک داخل نہیں ہوسکتا جب تک کہ تم (یعنی عباسؓ اور ان کی اولاد) کو اللہ و رسول کیلئے محبوب نہ رکھو ــــ" امام ترمذیؒ نے ابواب التفسیر میں تو نہیں مگر کتاب المناقب میں اس کو درج کیا ہے۔ یہ روایت عباسی خلفاء کی محبت کو لازم گردانتی ہیں جو بغداد میں حکمران تھے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس مہبطِ وحی سے جو توحید کا منارہ دُنیا میں بُلند کرنے کیلئے

آیا تھا، ایسا شرکیہ قول ممکن بھی ہے کہ جب کسی کے دل میں اُپنے جیسے دوسرے بے بس انسان کی محبت نہ ہو، اس وقت تک ایمان کا داخلہ ہی اس میں نہیں ہوسکتا؟ تعجّب ہے کہ اُمّتِ اسلامیہ کے بہترین افراد حضرات عشرہ مبشرہ و اصحابِ بدر کے دلوں میں کیسے ایمان داخل ہوگیا کیونکہ اُس وقت تک تو حضرت عبّاس رضؓ جن کی محبّت شرطِ ایمان کہی گئی ہے خود ہی ایمان نہیں لائے تھے ——

(۱۱) ترمذی میں حضرت ابنِ عبّاس رضؓ سے روایت ہے کہ :——

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ جبریلؑ کہتے تھے کہ جب فرعون غرق ہونے لگا اور ایمان لانا چاہتا تھا، کاش اسوقت اے محمدؐ تم مجھے دیکھتے کہ میں سمندر کی مٹی کئے ہوئے اس کے مُنہ میں ٹھونس رہا تھا اس خوف سے کہ کہیں یہ کلمہ نہ پڑھ دے اور اس پر اللہ کی رحمت نہ آجائے ——

یہ روایت قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے اس وجہ سے اس کا صحیح ہونا ممکن نہیں ہے کیونکہ :——

(۱) جبریلؑ ہر جگہ اللہ کی طرح موجود نہیں رہتے، قرآن میں صاف کہہ دیا گیا ہے کہ فرشتے بلا حکمِ الٰہی نہیں اُترتے (وما نتنزل الا بامر ربك) (۲) جبریلؑ روح القدس ہیں جن کا وظیفہ یہ ہے کہ انبیاء کرام کے پاس اللہ کے پیغامات نہ کہ کلمۂ حق سے روکنے کے لئے کسی کے مُنہ میں مٹی ٹھونسیں (۳) فرشتے اپنے ارادہ یا جذبہ سے کوئی کام نہیں کرتے بلکہ "یفعلون مایومرون"، وہی کرتے ہیں جن کا ان کو حکم دیا جاتا ہے ——

(۱۲) وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْیٖ وَنُمِیْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِیْنَ وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ یَحْشُرُهُمْ۔

اور ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی وارث ہیں اور ہم اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور پچھلوں کو بھی جانتے ہیں۔ یہ تیرا رب ہی ہے جو ان کو حشر میں لائے گا —— (۱۵/۲۳-۲۵)

اس آیت کے سیاق و سباق پر نظر ڈالنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ اس میں اگلوں سے مُراد وہ لوگ ہیں جو پہلے گذر گئے اور پچھلوں سے وہ لوگ مُراد ہیں جو اُن کے بعد مریں گے، یہ سب کے سب اللہ کے علم میں ہیں جو ان کو قیامت کے دِن میدان حشر میں جمع کرے گا اسی مفہوم کی دوسری آیت میں ہے :——

قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰی مِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ —— (۵۶/۴۹-۵۰)

کہہ دے کہ اگلے اور پچھلے ضرور متعینہ دِن کی میعاد پر جمع کئے جائیں گے ——

لیکن جامع ترمذی میں روایت ہے حضرت ابنِ عبّاس رضؓ سے کہ :

" ایک حسین ترین عورت (مسجد میں) رسول اللہؐ کے پیچھے نماز پڑھنے آیا کرتی تھی، صحابہؓ میں سے کچھ لوگ تو آگے کی صف میں بڑھ جاتے تھے تاکہ اس کو نہ دیکھیں، مگر کچھ پیچھے کی صف میں شریک ہوتے تھے اور رکوع کی حالت میں بغل کے نیچے سے جھانکتے تھے، اس پر اللہ نے یہ آیت اُتاری کہ ہم تم میں اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور پچھلوں کو بھی جانتے ہیں ——"

متقدمین اور متاخرین کی ایسی تشریح اور صحابہ کرامؓ پر ایسا الزام نہ صرف قرآن بلکہ عقل کے بھی منافی ہے ——

(۱۳) دو ایک مثالیں تفسیر بالروایات کی ایسی لکھتا ہوں، جن کی خود دوسری حدیث مخالفت کرتی ہے۔ اسراء کی تفسیر میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ :——

" رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا جب ہم بیت المقدس میں آئے تو جبریلؑ نے اپنی اُنگلی سے پتھر کی طرف

اشارہ کیا اس میں سوراخ ہوگیا، براق کو اسی میں (غالباً رسّی ڈال کر) باندھ دیا ——

اس کے دو ہی صفحہ کے بعد پھر امام ترمذیؒ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ سے روایت لکھتے ہیں کہ: ——

لوگ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے براق کو باندھ دیا تھا کیوں؟ کیا اس لئے کہ بھاگ نہ جائے، حالانکہ اس کو تو اللہ نے ان کے لئے مسخر کر دیا تھا (یعنی نہ وہ بھاگ سکتا تھا نہ اس کو بھاگنے کی ضرورت تھی) ——

(۱۴) جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے ایک طویل روایت بیان کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "زمین سے آسمان تک پانچسو سال کی راہ ہے، پھر آسمان سے دوسرے آسمان تک بھی اسی قدر فاصلہ ہے اور آسمان سات ہیں جن کے اوپر عرش ہے، اس کا فاصلہ بھی ساتویں آسمان سے پانچسو سال کی راہ ہے۔ اسی طرح اس زمین کے نیچے زمین ہے پانچسو سال کی راہ کی مسافت پر اور زمینیں بھی سات ہیں جن میں سے ہر ایک سے دوسری کا فاصلہ اسی قدر ہے۔ قسم ہے اللہ کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے کہ اگر تم میں سے کوئی رسّی زمین کے اسفل ترین طبقہ میں لٹکائے تو وہ ٹھیک اللہ کے اوپر جا کر گرے گی، پھر آپ نے پڑھا۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ (الایۃ) ——— "

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ کی یہ تفسیر کہ اللہ اوپر سب سے اوپر عرش پر ہے اور ادھر سب سے نیچے تحت الثریٰ میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں ہو سکتی۔ رواۃ کو تو نہیں لیکن اس حدیث کے شارحین کو یہ احساس ہوا کہ اس سے اللہ کی ذات پر نہیں بلکہ اللہ کے علم پر گرے گی، کیونکہ اللہ کی ذات تو ایک ہی ہے ——

مگر پھر بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا جب وہ رسّی لٹکائی جائے گی اور طبقہ در طبقہ زمینوں میں لٹکتی ہوئی گرے گی تو اللہ کا علم اس کو محیط نہ ہوگا؟ پھر تحت الثریٰ میں پہنچ کر علم الٰہی پر گرنے کے کیا معنیٰ؟ ——

اب اس کے برخلاف ایک دوسری حدیث سنئے کہ وہ بھی ترمذی میں ہے۔ حضرت عباسؓ کہتے ہیں کہ: ——

" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک ۷۱ یا ۷۲ یا ۷۳ سال کی راہ ہے اور سات آسمان ہیں جن میں سے ہر ایک سے دوسرے کا فاصلہ اسی قدر ہے۔ ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بھی اتنی ہی ہے اس کے اوپر سات پہاڑی بکرے ہیں جن کے کھروں سے گھٹنوں تک اسی قدر فاصلہ ہے ان بکروں کی پشت پر عرش ہے جس کی موٹائی اسی قدر ہے ——"

غالباً یہ "كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ" کی تفسیر ہے اور چونکہ قرآن میں قیامت کے ذکر میں ہے کہ اس دن حاملین عرش آٹھ ہوں گے اس وجہ سے بکرے بھی سات ہی ہیں۔ یہ بکرے کس پہاڑ کے ہیں؟ ہم نے شروح حدیث میں اس کا نام بہت ڈھونڈا مگر نہ پایا ——

یہاں افسوس کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کرنا پڑتا ہے کہ یہ رواۃ حدیث بجز روایت کشی کے اور کوئی علم کمتر جانتے تھے۔ امام ترمذیؒ نے ۲۷۹ھ میں وفات پائی جس سے تقریباً ایک صدی پہلے سے مسلمانوں میں ہیئت اور جغرافیہ کے فن رائج ہو چکے تھے، اگر انہوں نے ان کا مطالعہ کیا ہوتا تو ایسی روایتوں کو صحیح قرار دے کر درج کرنے کی جرأت نہ کرتے ——

یہ ہے "مشتے نمونہ از خروارے"۔ ان روایات کا جو تفسیر قرآن کے متعلق صحاح ستہ میں وارد ہوئی ہیں۔ جن پر اہل سنت اگر ایمان نہیں تو اذعان ضرور رکھتے ہیں۔ اس سے نہ صرف تفسیری بلکہ ان کی دیگر روایات کے پایۂ اعتبار کا بھی اہل نظر اندازہ لگا سکتے ہیں ——

(ماخوذ از علمی رسائل دہلی)

ابنِ عَربی کی تفسیر

ابنِ عربی — جو نظریہ وحدت الوجود کے مخترع اور موجد ہیں۔ انہوں نے ایک تفسیر بھی لکھی ہے عبدُالعظیم زرقانی نے اپنی تفسیر مناہل العرفان میں کچھ اقتباس نقل کئے ہیں۔ آپ ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیں کہ یہ لوگ عرفانی انداز میں کیا کچھ کہنا چاہتے ہیں ——

—— ان اللہ یامرکم ان تذبحوا بقرۃ کی تفسیر میں ابنِ عربی لکھتے ہیں :۔

" بقرہ سے مُراد نفسِ حیوانیہ ہے جس کی حیات خواہش ہے لہذا اِس کا ذبح کرنا خواہشِ نفس کو ریاضت کی چھری کے دھار سے ختم کرنا ہے اور اُن افعال سے اُسے روکنا ہے جو نفسِ حیوانیہ سے مختص ہیں ——"

—— اور سورۂ انبیاء کی آیت —— "ولسلیمان الریح عاصفۃ" سے "وذکری للعابدین" تک کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے کہ :——

" ولسلیمان الریح" —— اور ہم نے سلیمان یعنی انسان کے عقل فعلی کے لئے جو سینہ کے عرش نفس پر متمکن[1] ہے، خواہشاتِ نفس کی ہوا کو مسخر کر دیا۔ "عاصفۃ" جو تیز چلا کرتی ہے، "تجری بامرہ" جو اب اس کے حکم سے چلتی ہے، یعنی اُن کی مطیع ہوگئی ہے۔ "الی الارض" یعنی زمین بدن تک جو طاعت و آداب سے آراستہ ہے۔ "التی بارکنا فیھا" جس میں ہم نے مکارمِ اخلاق اور اعمالِ صالحہ سے برکت عطا کی۔ "وکنا بکل شئ" اور ہم ہر چیز کو جو اسبابِ کمال سے ہے "عالمین" اچھی طرح جانتے ہیں۔ "ومن الشیاطین" یعنی وہم و خیال کے شیاطین میں سے "من یغوصون لہ" کچھ ایسے ہیں جو اس کے لئے بدن کے میولیٰ میں معانی جزیہ کے موتی نکالنے کے لئے غوطے لگایا کرتے ہیں —

---

[1] —— سلیمان علیہ السلام سے عقل فعلی مُراد لینا بہت ہی زیادہ بعید ہے وہ تو ایک جلیل القدر پیغمبر تھے یہاں ان کے معجزات کا بیان ہے پھر عقل فعلی کی اصطلاح یونانیوں سے درآمد کی گئی ہے اور اس کا شجرۂ نسب یونانیوں کی دیومالا (عقول عشرہ) کے ساتھ جا ملتا ہے متکلمین اس کا ادراک کرتے ہیں۔ اس معنے میں نہیں کہ ادراک کے لئے دماغ میں کوئی قوت ہی نہیں بلکہ اس معنے میں کہ اس کی وہ خصوصیات، لوازم اور مقتضیات وہ نہیں ہیں جو یونانی بیان کرتے ہیں اور نیز یہ کہ اس کا نام عقل کیوں رکھا جائے اس قوت کے لئے عقل کا لفظ عنوان ہے اور اس کے ساتھ شرک وہ پورا عقیدہ تصور میں آجاتا ہے جو اس لفظ کی تفصیلات کے ساتھ وابستہ ہے ——

اور پھر اگلے حصّہ میں تو کھلی یونانیت آگئی ہے کہ اس میں وہم، خیال اور ھیولے کا کھلا کھلا استعمال کیا گیا ہے اس کے بعد بھی اگر کوئی یہ دعویٰ رکھتا ہو کہ ہمارا تصوّف یونانیوں کی خرافات سے بالکل منزہ اور پاک ہے، تو ہم اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ حضور والا آنکھوں پر پٹی باندھ کر آپ جو چاہیں ارشاد فرمائیں یا کوئی آپ کا کیا بگاڑ سکتا ہے —— اسی طرح آگے "ایوب" کی تفسیر میں —— (باقی اگلے صفحہ پر)

"ویعملون عملا دون ذالک" اور اس کے علاوہ دوسرے کام بھی کرتے ہیں۔ مثلاً صنعت و حرفت اور اکتسابات کے دواعی کو برانگیختہ کرنا وغیرہ" وکنا لھم حافظین" اور ہم ان کی کجی اور غلطی کی گمراہیوں اور جھوٹ وغیرہ سے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ وایوب" یعنی اس نفس مطمئنہ نے، جس کا کمال تزکیہ تک پہنچانے والی ریاضت اور مجاہدات میں ہر قسم کے ابتلاؤں سے امتحان لیا گیا۔" اذ نادیٰ ربہ" جب کہ اس نے اپنے رب کو پکارا سخت ترین مجاہدہ اور انتہائی طاقت صرف کرنے میں شدتِ کرب کے وقت" انی مسنی الضر" کہ مجھ کو ضعف و انکسار اور عجز لاحق ہو گئے ہیں۔" وانت ارحم الراحمین" اور تو وسعت رحمت اور راحت کے ذریعہ تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے،" فاستجبنا لہٗ" تو ہم نے اس کی دعا قبول کی اعمال کی سختی سے احوال کی خوشگواری دے کر کمالِ ملکیت کے وقت اور سکینہ نازل کر کے۔" وکشفنا ما بہ من ضر" یعنی ہم نے ریاضت کی سختی کو نورِ ہدایت سے اور تکلیفات کی ظلمت کو نورِ قلب کی چمک دے کر دور کر دیا۔" وآتیناہ اھلہ" یعنی وہ قوائے نفس جس کا ہم نے اسے مالک بنایا ہے اور جسے ہم نے ریاضت کے ذریعہ مار دیا تھا، اس کو حقیقی حیات دے کر زندہ کر دیا۔" ومثلھم معھم" یعنی روحانی قوی اور صفات قلبی کے انوار سے امداد دے کر نیز ہم نے اس کے لئے اخلاقی فضائل کے بہت سارے اسباب فراہم کر دیئے۔ اور علومِ نافعہ کے احوال سے مالا مال کر دیا، ولحمۃ من عندنا وذکریٰ للعابدین...."

ان اقتباسات کے بعد صاحب "مناہل العرفان" ــــــ "مخلصانہ نصیحت" کے عنوان سے تحریر کرتے ہیں کہ:۔

"یہ تفسیر، جس کے کچھ نمونے تم نے دیکھے، کُل کی کُل اسی قسم کی ہے اور اس میں ان معانی کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے، جن پر نصوصِ قرآنیہ دلالت کرتے ہیں۔ یعنی جن کے لئے الفاظ کی وضع ہوتی ہے اور یہ انتہائی خطرناک روش ہے، کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ اس کا مطالعہ کرنے والا یہ سمجھ بیٹھے کہ خالق نے اپنی مخلوق کے لئے اسلامی تعلیمات کے ذریعہ ہدایت دینے اور اپنے پسندیدہ دین کے حقائق کی جانب رہنمائی کرنے میں یہی اشاری معانی مُراد لئے ہیں۔ اور شاید تم اس معاملہ میں میری ہمنوائی کرو گے کہ کچھ لوگ ان اشارات و کوائف کی شدت کے ساتھ پابندی کرانے کی بنا پر فتنے میں پڑ گئے اور ان کے دل میں یہ بات جم گئی کہ کتاب و سنت بلکہ اسلام کُل کا کُل بجز ان احوال و واردات کے اور کچھ نہیں ہے جن کا مبنیٰ اس طرح کی تاویلات و توجیہات ہے اور انہوں نے خیال کر لیا کہ امر و حکم بجز تخیلات کے اور کچھ نہیں، اور یہ کہ لوگوں سے مطالبہ اسی خیالی دنیا میں بھٹکتے رہنا ہے اور جب وہ اس چکر میں پڑ گئے تو انہوں نے تکالیفِ شرعیہ کا قلادہ اتار پھینکا اور کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ کی بلیغ ترین نصوص عربیہ کے سمجھنے میں لغتِ عربیہ کے قوانین کو جو مرتبہ حاصل ہے اسے کوئی وزن نہیں دیا ــــ

پھر ستم بالائے ستم یہ کہ وہ خود تو اس زعم فاسد میں مبتلا ہی ہیں، دوسرے بندگانِ خدا میں بھی یہ خیال پیدا کراتے ہیں کہ وہی اہلِ حقیقت ہیں جنہوں نے غایت مقصود کا ادراک حاصل کر لیا ہے اور اللہ سے ان کا اس طرح وصل ہو چکا ہے کہ ان سے تکالیفِ شرعیہ ساقط کر دی گئی ہیں کیونکہ وہ بزعم خود ہمیشہ رب الارباب کے ساتھ رہتے ہیں اور یہ ــــ خدا کی قسم بہت بڑا سانحہ ہے جو باطنیہ اور ان جیسے دوسرے دشمنانِ اسلام کا لایا ہوا ہے، تاکہ شریعت کے سارے اصول کی بیخ کر دیں اور اس کی عمارت کی بنیاد کھود کر پھینک دیں۔ وہ اپنی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں اور اللہ نے بھی

---

۵ بقیہ حاشیہ گذشتہ، "نفسِ مطمئنہ" کا فقرہ ایسا ہی ہے جیسا کہ چاند اور سورج کو ایک قرار دینا۔ حضرت ایوبؑ بھی ایک جلیل القدر نبی تھے اور یہاں ان کی انابت الی اللہ اور ان کی دعا کے قبول کئے جانے اور ان پر خدا کی رحمت و برکت کا بیان ہے (ع۔ع)

طے کرلیا ہے کہ وہ اپنے نُور کو مکمّل کرکے رَہے گا۔ اگرچہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار گُزرے ——

لہٰذا خیر خواہی اور نصیحت جو واجب ہے اور اس بات کی مقتضی ہے کہ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کو اس راہ کی ہلاکتوں سے خبردار کریں تاکہ وہ اس جال میں نہ پڑیں —— اس لئے ہم بااصرار مشورہ دیتے ہیں کہ ایسی پُر پیچ تفاسیر صوفیہ جیسی تفسیروں سے اپنے آپ کو دُور رکھیں اور ان جیسی باتوں کے معلوم کرنے کی حرص نہ کریں جو قوم کے کلام میں کتب صوفیا کے ذریعہ پھیلائی گئی ہیں، اس لئے کہ وہ سب کی سب ذوق و وُجد کی باتیں ہیں جو ضبط و قید کی حدود سے خارج ہیں[1]۔ اور ان میں زیادہ تر حقیقت کے ساتھ تخیّلات اور حق کے ساتھ باطل کی آمیزش ہے۔ اور اگر تم ان باتوں کو چھانٹ کر الگ کر دوگے تو قائل کی مُراد بہت کم ظاہر ہوگی اور جو ظاہر بھی ہوگی تو وہ کھُلم کھُلا کُفریات میں سے ہوگی[2] ——

(تاریخ افکار و علوم اسلامی ص۲۷۸)

[1] یعنی شرعی ذمّہ داریوں کی پابندی سے انسان کو برگشتہ کر دینے والی ہیں۔ (مترجم)

[2] ابن عربی کے تفسیری مسلک کی تشریح اس کی دو مشہور کتابوں، فتوحاتِ مکیّہ، اور فصوص الحکم میں کی گئی ہے۔ ہم اس بحث کو ایک دوسری کتاب میں تفصیل کے ساتھ بیان کر رہے ہیں۔
(اسعدی غفرلہٗ)

کشفِ ساق اور قرآن میں مجاز کا بیان —

مولانا ابو الکلام آزادؒ لکھتے ہیں :-

قرآن میں کشف ساق (پنڈلی کھولنے) کی تشریعی کیفیت کیا ہے ؟ —

احادیث کی مختلف روائتوں میں اِس کی اس طرح تشریح کی گئی ہے —

۱ — قیامت کے دن مخلوقات کے رُو برو خدا متمثل ہوگا، مسلمان سامنے سے گذریں گے۔ سوال ہوگا، تم کس کی عبادت کرتے ہو ؟ کہیں گے خدا کی! خطاب ہوگا، تم خدا کو پہچانتے ہو ؟ کہیں گے پہچنوائے گا تو کیوں نہ پہچانیں گے۔ یہ سن کر خدا اپنی ساق کھول دے گا، جتنے مسلمان ہوں گے دیکھتے ہی سجدہ میں سر جُھکا دیں گے، منافقین کا گروہ سر جُھکانا چاہے گا تو پیٹھ سخت ہو جائے گی یہ فرقِ امتیازی مسلمانوں کو منافقوں سے متمائز کر دے گا —

۲ — قیامت کے دن کفّار و مشرکین کے رو برُو اُن کے بُت لائے جائیں گے کہ دیکھو تم انہیں کو پُوجتے تھے اب انہی کے ساتھ جاؤ، دوزخ میں چلو، پھر مسلمانوں کی نوبت آئے گی، خدا اُن کے لئے اپنی ساق کھول دے گا سب کے سر جُھک جائیں گے۔ منافقین سجدہ نہ کر سکیں گے، اس لئے جہنم میں گھر بسائیں گے —

اسلام کے علمی زمانے میں اِن خام روائتوں کے اخذ و ردّ میں کافی بحث ہو چکی ہے۔ لیکن جب روایتیں ہی سرے سے مقطوع الاسانید ہوں تو اُن کو استدلال کرنا ہی غلط ہے — کشفِ ساق کے الفاظ ادبیاتِ عرب میں کس معنی میں استعمال ہوتے ہیں اِس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ایک خاص مقدمے کو ذہن نشین کر لینا چاہیئے —

(۱) ہر زمانے، ہر مُلک، ہر قوم اور ہر زبان کے خاص محاورے ہوتے ہیں۔ رُوحانیت کے ساتھ کمالِ اتصال کو تورات کے محاورے میں خُدا سے لڑنے اور کُشتی کرنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ قرآن ترحم و اشفاق کو "آسمان کا رونا" کہتا ہے۔ اُردو میں انکار کے لئے "کانوں پر ہاتھ رکھنا" مستعمل ہے۔ حریفوں کو پامال کرنے کے لئے ایران کے قدیم محاورے "دشمن گزائی" کا استعمال تھا۔ اعتلا اقدام کیلئے "بازو برافرختن" کہتے تھے۔ اِن سب میں محاورے کے اطلاق کو دیکھتے تھے۔ الفاظ کے اصل معنی سے بحث نہ تھی —

(۲) اسلوبِ تعبیر کی دو حیثیتیں ہیں (الف) حقیقت (ب) مجاز۔ محلِ حقیقت و مجاز میں مختلف مناسبتیں ہُوا کرتی ہیں۔ جن سے ایک ہی لفظ جو پہلے کسی اور معنی کے لئے مستعمل تھا۔ اب ایک جُداگانہ معنی میں استعمال ہو سکتا ہے —

قرآن کریم ایک خاص مقام پر کہہ رہا ہے :—

مایکون من نجوی ثلاثة الا هو رابعهم ولا خمسة الا هو سادسهم ولا ادنیٰ من ذالك ولا اكثر الا هو معهم —	جہاں کہیں تین شخص سرگرم رازونیاز ہوں وہاں اِن کا چوتھا خُدا ہے، پانچ ہوں تو چھٹا خدا ہے۔ اس سے کم یا زیادہ جس تعداد میں بھی ہوں۔ خُدا ان کے ساتھ ہے —

یہ حقیقت اِس مجاز سے وابستہ تھی کہ تین ہم صحبتوں کا چوتھا شریک اور پانچ نفر کا مجلس کا چھٹا جلیس اِن کے مکالمہ سے آگاہ ہوتا ہے۔ اُن کی رازداریاں اِس پر منکشف ہو سکتی ہیں اور اُن کے مخفی امور کو سُن اور سمجھ سکتا ہے۔ آیت کا بھی یہی مُدعا تھا۔ اور اِس کے لئے اس سے بہتر اسلوب ممکن نہ تھا ——— ایک دوسری آیت میں ہے:——

واعلموا ان اللّٰہ یحول بین المرءِ وقلبہٖ	خوب جان رکھو کہ انسان اور اس کے دل کے مابین خدا حائل ہو جایا کرتا ہے ——

دِل اور جسم کے مابین حائل ہونے والے سے بڑھ کر اور کون ہے جسے مخفی باتوں کا حال معلوم نہ ہو سکے۔ یہاں بھی جناب الٰہی کو یہی غرض تھی۔ لہٰذا حقیقت اِس مجاز کے لباس میں نمودار ہوئی —— ایک مشہور آیت ہے:——

الرّحمٰن علی العرش استوٰی	خُدا تخت پر کھڑا ہے ——

کھڑے ہونے (استواء) کی حقیقت میں اِستیلا کا مجاز مضمر تھا۔ اَب بھی محاورے میں کہتے ہیں۔ بلغار کا تخت متزلزل ہو گیا۔ یعنی اِس کے استیلاء میں ضعف آ گیا۔ پہلی صدی کا ایک عرب شاعر کہتا ہے:——

قد استوٰی بشر علی العراق	من غیر سیف و دم مہراق

عہدِ اموی کا رُکن (امیر بشیر) عراق کے تخت پر کھڑا ہو گیا۔ بغیر اس کے کہ تلوار چلائے یا خون بہائے۔ (یعنی اس نے اقتدار پر قبضہ کر لیا) قرآن کو بھی یہ حقیقت اِس مجاز کے اسلوب میں نمایاں کرتی ہے — سورۃ رحمٰن کی ہیبت ناک وعید:——

سنفرغ لکم ایّہ الثقلٰن (القرآن) (۵۵/۳۱)	اے جن و انس کی جماعت! ہم عنقریب تمہارے لئے خالی ہو کر فارغ ہونا چاہتے ہیں۔ ——

فارغ ہونے اور خالی بیٹھنے کی حقیقت اِس مجاز نے منقح کر دی کہ جن لوگوں کے مشاغل کثیر ہوتے ہیں وہ کوئی مہتم بالشان کام کرنا چاہیں تو اِس مشغولیت کے عالم میں خاطر خواہ نہ کر سکیں گے۔ اس لئے انہیں ایک مخصوص وقت نکالنا ہوگا، مفہوم کو دِل نشین بنانے کے لئے قرآن کریم نے بھی اِس تجوز کو لے لیا کہ لوگو! خبردار رہو، تمہارا حساب کرنے کے لئے ہم عنقریب ایک خالی وقت نکالنے کو ہیں کہ اچھی طرح محاسبہ ہو اور کامل امتحان و اختبار ہو جائے۔ اب آیئے کہ دیکھیں کشف ساق کا اصل مفہوم کیا ہے ——

علّامہ ابنِ جریرؒ اس کا جواب دیتے ہیں:——

قال جماعۃ من الصحابۃ والتابعین من اھل التاویل یبدو من امر شدید وکان ابن عبّاس یقول کان اھل الجاھلیۃ یقولون کشف الحرب عن ساق ——	مفسّرین صحابہؓ و تابعینؒ کی ایک جماعت کا قول ہے کہ آیت "وہ دن جب ساق کھلے گی" کے معنی یہ ہیں کہ امرِ شدید ظاہر ہوگا۔ ابنِ عباسؓ اس کی مثال میں کہا کرتے تھے۔ عہدِ جاہلیت کا محاورہ تھا کہ "جنگ نے اپنی ساق سے اِزار کو اُٹھا لیا" یعنی پوری طرح چھڑ گئی ——
وعن عکرمۃ فی قولہ یکشف عن ساقٍ، قال ھو یوم کرب، وذکر عن ابن عباسؓ انّہ کان یقرء ذالک یوم فکشتف عن ساق، بمعنٰی یوم فکشف القیامۃ	عکرمہؒ سے بھی اس آیت کی تفسیر میں یہی روایت ہے کہ وہ دن کرب و سختی کا دن ہوگا۔ ابن عباسؓ اس آیت کو یوں بھی پڑھا کرتے تھے کہ وہ دن جب ہم ساق کھولیں گے۔ یعنی بڑی سختی برپا کریں گے جب کوئی بات نہایت سخت ہو جاتی ہے تو

عن شدة والعرب تقول كشف هذا الامر عن ساق اذا صار الی شدۃ ۔۔۔

اہل عرب کہتے ہیں کہ :۔ "اس بات کی ساق کھل گئی ہے"۔

علامہ عزّ الدین بن عبد السلام لکھتے ہیں :۔

هو مجاز عن مبالغة فی حساب اعداء واهانتهم وخزيهم وعقوبتهم فان العرب يقولون لكل من جدا فی امر و بالغ فيه كشف عن ساقه واصله ان من جدا فی عمل الاعمال حزب او غيرها فانه يشتر ازاره عن ساقه كيلا يعوقه عن جده و سرعة حركته فيما جد فيه۔

آیت کے معنی مجازی ہیں، مُراد یہ ہے کہ دشمنانِ خدا کے محاسبہ و تذلیل و رسوائی و تذلیل میں مبالغہ ہوگا، جب کوئی شخص کسی کام میں نہایت مبالغے کے ساتھ کوشش کرتا ہے تو اہلِ عرب کہتے ہیں " اُس نے اپنی ساق کھول دی"۔ اس کی اصلیت یوں ہے کہ جب کوئی شخص کسی بڑے کام میں سرگرم ہوتا ہے خواہ جنگ ہو یا کوئی اور کام ہو تو ازار کو اُوپر چڑھا لیتا ہے کہ تیزی و سرگرمی کے ساتھ جو کام کرنا چاہتا ہے اس میں حرج واقع نہ ہو۔

قرآن میں مجاز کی مثالیں

نرمی نرم دلی (ذلّت) کے بھی پَر نہیں ہوتے جسے نیچے لا سکیں یا اُوپر اُٹھا سکیں مگر اس آیت میں ہے :۔

(۱) وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ۔ | ماں باپ کے لئے مہربانی کے ساتھ نرمی و ملائمت کے پَر نیچے کرو، یعنی بچھا دو۔

(۲) قرآن کے ہاتھ بھی تو نہیں ہیں مگر قرآن خود کہہ رہا ہے :۔

مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ۔ | قرآن کے دونوں ہاتھوں کے بیچ میں جو چیز ہے۔

یعنی توراۃ و انجیل جو اس کے رو برو ہے وہ اس کی تصدیق کر رہا ہے ۔

(۳) کُفر بھی تو ہاتھ نہیں رکھتا مگر اس کے تذکرے میں ہے ۔

ذَالِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدَاكَ | یہ کیفیت تیرے دونوں ہاتھوں کی لائی ہوئی ہے۔

(۴) عذاب بھی تو کوئی مجسم شکل نہیں ہے کہ اس کے ہاتھ پاؤں ہوں مگر قرآن کا بیان ہے :۔

اِنِّیْ نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَیْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۔ | سخت عذاب کے دونوں ہاتھوں کے بیچ میں پڑنے سے میں تم کو ڈراتا ہوں ۔

واقعہ یہ ہے کہ اُردو زبان کے ایک شاعر کے لئے جب یہ اَدبی معذرت قابل پذیرائی ہے کہ :۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ٭ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

تو اہلِ نظر کی اس تحقیق کا کیوں نہ لحاظ کیا جائے کہ :۔

الغرض من هذا انه قد يعبر بالجوارح عن معان لا يصح ان يكون خارجه ۔ | غرض یہ ہے کہ تعبیر کلام میں اعضا و جوارح کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس سے وہ معانی مُراد لیتے ہیں جن کا اصل مفہوم سے الگ ہونا درست نہیں۔

قرآنِ کریم میں لفظ ساق تین مقام پر وارد ہے — (الف) سورۃ قیامت میں بحث ملاحظہ فرمائیے :—

وجوہٌ یومئذٍ ناضرۃٌ الی ربّہا ناظرۃ ووجوہ یومئذٍ باسرۃٌ تظن ان یفعل بھا فاقرۃٌ کلّا اِذا بلغت التراقی وقیل من راق وظن انّہ الفراق - والتفّتِ الساق بالساق اِلیٰ ربّک یومئذٍ ن المساق —

——— (القرآن) ———

اس دن بہتوں کے مُنہ تروتازہ ہوں گے۔ جو اپنے پروردگار کی رحمت کے منتظر ہوں گے اور بہتیرے مُنہ اُس روز بُرے بن رہے ہوں گے اور ان کو گمان ہوگا کہ ایسی سختی اُن کے ساتھ ہونے والی ہے کہ ان کی کمر توڑ ڈالے گی۔ خوب سمجھ لو کہ جب ہنسلی تک جان آپہنچے گی۔ اور وہ لوگ چلا اُٹھیں گے کہ کوئی جھاڑنے والا ہے۔؟ یقین ہو جائے گا کہ یہ مفارقت کا وقت ہے اُس وقت پنڈلی سے پنڈلی لپٹ جائے گی، تو یاد رکھ تجھے اپنے پروردگار کی طرف چلنا ہوگا —

اس آیت کریمہ میں التفاتِ ساق کی کئی تاویلیں کی گئی ہیں۔ مگر ابنِ جریرؒ کی نقّاد نظر میں یہ سب مجروح ہیں وہ لکھتے ہیں :۔

اولی الاقوال فی ذالک بالصحۃ عندی قول من قال: معنی فالک والتفت ساق الدُنیا بساق الاخرۃ وذالک شدّت کرب الموت بشدۃ ھول المطلع۔ والذی یدل علی ان ذالک تاویلہ قولہٗ: الیٰ ربّک یومئذن المساق۔ والعرب تقول لکلّ امیر اشتد۔ قد شمر عن ساقہ وکشف عن ساقہ، اعنی بقولہ التفتِ الساق بالساق۔ التصقت احدی الشّدتین بالاُخریٰ —

میرے نزدیک اس باب میں بہتر و صحیح قول اِن مفسّرین کا ہے جو آیت کے معنی یہ بتلاتے ہیں کہ دُنیا کی ساق آخرت کی ساق سے مل جائے گی، مطلب یہ ہے کہ موت کی شدت و کرب ہول مطلع کی شدت سے دوچار ہوگی۔ اس مفہوم کی دلیل خود اس آیت کا پچھلا جز ہے۔ اُس دن تجھے اپنے پروردگار کی طرف چلنا ہوگا۔ خطرہ جب بڑھ جاتا ہے اور بات سخت ہو جاتی ہے۔ تو اھلِ عرب کہتے ہیں فلاں اَمر کی ساق سے دامن اُٹھ گیا" یا اس کی ساق کُھل گئی" آیت میں ایک ساق مل جانے کے معنی یہ ہوئے کہ ایک سختی دوسری طرح کی شدّت سے پیوست ہوگئی —

سورۃ نمل میں جہاں ملکہ سبا، کو خطاب کیا گیا ہے :—

قیل لھا ادخلی الصرح فلما راتہٗ حسبتہٗ لجّۃً وکشفت عن ساقیھا، قالَ اِنّہٗ صرحٌ ممرّدٌ من قواریر —

ملکہ سبا، سے کہا گیا کہ محل کے اندر آؤ اُس نے محل کو دیکھا تو پانی سمجھی، اس خیال سے اپنی دونوں پنڈلیاں اس نے کھول دیں۔ سلیمان علیہ السّلام نے دیکھ کر کہا کہ یہ توشیش محل ہے۔

اس آیت میں کشف ساق کے معنی عام مفسّرین نے پنڈلی کھولنے کے کئے ہیں۔ امام رازیؒ نے بتعداد تین باتیں اور بھی بیان کی ہیں فرماتے ہیں :—

(۱) اِنّما فعلَ ذالکَ لیزیدھا استعظاماً لامرہٖ — | حضرت سلیمانؑ نے شیش محل اس لئے بنوایا تھا کہ ملکہ سبا کی نظر میں اُن کی عظمت بڑھ جائے —

(۲) کان المقصود من الصرح تھویل المجلس وتعظیمہ | تعمیر محل سے مجلس کو خوفناک و باعظمت دکھانا مقصود تھا —

(۳) حَسِبَتْ ان سلیمان علیہ السّلام لیغرقھا فی اللجۃ۔ | ملکہ سبا سمجھی کہ حضرت سلیمانؑ اس کو پانی میں غرق کرنا چاہتے ہیں۔

یہ باتیں اگر صحیح ہیں تو ان کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کو مرعوب کرنے اور اس کے دل پر اپنی ہیبت و عظمت کا سکہ بٹھانے کے لئے شیش محل تعمیر کرایا ہوگا، ملکہ سبا اسے دیکھ کر پانی سمجھی اور یہ خیال کیا کہ حضرت سلیمان نے بدعہدی کی کہ یہاں بلا کر مجھے غرق کرنا چاہتے ہیں، اس خیال کے آتے ہی ساق کھول دی یعنی غیظ میں آگئی، گھبرا اٹھی، ناراضگی پڑھ گئی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب یہ کیفیت دیکھی تو فرمایا۔ یہ پانی کا تموج نہیں شیش محل کا سراب ہے۔ ملکہ یہ سن کر پچھتائی اور اپنی بدگمانی پر کافی پریشان ہوئی اور اس کے بعد عہد کیا:۔

رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
(سورۃ نمل)

میرے پروردگار میں نے (یہ گمانی کرکے) اپنی جان پر ظلم کیا، اب میں سلیمان کے ساتھ ہوکر رب العالمین کیلئے مسلمان ہوتی ہوں۔

اب حضرت سلیمان علیہ السلام پر یہ اعتراض بھی وارد نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے کیوں ایسی ترکیب کی کہ ایک پرائی عورت اپنی پنڈلیاں کھول دے اور وہ اسے دیکھیں۔ جب اعتراض ہی رفع ہو گیا تو جواب دینے کے لئے کسی تاویل کی کیا حاجت ہے؟ گذشتہ مباحث سے معلوم ہوتا ہے کہ

(الف) — قرآن کریم نے پنڈلی کے معنی میں ساق کا لفظ کہیں بھی استعمال نہیں کیا۔

(ب) — قرآن کریم میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے، جس سے اس کا قطعی ثبوت مل سکے۔

بخاری کی مشہور حدیث

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: یکشف ربنا عن ساقہ فیسجد لہ کل مومن ومومنۃ ویبقی من کان یسجد فی الدنیا ریاءً وسمعۃً فیذھب یسجد فیعود ظہرہ طبقاً واحداً۔
(بخاری)

ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا، کہ ہمارا پروردگار قیامت کے روز اپنی ساق کھول دے گا جتنے مسلمان مرد و عورتیں ہوں گی سب کے سب سجدے میں گر پڑیں گے، صرف وہ لوگ رہ جائیں گے جو دنیا میں دکھانے اور سنانے کیلئے سجدہ کیا کرتے تھے، وہ اس وقت سجدہ کرنے چلیں گے تو ان کی پیٹھ ایک تختہ ہو جائے گی۔

تو قطع نظر دیگر مباحث کے جو توجیہہ و تفسیر قرآن کریم کی آیات کی کی جاتی ہے، ضروری ہے کہ اس حدیث پر نظر ثانی کی جائے نظام نیشاپوری کی اس لطیف توجیہہ کو بھی پیش نظر رکھئے جس میں وہ لکھتے ہیں:

معناہ یوم یشتد ویتفاخم، ولا کشف ثمہ ولا ساق، کما تقول للاقطع الشحیح: یدہ مغلولۃ ولا ید ثمہ ولا غل۔ وانما ھو مثل فی البخل وقال ابوسعید الضریر ساق الشیء اصلہ الذی بہ قوامہ، کساق الشجر وساق الانسان فمعنی الآیۃ

آیت کے معنی یہ ہیں، کہ اس دن صورت معاملہ نہایت سخت و شدید دشوار ہو جائے گی۔ ورنہ اصل میں نہ تو وہاں ساق کھلنے کا شائبہ ہے، اور نہ ساق ہی ہے، کہ کھلی یا ڈھکی رکھی جائے، مثلاً ایک بخیل کے ہاتھ کٹے ہوئے ہیں۔ حالانکہ نہ وہاں ہاتھ ہیں اور نہ بندش ہے، بلکہ دراصل یہ مثل ہے جس سے اظہار بخل منظور ہوتا ہے۔

یوم تظہر حقائق الاشیاء و اصولھا۔

ابُوسعید ضریر کہتے ہیں، ساق وہ شئے ہے جس سے کسی چیز کا قوام وابستہ ہو۔ جیسے ساقِ درخت، ساقِ انسان، اس بنا پر آیت کے معنی یہ ہوں گے۔ اس دِن اشیاء کی حقیقتیں اور اصلیتیں ظاہر ہوں گی ——

جو کچھ پیش آتا ہے دنیا ہی میں پیش آئیگا — قیامت سے ان واقعات کو تعلق نہیں ہے۔ قیامت وہ دن ہے، کہ کسی عبادت کی تکلیف نہ دی جائے گی۔ نہ وہاں رکوع ہے نہ سجود ہے، نہ قعود ہے نہ قیام ہے ——

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:——

یوم یکشف عن ساق ویدعون الی السجود فلا یستطیعون —

وہ دِن جب خطرہ بڑھ جائے گا۔ لوگ سرافگندگی کے لیے بلائے جائینگے، مگر نہ کر سکیں گے ——

پھر کیونکہ ممکن ہے کہ قیامت کے دِن جو احتساب کا دِن ہے انہیں کسی عبادت کا حکم دیا جائے۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ، وہ قیامت کی ہیبت سے اِتنے پریشان ہوں گے کہ عبادت کے ہر صحیح انداز کو بھی بھول جائیں گے۔ اِس سے اُن کی ذہنی پریشانی اور تشتتِ فکری مُراد ہے ——

(مقالاتِ ابوالکلام آزاد)

امثال القرآن

امام ابنِ قیمؒ فرماتے ہیں :——

تمثیل کی غرض یہ ہوتی ہے کہ کسی غیر واضح اور غیر محسوس حقیقت کو مخاطب کے فہم سے قریب تر لانے کے لئے کسی ایسی چیز سے تشبیہ دیجائے جو واضح اور محسوس ہو، دوسرے الفاظ میں یوں سمجھو کہ جو چیز عام نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہے تمثیل کے ذریعہ سے گویا اس کا مشاہدہ کرا دیا جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں یہ طرزِ بیان بڑی کثرت کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے کیونکہ جن حقائق سے وہ آگاہ کرنا چاہتا ہے وہ قریب قریب سب کے سب غیر مرئی و غیر محسوس ہوتے ہیں، لہٰذا قرآن مجید کی تمثیلات کا مضمون بڑی اہمیّت رکھتا ہے اور اس میں تدبّر کرنا مطالبِ قرآن کو سمجھنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔

(۱) — قرآن منافقین کے بارے میں کہتا ہے :——

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَّا يُبْصِرُونَ ۝ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝ أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِم مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ۝ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُم مَّشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

(بقرہ - ۲)

ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی پھر جب اس کے آس پاس کی چیزیں چمک اُٹھیں تو اللہ نے ان کا نور سلب کر لیا اور ان کو تاریکیوں میں چھوڑ دیا ان کو کچھ سوجھتا ہی نہیں یہ بہرے گونگے اندھے ہیں کہ (راہِ راست پر) نہیں آسکتے یا مثلاً آسمانی بارش آئی جس میں تاریکیاں، گرج اور بجلی ہے۔ کڑک کا یہ حال ہے کہ وہ جان کے خوف سے کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں اور چمک کا یہ زور ہے کہ آنکھیں اندھی ہوئی جاتی ہیں اور کافروں کو چاروں طرف سے اللہ نے گھیر رکھا ہے، جب ان کے آگے بجلی چمکی وہ اس کی روشنی میں کچھ دور چل لئے، اور جب ان پر تاریکی چھا گئی تو کھڑے (کے کھڑے) رہ گئے، اللہ اگر چاہے تو ان کی سُننے اور دیکھنے کی قوتیں سلب کر لے بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے ——

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے منافقین کے حسبِ حال دو مثالیں بیان کی ہیں۔ ایک ناری دوسری مائی۔ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ اس میں فلسفۂ ہدایت کی گہری حکمت پنہاں ہے۔ یہی دونوں چیزیں (آگ اور پانی) روشنی اور زندگی کا سرچشمہ ہیں۔ آگ روشنی کی اصل ہے اور پانی زندگی کی اصل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی وحی کے متعلق فرماتا ہے کہ اس کے اندر دلوں کے لئے زندگی اور نور ہے۔ اسی مناسبت سے اس کا نام اس نے روح اور نور رکھا ہے۔ اور اسے قبول کرنے والوں کو "احیا" (زندہ) کہتا ہے جو روشنی میں ہیں، اور منکرین کو "اموات" (مُردہ) بتاتا ہے جو تاریکی کی وادیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ یہاں مُنافقین کی حالت اس مناسبت سے بیان کی ہے کہ انہوں نے وحیٔ الٰہی کو دلیل بنایا لیکن اپنی خریدی

بدبختیوں کی بدولت اس پر قائم نہ رہ سکے، اسی لئے ان کو اس شخص کے مشابہ قرار دیا ہے جس نے آگ جلائی روشنی حاصل کرنے اور بہرہ مند ہونے کے لئے لیکن اس کی یہ کوشش نتیجہ خیز نہ ہوئی، منافقین کی حالت اس سے بالکل ملتی جلتی ہے. بایں طور کہ انہوں نے دائرۂ اسلام میں قدم رکھا، اس کی روشنی میں چلنا چاہا، فوائد حاصل کئے، اس کے دامن میں پناہ لی اور مسلمانوں میں مل گئے، لیکن چونکہ اس میل ملاپ کا محرک کوئی ایمانی جذبہ نہ تھا جس کا نور ان کے دلوں میں واقعتہً موجود ہوتا، اس لئے اللہ نے اسلام کی یہ روشنی ان کے دلوں سے بجھا دی اور ان پر ظلمت و تاریکی کا پردہ ڈال دیا اور قرآن کی اس حکمت پر بھی ایک نظر ڈالو کہ اس نے "ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ" (ان کی روشنی زائل کردی ہے) "بنارھم" یعنی ان کی آگ بجھا دی، نہیں کہا آگ کی خاصیت روشنی بخشنا اور جلانا دونوں ہے. سو اللہ نے روشنی تو ان سے سلب کر لی اور جلانے کی تاثیر باقی رکھی اور ان کو تاریکیوں میں بھٹکتا چھوڑ دیا، یہی اس شخص کی صحیح تصویر ہے جس نے بینائی سے کام لیا، پھر آنکھوں پر خود ہی پٹی باندھ لی، معرفت و ہدایت کی سعادت حاصل کی، پھر خود ہی انکار کی لعنت اوڑھ لی. حدودِ اسلام میں داخل ہوا، پھر باطنی لحاظ سے آپ ہی اُلٹے پاؤں پھر گیا اور ادھر کا رُخ نہ کیا ـــــ اسی وجہ سے ان کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ "اَب وہ لوٹنے والے نہیں" ـــــ اب ذرا قرآن کی آبی تمثیل کے آئینہ میں بھی منافقین کی تصویر دیکھ لو. قرآن کہتا ہے کہ منافقین کی مثال ان لوگوں کی سی ہے جو چلتے چلتے زور شور کی بارش میں گھر گئے ہوں. بادلوں کی ہمہ گیر تاریکی ان پر مسلط ہے. ہولناک بجلیوں کی کڑک چمک ہے. ضُعفِ قلب اور سراسیمگی سے ان کا بُرا حال ہے. تاریکی میں کبھی رہ رہ کر بجلی چمکتی ہے تو اس کی مدد سے دو قدم چل لیتے ہیں لیکن جب زور کی بجلی کڑکتی ہے اور کوندتی ہے تو ڈر کے مارے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں اور آنکھیں بند کر لیتے ہیں کہ کہیں صاعقۂ آسمانی آنہ لے اور تارِ حیات ٹوٹ نہ جائے۔

بس اسی طرح ان منافقین کے لئے بھی رحمتِ الٰہی کی وہ بارش جو قرآن کی صورت میں ہوئی، ان کی اپنی کج عقل، ضعفِ دماغ اور قلتِ علم و بصیرت کی وجہ سے زحمت بن گئی، قرآن کے احکام امر و نہی، اس کی دعوت، جہاد و قتال اور نفس پرستوں پر اس کی زجر و توبیخ ان کے لئے بجلی کی کڑک اور چمک بن گئے جن کی تاب لانا ان کے بس میں نہ تھا ہلکی پھلکی بے ضرر تعلیمات کی روشنی میں تو وہ کچھ چل لیتے ہیں، مگر جہاں آزمائش کے معاملات آجائیں، یا جہاں تاویلات کی گنجائش نہ دے کر دو ٹوک فیصلہ کر دینے والی آیت آجائے وہاں وہ سخت کشمکش اور پریشانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، چنانچہ ہمارا یہ روز کا مشاہدہ ہے کہ جب گمراہ اور بدعتی فرقوں کے سامنے قرآن کی کوئی صریح آیت پیش کر دی جاتی ہے تو وہ ایسے سٹ پٹاتے ہیں کہ گویا بکریوں کے سامنے کہیں سے اچانک کوئی بھوکا شیر آگیا. حالانکہ قرآن کی آیت تو فی نفسہٖ رحمت ہے، مگر ان کیلئے سخت مصیبت بن جاتی ہے. اس کی چکا چوند میں وہ اُلٹا اور راستہ بھول جاتے ہیں اور اس کی آواز ان کے لئے بجلی کا کڑکا بن جاتی ہے جس سے جان بچانے کے لئے انہیں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لینی پڑتی ہیں. ان کی یہ حالت کیوں ہوتی ہے؟ صرف اس بناء پر کہ ان کی عقلوں اور دلوں پر حق سے نامانوسیت کا پردہ پڑا ہوا ہے اور ان کے کمزور دل صفاتِ الٰہی کے روحانی بار کو اُٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے، اس وجہ سے وہ اعراض و نفرت پر تُل جاتے ہیں. انہیں کے مثل ان مشرکوں کا (خواہ ان کے مختلف گروہ اپنے مشرکانہ خیالات میں کتنے ہی مختلف ہوں) حال بھی یہی ہے جن کے سامنے خالص مسئلہ توحید مبرہن ہو کر آجاتا ہے اور قطعی دلائل و نصوص ان کے مشرکانہ اوہام کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیتے ہیں تب بھی ان کے دلوں میں ایمان کی روشنی پیدا نہیں ہوتی بلکہ ان پر قرآن کی بات اتنی شاق گذرتی ہے اور وہ اس سے اس قدر وحشت کھاتے ہیں اگر ان کا بس چلے تو اپنے کانوں کو بند کرنے میں بھی دریغ نہ کریں ـــــ

(۲) ـــــ سورۂ رعد میں اسی فلسفۂ ہدایت کو دوسرے پہلو سے بیان کیا گیا ہے. وہاں مؤمنین کو سامنے رکھ کر ان کے بارے میں بھی یہی دونوں ناری و مائی تمثیلیں بیان فرمائی گئی ہیں مگر دیکھو کہ دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے:۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا	اللہ نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اپنی اپنی (سمائی کے) بقدر

فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۭ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاۗءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۭ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاۗءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ۝ ——— (رعد-۲)

اس سے ندی نالے بہ نکلے اور پھر (پانی کے) ریلے میں جھاگ بن کر اُوپر اُٹھ آئے، اسی طرح زیور یا دوسرے ساز و سامان بنانے کے لئے (معدنیات کو) جب لوگ آگ میں تپاتے ہیں تو ان میں بھی اسی طرح کا جھاگ ہوتا ہے۔ یوں اللہ حق و باطل کی مثالیں بیان فرماتا ہے۔ سو جھاگ تو رائیگاں جاتا ہے اور (پانی) جو لوگوں کے کام آتا ہے زمین میں ٹھیرا رہتا ہے۔ اللہ اسی طرح مثالیں بیان فرماتا ہے ———

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کو جسے وہ قلبِ انسانی کو زندہ کرنے کے لئے اُتارتا ہے پانی سے تشبیہ دی ہے جو زمین کو زندہ کرنے کیلئے برسایا جاتا ہے اور دلوں کو ندی نالوں سے تشبیہ دی ہے جس طرح ندی نالے آسمان کی بارش کو اپنی اپنی وسعت کے مطابق اپنے سینوں میں بھر لیتے ہیں۔ اسی طرح انسانی قلوب بھی دریائے معرفت سے بقدرِ ظرف لے لیتے ہیں، جو قلب جتنی زیادہ وسعت رکھتا ہے وہ اسی قدر علم و بصیرت کا خزانہ وحیٔ الٰہی کے فیضانِ عام سے حاصل کر لیتا ہے۔ پانی کے ساتھ وحی اور ندی نالوں کے ساتھ قلوب کی تشبیہ کس قدر بلیغ ہے۔ پھر دیکھو بادلوں سے جب بارش ہوتی ہے اور زمین پر پڑ کر دھارے کی شکل میں بہنے لگتی ہے تو اس وقت زمین کی تمام غلاظتیں اور میل کچیل اور خس و خاشاک سب اُبھر کر سطحِ آب پر آجاتے ہیں مگر چند لمحوں کے بعد کہیں ان کا نام و نشان تک نہیں رہتا اور وہی پاک و صاف پانی باقی رہ جاتا ہے جو انسان کے لئے مفید ہے۔ اسی علم و بصیرت اور رُشد و ہدایت کا آبِ رواں بھی جب قلوب کی وادیوں میں اُترتا ہے تو پہلے تمام دبی ہوئی کثافتوں کو اُبھار دیتا ہے اور بالآخر نفسانی خواہشوں اور شکوک و اوہام کی گندگیوں کو فنا کر کے دلوں کو انوارِ الٰہی کا مہبط بنا دیتا ہے۔ اس کی مثال بعینہٖ دوا کی سی ہے جو جسم کے اندر داخل ہو کر تمام اخلاطِ جسم کو اُبھار دیتی ہے۔ اور مریض ایک طرح کی ناگواری محسوس کرتا ہے حالانکہ تمام اخلاط کا اُبھرنا دوا کے فوائد میں سے ہے ———

کیونکہ وہ انہیں اُبھارتی ہی اس لئے ہے کہ فنا کر دے جیسا کہ اس کی فطرت کا خاصہ ہے۔ ان حقائق کو سامنے رکھو اور پھر حق و باطل کی باہمی آویزش کا تصوّر کرو، حق نمودار ہوتا ہے تو دلوں میں چھپی ہوئی باطل کی تمام قوتیں سر نکال لیتی ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ حق خود ہی کرید کر ان قوتوں کو اُبھارتا ہے تاکہ انہیں باہر نکال پھینکے۔ کچھ مدت تک تو وہ قوتیں ایک بحرانی کیفیت میں اُبھری رہتی ہیں لیکن آخر کار فنا ہو جاتی ہیں اور آئینۂ قلب بالکل صاف ہو کر چمک اُٹھتا ہے۔ یہ تمثیل تو ہوائی تھی۔ ناری تمثیل بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے :———

وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاۗءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ۭ

اور یہ جو (لوگ) زیور یا دوسرے ساز و سامان کے لئے (معدنیات کو) آگ میں تپاتے ہیں اس میں (بھی) اسی طرح جھاگ اُٹھتا ہے۔

معدنیات جب آگ میں پگھلائی جاتی ہیں تو ان میں سے میل کا جھاگ اُٹھتا ہے۔ اصل جوہر نیچے رہ جاتا ہے جو انسانی ضروریاتِ زندگی کیلئے کارآمد ہے اور جھاگ اُوپر آ کر چھنٹ جاتا ہے اور سوخت ہو جاتا ہے۔ ایمان و ہدایت کا معاملہ بھی ایسا ہی کچھ ہے ایمان کی گرمی جب پہنچتی ہے تو مؤمن کے قلب کو اپنے اندر کی کثافتوں کا شدید احساس ہوتا ہے اور وہ پریشان ہونے لگتا ہے مگر یہ آگ شہوات اور شبہات کی گندگیوں کو اس طرح چھانٹ کر پھینک دیتی ہے جس طرح بھٹی کی آگ معدنیات کے میل اور زنگ کو۔ پھر جس طرح ملاوٹ نکل جانے اور سوخت ہو جانے کے بعد معدنیات کا خالص جوہر انسانوں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ اسی طرح نورِ ایمان بھی قلبِ مؤمن میں متمکن ہو کر نہ صرف اس کو بلکہ اس کے ذریعہ سے ایک جہان کو فائدہ پہنچاتا ہے ———

۳ - دُنیوی زندگی اور صاحبِ دُنیا کی مثال

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔

(یونس - ۳)

دُنیوی زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے مثلاً ہم نے آسمان سے پانی برسایا اور اس سے زمین کی نباتات جس کو آدمی اور چوپائے کھاتے ہیں۔ سیراب ہوئی یہاں تک کہ جب زمین نے اپنا سنگھار کر لیا اور خوشنما ہو چکی اور اہلِ زمین نے سمجھ لیا کہ اب وہ ان کی ہے تو (ناگاہ) ہمارا حکم اس پر رات یا دن کے وقت نازل ہو گیا اور ہم نے اس کو ایسا بلیا میٹ کیا کہ گویا کل اس کا نام و نشان ہی نہ تھا۔ جو لوگ سوچتے اور سمجھتے ہیں ان کے لئے ہم اپنی نشانیاں اسی طرح تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں ——

یہاں اللہ تعالیٰ نے دُنیوی زندگی کی تشبیہ اس طرح دی ہے کہ دُنیا جب زیب و زینت کے لباس میں بن سنور کر سامنے آتی ہے تو انسان اس پر مفتون ہو جاتا ہے اور حصولِ دُنیا ہی کو اپنا مطمحِ نظر قرار دے لیتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ فریبِ نفس اُسے یہاں تک پہنچا دیتا ہے کہ وہ اس زینتِ حیات کو اپنے قبضۂ قدرت میں سمجھنے لگتا ہے اس وقت یکا یک کرشمۂ الٰہی نمودار ہوتا ہے اور اس کے ہاتھوں موت کے ذریعے سے یہ محبوب ترین متاع چھین کر اسے خسران و ناکامی کی ناگہانی مصیبتوں اور حیرتوں میں چھوڑ جاتا ہے۔ اس کیفیتِ زندگی کی تشبیہ اللہ تعالےٰ نے زمین سے دی ہے جس پر بارش کی کرشمہ سازی سے نباتات کی ہری ہری چادریں بچھ جاتی ہیں اور اس بامرہ نواز منظر کو دیکھ کر کسان بے خود و بے اختیار ہو جاتا ہے۔ اُس وقت خُدا اُسے یاد نہیں آتا، نفس کے فریب میں آکر وہ اسے اپنے تدبر کا نتیجہ اور اپنی ملک سمجھنے لگتا ہے کہ اچانک حکمِ الٰہی جاری ہوتا ہے اور یہ سارا سامانِ غرور آفات و حوادث کی نذر ہو کر رہ جاتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے اس کا طلسم و غرور ٹوٹ جاتا ہے اور اسے دکھائی دیتا ہے کہ جس جگہ اس کے خوش آئند تخیلات کی حسین عمارت قائم تھی وہاں شکستہ کھنڈروں کے نشان بھی اب موجود نہیں ہیں، یہی حال دُنیا کی رعنائیوں اور اس کے پُر اُمید اور خود فریب پرستاروں کا ہے۔ اگر غور کرو گے تو معلوم ہو گا کہ دُنیا اور دُنیا پرست کی کتنی بلیغ تشبیہ ہے ——

ضمناً ایک اور نکتہ بھی سمجھ لو، چونکہ دُنیا آفات و حوادث کا مرکز اور اس کے بالمقابل جنّت اطمینان و سکون اور عافیت و سلامتی کا گہوارہ ہے۔ اس لئے قرآن اس تنبیہ اور تذکیر کے بعد " وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ " کہہ کر جنّت کی زندگی کی طرف بُلاتا ہے، جنّت کو دارالسّلام (سُکھ کا گھر) کہنے کی وجہ یہی ہے کہ یہ مقام اُن تمام آفتوں، پریشانیوں اور بے اطمینانیوں سے مامون ہے جن کی شکار دُنیا بنی ہوئی ہے قرآن بلا لحاظ خاص و عام سب کو اس سلامتی کی طرف دعوت دیتا ہے کہ عدلِ الٰہی اس کا مقتضی ہے اگرچہ ہدایت و معرفت کی سعادت صرف انہیں کو حاصل ہوتی ہے جن کو پروردگارِ عالم اس عزّت و شرف سے نوازتا ہے۔ وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ الخ.

۴ - مُشرکین کے معبُودوں کی بے بسی کی مثال

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا ۭ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (عنکبوت)

جن لوگوں نے خدا کے سوا دوسروں کو اپنا کارساز بنا رکھا ہے۔ ان کی مثال مکڑی کی سی ہے کہ اُس نے ایک گھر بنایا اور کچھ شک نہیں کہ سب گھروں میں کمزور گھر مکڑی کا گھر ہے، کاش یہ لوگ جانتے

یہاں اس حقیقت سے پردہ اُٹھایا گیا ہے کہ مشرکین تو مکڑی کی طرح کمزور و ناتواں ہیں ہی لیکن ان کے اولیاء و شرکاء ان سے بھی زیادہ بے بس اور مجبور محض ہیں، سو ان مشرکین کی ذاتی کمزوری و بے چارگی اور پھر اپنے سے بے بس تر اولیاء سے مدد و قوت حاصل کرنے کی مثال مکڑی اور اس کے گھر کی سی ہے۔ اس مثل کے تحت مشرکین کے انتہائی خسران کا ذکر ہے کہ اگرچہ وہ بے یار و مددگار ہیں لیکن وہ اپنی محرومی اور کمزوری کے نقطۂ کمال پر اس وقت پہنچے جب کہ انہوں نے اپنے سے بھی زیادہ مجبور مخلوق کو اپنا ولی و مددگار بنایا جن سے وہ سوائے ضعف و خسران کے کچھ نہیں پا سکتا

اگر یہ سوال کیا جائے کہ مشرکین و کفّار بھی جانتے ہیں کہ تارِ عنکبوت کمزور ترین شے ہے، پھر اس سے "لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ" کے ذریعہ ان کی واقفیت و علم کی نفی کیوں کی گئی ہے؟ اس کا جواب بالکل واضح ہے۔ آیت کا مقصد ان کے اس علم کی نفی کرنا نہیں ہے کہ مکڑی کا گھر سب سے زیادہ کمزور ہے بلکہ اسی علم کی نفی کرنا ہے کہ خدائے واحد کے سوا جو معبود اور اولیا ٹھیرائے جاتے ہیں، ان کی قوّت اور قدرت تارِ عنکبوت سے زیادہ نہیں ہے، اگر وہ اس حقیقت کو جانتے ہوتے تو ایسا ہرگز نہ کرتے، وہ تو یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ یہی اولیاء ان کو قوت و جبروت بخشیں گے لیکن اس کی حقیقت خواب سے زیادہ نہیں ہے اور نہ کبھی ثابت ہوئی۔ اس مضمون کی بکثرت آیتیں ملتی ہیں جن میں یہی حقیقت بیان کی گئی ہے مثلاً ایک جگہ قرآن کہتا ہے:——

وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا ۝ كَلَّا ۚ سَيَكْفُرُونَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ۝ (مریم-۵)

انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر بہت سے الٰہ بنا رکھے ہیں کہ وہ ان کے مددگار ہوں گے، مگر وہ ہرگز مددگار نہ ہوں گے، قریب ہے کہ وہ خود ان کی بندگی کا انکار کریں گے اور اُلٹے ان کے دشمن ہو جائیں گے——

دوسری جگہ ہے:——

وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنصَرُونَ ۝ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَهُمْ وَهُمْ لَهُمْ جُندٌ مُّحْضَرُونَ ۝ (یٰسین-۵)

ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر بہت سے الٰہ بنا لئے یہ سمجھ کر کہ وہ ان کی مدد کریں گے، مگر وہ ان کی مدد نہیں کر سکتے بلکہ یہ بت پرست ان کے لشکری بنے ہوئے قیامت میں خود جواب دہی کیلئے حاضر ہوں گے۔

ایک مقام پر مشرکین کی ہلاکت و تباہی بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:——

وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلٰكِن ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ فَمَا أَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِي يَدْعُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ مِن شَيْءٍ لَّمَّا جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ ۖ وَمَا زَادُوهُمْ غَيْرَ تَتْبِيبٍ (ہود-۱۰۱)

اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور جب تیرے پروردگار کا حکم (عذاب) آیا تو خدا کے سوا وہ جن معبودوں کو پکارا کرتے تھے وہ ان کے کچھ بھی کام نہ آئے (بلکہ) انہوں نے ان کی تباہی کچھ اور بڑھا دی——

ان چاروں مقامات پر حقیقت آشکارا کی گئی ہے کہ جس نے خدا کو چھوڑ کر شرکا اور اولیاء کا دامن سربلندی و سرفرازی اور نصرت و امداد حاصل کرنے کے لئے پکڑا وہ ناکام رہا اور اس کی یہ عبادت مفید و منفعت بخش ہونے کے بجائے اُلٹی وبالِ جان بن گئی۔ یہ مثل جو اُوپر بیان ہوئی شرک کے ابطال، مشرکین کے خسران اور ان کے انجام کی ہولناکی اور تباہ کاری کی سب سے زیادہ روشن اور بلیغ تمثیل ہے:۔

۵۔ کفّار کے اعمال کا اور ان اُمیدوں کا جو انہوں نے اپنے اعمال کے نتیجہ سے وابستہ کر رکھی ہیں۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ

اور کافروں کے اعمال کی حقیقت چٹیل میدان کی اس چمکتی ہوئی

الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔـا وَّ وَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۙ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّـجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَاۤ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰٮهَا ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۔

(نور - ۵)

ریت کی سی ہے جسے پیاسا دُور سے دیکھ کر پانی خیال کرتا ہے یہاں تک کہ جب اس کے قریب آیا تو کچھ نہ پایا، البتہ اس نے اللہ کو وہاں موجود پایا جس نے اس کا حساب چکا دیا اور اللہ پل بھر میں حساب لے لینے والا ہے، یا ان کے اعمال کی مثال ان تہ بہ تہ تاریکیوں کی سی ہے جو ایک ایسے اتھاہ سمندر میں ہیں جسے موج نے ڈھانک رکھا ہو، پھر اس موج کے اُوپر بھی بادل چھایا ہو۔ غرض ایک کے اُوپر کئی تاریکیاں جمع ہیں کہ اگر کوئی آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اُسے بھی نہ دیکھ پائے اور جسے اللہ ہی روشنی (ہدایت) نہ دے۔ اسے کہیں سے بھی روشنی نہیں مل سکتی

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے کفّار کے بارے میں دو مثالیں بیان فرمائی ہیں، ایک دُور سے چمکتی ہوئی ریت کی، دوسری تہ بہ تہ تاریکیوں کی، اس لئے حق و ہدایت سے اعراض کرنے والے دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں:۔

ایک تو وہ لوگ جنہیں اپنے اوہام و خرافات کی بابت یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ بے بُنیاد نہیں ہیں بلکہ کوئی نہ کوئی بُنیاد رکھتے ہیں لیکن جب حقیقت بے نقاب ہوتی ہے تو ان کے گمان کی اصلیت آشکارا ہو جاتی ہے اور خیالات و اوہام کا تار پود بکھر جاتا ہے، جاہل بدعتیوں اور ہوا پرستوں کا یہی حال ہے کہ یہ لوگ اپنے اہواء و آراء کو علم و بصیرت اور رُشد و ہدایت سمجھے رہتے ہیں لیکن جب اصل حقائق ان کے سامنے آتے ہیں اس وقت ان پر ان کے ظن بے بُنیاد کا راز کُھلتا ہے اور واضح ہوتا ہے کہ ان کے عقائد اور ان کے اعمال کی یہ عمارت جو ان بے اصل عقائد کی بُنیاد پر کھڑی ہے، ایسی ہی ہے جیسے چٹیل میدان کی چمکتی ہوئی ریت جو دُور سے دیکھنے والوں کی نگاہوں میں پانی نظر آتی ہے اور حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔ یہی کیفیت اور یہی انجام ہے اُن اعمال کا جو نہ اللہ کے لئے کئے گئے ہیں نہ احکامِ الٰہی کے اتباع میں، ان اعمال کو صاحبِ عمل نجات اور سُود و بہبود کا ذریعہ سمجھتا ہے حالانکہ اس غلط توقع کا انجام حسرت کے سوا کچھ نہیں۔ یہی وہ اعمال ہیں جن کی بابت حتمی وعدہ بلکہ فیصلہ ہے کہ وَقَدِمْنَاۤ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا۔ (پ ۱۹-۱)

تشبیہ کی بلاغت پر غور کرو! اللہ تعالیٰ نے سراب کے ساتھ "بالقیعہ" کی قید بھی لگائی ہے، قیعہ اس چٹیل میدان کو کہتے ہیں جہاں حیوانی اور نباتی وجود کا نام و نشان تک نہ ہو یعنی محلِ سراب اس سنسان صحراء کو بتایا ہے جو بالکل بے آب و گیاہ اور ہر غیر جمادی وجود سے خالی ہو، اور خود سراب ایک ایسی شئے ہے جو بالکل بے حقیقت و بے اصل ہے۔ اب ان کے اعمال اور قلوب کو، جہاں ایمان و ہدایت کی کسی کرن کا گذر ممکن نہیں، سراب اور اس کے مذکورہ بالا موقع و محل سے مطابقت دو، کیسی چول سے چول بیٹھ جاتی ہے جس طرح اس محلِ سراب میں کسی چیز کا وجود نہیں۔ اسی طرح ان کے دلوں میں آفتابِ ہدایت کی کرنوں کا کوئی گذر نہیں اور جس طرح سراب کی کوئی حقیقت نہیں اسی طرح ان کے دلوں میں آفتابِ ہدایت کی کرنوں کا گذر نہیں توقعات تو بہت ہیں مگر وقت پر ان کے لئے سراب کی طرح معدوم الحقیقت ثابت ہوں گے۔

پھر يَحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً" کی قید مزید پر غور کرو "ظمآن" اس شخص کو کہتے ہیں جو سخت پیاسا ہو۔ ایسا شخص پیاس کی شدت سے بیتاب ہو کر چمکتی ہوئی ریت کو پانی سمجھ کر پاس آتا ہے اور وہاں کچھ نہیں پاتا بلکہ تشنگی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کفّار کا یہی حال ہو گا، ان کے اعمال غیر اللہ کے لئے ہونے اور اطاعتِ رسولؐ پر مبنی نہ ہونے کی وجہ سے بالکل سراب کے مشابہ ہیں، جس طرح پیاسا آدمی چمکتی ہوئی ریت کی طرف پانی سمجھ کر جاتا ہے اور نا کہانی یاس و حسرت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا، اسی طرح میدانِ حشر میں کفّار نہایت احتیاج کی حالت میں بڑی اُمیدِ ل

کے ساتھ اپنے اعمال کی طرف بڑھیں گے لیکن اعمال کا کہیں نام و نشان نہ ہوگا، البتہ خدا موجود ملے گا اُن کا حساب چکا دے گا ـــــ

ہر باطل پرست کا یہی حال ہوگا یعنی باطل اس کے ساتھ اُس وقت دغا کرے گا جب کہ اُسے مدد کی سخت ضرورت ہوگی، کیونکہ باطل کی کوئی اصلیت نہیں ہوتی اس کا مسمّیٰ بھی ویسا ہی باطل ہوتا ہے، جیسا کہ اُس کا اسم۔ پس جب اعتقاد میں حق کی مطابقت نہ پائی جائے گی تو اس سے جو چیز متعلق ہوگی وہ بھی باطل ہوگی۔ اسی طرح عمل کی غرض و غایت اگر باطل ہو، مثلاً عمل خالصتہً لوجہ اللہ نہ ہو یا احکامِ الٰہی پر مبنی نہ ہو تو وہ باطل ہوگا اور عمل کرنے والا اپنی توقع کے خلاف اس کی بدولت مضرت سے دوچار ہوگا۔ نیز اس کے اعتقاد و عمل کی طرف سے غفلت نہ ہوگی۔ کہ مالہٗ وعلیہ کا فرق و امتیاز کئے بغیر فیصلہ ہو جائے بلکہ اسے نفع سے محروم رہنا اور مضرت وعذاب کا مزہ چکھنا ہوگا ـــــ

وَوَجَدَ اللّٰہَ عِنْدَہٗ فَوَفّٰىہُ حِسَابَہٗ وَاللّٰہُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ۔ (نور۔ ۵) ـــــ

یہ اس گم کردہ راہ جماعت کی تصویر و تمثیل تھی جس نے غلط گمان کی وجہ سے اپنے آپ کو ہدایت اور راہِ راست پر سمجھتا تھا ـــــ

اب منکرینِ حق کی دوسری قسم کو لو، جس کے حالات کی تشبیہ ظلماتِ بحر سے دی گئی ہے یہ ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو حق اور رشد و ہدایت کو جان پہچان کر ترک کر دیتے ہیں اور باطل ہی کی تاریکیوں کو اپنے لئے پسند کرتے ہیں۔ ان لوگوں پر ایک دو نہیں کئی طرح کی تاریکیاں چھا جاتی ہیں۔ ایک طرف سے فطرت کی ظلمت کا شکار ہوتے ہیں۔ دوسری طرف رُوح کی ظلمت کا تیسری سمت سے جہل کی تاریکی مسلّط ہوتی ہے (کیونکہ وہ اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتے، انجام کار جہل کا زنگ ان پر بیٹھ جاتا ہے) اور چوتھی طرف اتباعِ ہوا کی۔ ان تہ بہ تہ ظلمتوں میں گھر جانے کے بعد ان کا حال بالکل اس شخص کے مشابہ ہو جاتا ہے جو ایک ایسے دریائے ناپید کنار میں جا پہنچا ہو جس میں لہروں پر لہریں اُٹھ رہی ہوں اور ساتھ ہی اُوپر سے سیاہ بادلوں کی تاریکی بھی اس پر چھائی ہوئی ہو۔ یعنی اس پر تین طرح کی تاریکیاں بیک وقت چھائی ہوئی ہوں۔ دریا کی تاریکی، موجوں کی تاریکی اور بادل کی تاریکی۔ غور کرو، انہیں تاریکیوں کے مشابہ کفّار کے قلوب کی تاریکیاں بھی ہیں۔ فطرت کی تاریکی، رُوح کی تاریکی اور دماغ کی تاریکی ـــــ

سراب (جسے دُور سے پانی یعنی مادّہ حیات سمجھا گیا ہے) اور ظلمات (جو نور کی ضد ہے) کی دونوں مثالیں ان دونوں (ناری و مائی) مثلوں کے مشابہ ہیں جو منافقین اور مؤمنین کے بارے میں اُوپر بیان کی جا چکی ہیں۔ اور جن میں مومنین کا حصّہ "زندگی" اور "نور" دکھایا گیا ہے اور منافقین کا حصہ ان کے برعکس ظلمت اور موت کی ہولناکی بتائی گئی ہے۔ یہی حالت منکرین و منافقین کی زیرِ بحث مثلوں میں بھی بیان ہوئی ہے کہ پانی کی تلاش میں انہیں سراب بلا جو دھوکے سے پانی نظر آ رہا تھا اور جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی، اسی طرح نُور کے بجائے ظلمت جو ایک طرح کی رُوحانی موت ہے، ان کے مقدّر میں لکھی ـــــ

شرک کی نامعقولیت کی مثال

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ ــــــــ فِيْمَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔ (رُوم۔ ۴)

اللہ تمہارے سامنے خود تمہارے اپنے ہی حال سے ایک مثال بیان کرتا ہے۔ جن غلاموں کے تم مالک ہو کیا ان میں سے کوئی بھی اس مال میں جو ہم نے تم کو دے رکھا ہے۔ تمہارا شریک ہے کہ تم اور وہ اسمیں برابر کا حق رکھتے ہو اور ان سے بھی ویسا ہی اندیشہ رکھتے ہو۔ جیسا اپنے (جیسے آزاد حق تصرّف رکھنے والوں) ایسا ہی ہم سمجھے والوں کے لئے کھول کر نشانیاں بیان کرتے ہیں ـــــ

آیت کریمہ میں جس دلیل سے اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے بے بُنیاد مسلک کے خلاف استدلال کیا ہے اسے اصطلاح میں دلیل قیاس کہا جاتا ہے۔ استفہاماً ان کے غلاموں کو ان کا شریک و سہیم قرار دے کر ان کے خلاف ایسی حجت قائم کی ہے جس کی صحت کے وہ کُلی طور پر ایسے معترف ہیں کہ ان کے دماغ میں کبھی اس کی غلطی کا وہم بھی نہیں گذرتا۔ اور یہ دلیل وحجت کا بہترین و بلیغ ترین اسلوب ہے کہ مخالف پر خود اسی کے مسلمات اور بدیہی کلیات سے حجت قائم کی جائے، اللہ تعالیٰ ان نادان انسانوں سے خطاب کر کے فرماتا ہے کہ تمہارے یہ غلام اور لونڈیاں جو تمہارے دست تصرف میں ہیں کیا یہ تمہارے مال ومتاع میں شریک ہیں؟ کیا اپنے ان مملوک کے متعلق تم یہ تصور کر سکتے ہو کہ تمہاری جائیداد میں یہ مساویانہ حصہ داری رکھتے ہیں؟ اور اس تصور کے تحت تمہارے دِلوں میں کبھی یہ خوف پیدا ہوتا ہے کہ کبھی وہ تمہارے مال ومتاع میں سے اپنا حصہ بٹا لیں گے یا اپنے حصہ سے زائد تمہارا حق بھی مار لیں گے۔ جس طرح کہ ایک شریک دوسرے شریک سے عموماً خوف و بے اطمینانی محسوس کیا کرتا ہے؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے "تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ" کی تاویل یہ فرمائی ہے کہ کیا تم کو ان غلاموں سے یہ اندیشہ اور خوف ہے کہ وہ تمہارے مال واسباب کے وارث ہو جائیں گے۔ جس طرح کہ تم میں سے بعض کو بعض کے ترکہ میں حق وراثت حاصل ہوتا ہے؟ بہرکیف آیت کا مقصد یہ ہے کہ تم میں سے کون ہے جو اس بات پر راضی ہوگا کہ اس کا غلام اس کے سرمایہ اور اہل واولاد میں شریک ہو حتیٰ کہ اس کے برابر حق تصرف رکھے اور اس حق تصرف کی وجہ سے اسے یہ اندیشہ لاحق ہو کہ کہیں وہ (غلام) موقع پاکر ساری ملکیت پر تنہا نہ قابض ہو جائے جیسا برابر کے شرکاء میں یہ خطرہ ہر دم موجود رہتا ہے؟ اگر تم اس پر راضی نہیں اور نہ کبھی ایسی نامعقول بات تسلیم کرنے کے لئے تیار ہو تو پھر وہی بات میرے لئے کیوں پسند کرتے ہو؟ اور میری مخلوقات کو، جو میرے حلقۂ غلامی میں ہیں، کیونکر میرا ہمسر اور ہم پایہ قرار دیتے ہو؟ اور جبکہ غلام وآقا کی اس مساوات کے تخیل کو تمہاری عقل اور فطرت بداہتہً غلط سمجھتی ہے (حالانکہ تمہارے حق میں اس کا بہت کچھ امکان بھی ہے۔ اس لئے کہ حقیقت کے اعتبار سے تو تمہارے غلام تمہاری ملک کسی طرح نہیں ہیں۔ بلکہ دراصل وہ تمہارے بھائی ہیں برابر کے۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے انہیں قبضۂ اقتدار دے رکھا ہے، اس لئے محض فرضی طور پر نہ کہ حقیقی طور پر دونوں کے مرتبہ جُداگانہ ہو گئے ہیں اور دونوں کو مجازاً "آقا" اور "غلام" کے الگ الگ نام مل گئے ہیں، ورنہ حقیقتاً تم اور تمہارے غلام دونوں کے دونوں ہی کسی اور ہی حقیقی آقا کے غلام اور بندے ہیں۔ تو میرے حق میں تمہارا ضمیر اسی تخیل کے تسلیم کرنے کی اجازت کیوں کر دیتا ہے حالانکہ وہ تمام کے تمام میرے ہی بندے، میری ہی ملکیت اور میری ہی مخلوق ہیں جن کو تم نے میرا ہم پایہ وہم مرتبہ اور شریک بنا رکھا ہے؟ یہ ہے تفصیل آیات، یعنی كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ کا مطلب۔

۹- ابطالِ شرک کی مثال

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ؕ هَلْ يَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔

خدا نے ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک غلام ہے دوسرے کی ملک جو کسی بات کا اختیار نہیں رکھتا۔ دوسرا شخص ہے (خود مختار) جس کو ہم نے اپنی سرکار سے اچھی روزی دے رکھی ہے تو وہ اس میں سے کچھ چھپ کر اور کچھ کھلے طور پر خرچ کرتا ہے۔ کیا ایسے دو شخص برابر ہو سکتے ہیں؟ (یہ مثالیں سن کر مشرکین ضرور نہیں پکار اٹھیں گے) الحمدللہ (کہ اتنا تو سمجھے) لیکن ان میں سے بہتیرے ایسے بھی ہیں جو اتنا بھی سمجھنے سے قاصر ہیں اور خدا نے (ایک دوسری) مثل دو آدمیوں کی بیان فرمائی ان میں کا ایک گونگا (اور کسی کا غلام بھی) ہے جو کچھ

نہیں کرسکتا (نیز) وہ اپنے آقا کا بارِ خاطر بھی کہ جہاں کہیں اس کو بھیجے اس سے کچھ بھی ٹھیک نہیں بن آتا، کیا ایسا غلام اور وہ جو عدل کا حکم کرتا ہے اور خود بھی سیدھی راہ پر ہے کیا برابر ہوسکتے ہیں ——

ان آیات میں قرآن نے دو مثلیں بیان کی ہیں اور دونوں میں استدلال کا وہ طریقہ اختیار کیا ہے جسے اصطلاح میں قیاسِ عکس کہا جاتا ہے، یعنی کسی شئے سے علتِ حکم کی نفی کرکے اصل حکم کی نفی کرنا، کیونکہ قیاس کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تو قیاسِ عام جس میں نفی علت کی وجہ سے فرع اصل کے حکم کی نفی کی جاتی ہے۔ یہاں اسی طرز استدلال سے زیر بحث مثلوں میں کام لیا گیا ہے ——

پہلی تمثیل اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت اور شانِ ملوکیت اور بتوں کے عجز اور بے کسی کی دی ہے اور بت پرستی کی نامعقولیت پر روشنی ڈالی ہے کہ دیکھو اللہ تعالیٰ عالم کی تمام اشیاء کا مالکِ کل اور ذرۂ ذرّہ کا فرمانروا ہے۔ وہ جس طرح چاہتا ہے مخفی طور پر اور کھلے بندوں شب و روز اپنے بندوں کو انواع اقسام کی نعمتوں سے نوازتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بے حد و حساب دے ڈالتا ہے۔ اس کا خزانہ رزق اتنا وسیع اور لامحدود ہے کہ شبانہ روز کی پیہم بخششوں اور فیاضیوں کے باوجود بھی کم ہونے والا نہیں، اس کے برعکس اصنام و اوثان ایک محکوم اور درماندہ مخلوق ہیں۔ جن کو کسی چیز پر بھی قدرت و اختیار نہیں —— تو مشرکین کو کیا ہوگیا ہے کہ اس عظیم الشان اور روشن از آفتاب فرق کے باوجود کہ میں قادرِ مطلق ہوں اور یہ بت محض، میں مالک ہوں اور یہ مملوک، وہ کس طرح ان بے بس اور درماندہ مورتیوں کو میرا شریک و ہمتا سمجھتے ہیں اور مجھے چھوڑ کر ان کی پرستش کرتے ہیں ——

آیت زیرِ بحث کا دوسرا ٹکڑا یہ ہے :-

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔

اور اللہ ۔ دو آدمیوں کی مثال بیان کرتا ہے ان میں سے ایک گونگا ہے، کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا، اپنے مالک پر بار ہے اسے جہاں کہیں بھی بھیجتا ہے کوئی فائدہ حاصل کرکے نہیں لوٹتا کیا ایسا شخص اس شخص کے برابر ہے جو عدل و قسط کا حکم دیتا ہے اور سیدھے راستے پر ہے ——

اس آیت میں اللہ اور غیر اللہ یعنی معبودِ حقیقی اور معبودانِ باطل کی مثال بیان کی گئی ہے، معبودانِ باطل کی مثال تو اس گونگے آدمی کی سی ہے جو قوت عقل اور گویائی دونوں سے یکسر محروم ہو، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ جو دل اور زبان دونوں کا گونگا ہو، اور پھر اس کے عجز و ناتوانی کا حال یہ ہو کہ کوئی بھلا کرنے کی قدرت اس میں نہ ہو، خواجگی و آقائی کرنا تو درکنار، کم بخت بندگی اور غلامی کرنے میں اتنا گھٹیا ہو کہ اس کا آقا اس سے کوئی بھلا کام نہ لے سکے۔ ان کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کی مثال اس شخص کی سی ہے جو حکمران اور کارفرما ہو معبودانِ بے حیات ہیں عاجز و درماندہ ہیں۔ بندگی میں بھی گھٹیا درجہ پر ہیں، بخلاف اس کے اللہ نہ صرف ذی حیات ہے، بلکہ موجد حیات ہے۔ عاجز نہیں ——

اللہ سیدھے راستے پر ہے اس کا مفہوم :-

اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

میں نے اللہ پر بھروسہ کیا ہے جو میرا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے، ہر چلنے والے جاندار کی پیشانی اسی کے ہاتھ میں ہے بیشک میرا پروردگار سیدھی راہ پر ہے ——

"خدا سیدھے راستے پر ہے" اس جملہ کی گہرائیوں میں اُترو اور دیکھو کہ اس کی تہ میں کتنے انوار پوشیدہ ہیں، سیدھے راستے پر ہونے کا اقتضا ہے کہ وہ جو کچھ فرماتا ہے حق فرماتا ہے، جب حکم دیتا ہے عدل ہی کا حکم دیتا ہے —— جو کچھ کرتا ہے مصلحت، حکمت، رحمت اور عدل کے حدود سے باہر ہو کر نہیں کرتا، مختصر یہ کہ قول اور فعل دونوں لحاظ سے حق پر ہے. پس ناممکن ہے کہ اپنے کسی بندے پر ایک ہر موظلم کا فیصلہ کرے یا بغیر کسی گناہ کے سزا دے، یا اس کی نیکیوں میں سے زبردستی کچھ کم کر دے یا دوسرے کے گناہ کا بوجھ خواہ مخواہ اس پر ڈال دے، جنہیں نہ تو براہ راست خود کیا ہو نہ اس کے لئے کسی حیثیت سے ذریعہ بنا ہو، غرضیکہ وہ کبھی کوئی ایسا کام نہیں کرتا. جو اس کے لئے حمد و ثنا کا باعث نہ ہو اور اچھے اور مفید انجام اور حکیمانہ مقاصد پر مشتمل نہ ہو کیونکہ اس کا صراطِ مستقیم پر ہونا ان تمام باتوں کی نفی کرتا ہے. محمد بن جریر طبریؒ اسی جملہ کی تفسیر یوں فرماتے ہیں:-

"ہمارا پروردگار طریق حق پر اپنے نیک اور محسن بندے کو اس کی نیکی اور احسان کا بدلہ دیتا ہے اور برے کو اس کی برائی کا، کسی پر کوئی ظلم نہیں کرتا اور نہ کسی سے اسلام و ایمان کے ماسوا کسی شئے کو قبول کرتا ہے ——"

اس کے بعد امام مجاہدؒ کا قول نقل کرتے ہیں کہ صراطِ مستقیم سے مراد صراطِ حق ہے ——

ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ جملہ آیت "اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ" بیشک تیرا رب گھات میں لگا ہوا ہے" کا ہم معنی ہے. مگر یہ اختلاف محض لفظی ہے ورنہ اس جماعت کے خیال کا ماحصل بھی وہی ہے جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے کیونکہ خدا کے گھات میں رہنے کا مطلب بھی تو یہی ہے کہ وہ برے کو برا اور اچھے کو اچھا بدلہ دے —— بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس جملہ میں حذف ہے اور اس کی تقدیر یوں ہے. "انّ ربّی یحشکم علیٰ صراط مستقیم، ویحضکم علیہ" یعنی میرا پروردگار تمہیں صراطِ مستقیم پر چلنے کی ترغیب دیتا ہے. اگر ان لوگوں کی اس حذف و تقدیر سے مراد یہ ہے کہ آیت کا مقصود بالذات مفہوم یہی ہے تو وہ غلطی پر ہیں. اس مقدر پر ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے جسے وہ پیش کر سکیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے الگ الگ دو صفتیں بیان کی ہیں. ایک امر بالعدل کی، دوسری صراطِ مستقیم پر ہونے کی. امر بالعدل کے مفہوم و معنی میں وہ بات تو آ ہی گئی جسے یہ لوگ "اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ" کے متعلق فرماتے ہیں پھر دوسرے ٹکڑے کے کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہاں اگر ان کا مقصد اس مقدر کے ماننے سے یہ ہے کہ خدا کا صراطِ مستقیم پر بذاتِ خود ہونا اس امر کو مستلزم ہے کہ وہ اپنے بندوں کو بھی اس کے لئے ترغیب دیتا ہے تو ان کا خیال صحیح ہے ——

ایک جماعت اس جملہ کی تفسیر یہ کرتی ہے "کہ تمام امور اور ساری مخلوق کو خدا ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے. کوئی شئے اس سے بچ کر نہیں نکل سکتی" سو یہاں بھی ہم وہی بات کہنا چاہتے ہیں کہ اگر یہ جماعت اپنے اس قول کو آیت کا مخصوص معنی سمجھتی ہے تو بر سر غلط ہے، ہاں اگر اسے اس آیت کے لوازم اور موجبات میں شمار کرتی ہے تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ——

تفسیروں میں اس آیت کی ایک اور تاویل دیکھنے میں آتی ہے وہ یہ کہ ہر چیز خدا کے قبضۂ قدرت اور ملک میں ہے" بجائے خود یہ بات کتنی ہی حق سہی لیکن جس آیت کی تفسیر میں وہ پیش کی جاتی ہے. اس کا مفہوم ہرگز یہ نہیں. اس بات کے کہنے والوں نے یہ غور نہیں کیا کہ حضرت شعیبؑ نے اپنے قول میں دو جملے فرمائے ہیں. پہلے تو انہوں نے "مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا" فرمایا ہے اس کے بعد "اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ" یہ دونوں جملے الگ الگ ہیں اور دونوں اپنے اپنے مستقل معانی رکھتے ہیں. ان میں سے پہلا جملہ خدا کی قدرت کی ہمہ گیری ظاہر کر چکا تھا، پھر اس جملہ میں اسی بات کو دہرانے کی کیا ضرورت تھی؟ ——

الغرض امام مجاہدؒ کا قول صحیح ہے اور یہی اکثر آئمہ تفسیر کا خیال ہے. ادبی لحاظ سے اس کا دوسرا مطلب ٹھہرانا بہت مشکل ہے. اور اگر غور کرو تو معنوی اعتبار سے بھی یہ خیال نہایت بلند اور پاکیزہ ہے. اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "وہ جسے چاہتا ہے یعنی جس کے بارے میں اس کی حکمت مقتضی ہوتی ہے، گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم پر لے آتا ہے". پس اگر خدا ہی وہ ذات ہے جس نے انبیاء اور ان کے اتباع

کو قولاً و عملاً صراطِ مستقیم پر قائم کیا ہے۔ تو وہ اس امر کا اور زیادہ مستحق ہے کہ اپنے قول اور فعل کے اعتبار سے صراطِ مستقیم پر ہو۔ اور اگر ہدایت یا سب انسانوں کی صراطِ مستقیم اپنے ربّ کے احکام کی موافقت کا ہے خدا کی صراطِ مستقیم نام ہوگا۔ اس کے قولِ حق یا فعل حق کا جو اس کی شانِ حمد اور شانِ کمال کا مقتضا ہے ——

کلامِ باری تعالیٰ سے اور اس میں تدبّر کرنے سے اعراض کرنے والوں کی مثال :۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ ۝ فَرَّتْ مِن قَسْوَرَةٍ

ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اس نصیحت یعنی قرآن سے یوں بدکتے ہیں جیسے جنگلی گدھے شیر سے ڈر کر بھاگتے ہیں ——

یہ ایک نہایت عمدہ اور بلیغ تشبیہ ہے۔ قرآن سے بھاگتے ہی وہ لوگ ہیں جو اس کی حقیقت سے بالکل نابلد ہوتے ہیں۔ ان کی ہیئت نفسی ان جنگلی گدھوں کی کیفیّتِ باطنی سے بالکل مشابہ ہوتی ہے جو کسی بات کی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے اور جب کسی چیز کی آہٹ پاتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ شیر ہی ہوگا لہٰذا سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ اسی طرح قرآن سے بھاگنے والے بھی اپنی حماقت سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی پھاڑ کھانے والی چیز ہے۔ حالانکہ یہ سرچشمہ خیر و سعادت اور منبع حیات ہے۔ پھر راز زندگی کو پیامِ موت سمجھنے والا گدھا نہ ہوا تو اور کیا ہوا؟ —— "مستنفرۃ" کے لفظ میں جو بلاغت ہے وہ "نافرہ" کے لفظ سے ہرگز نہ پیدا ہو سکتی۔ نافرہ کے معنی صرف بھاگنے والے کے ہیں۔ لیکن مستنفرہ کے لفظ میں بھاگنے اور لے بھاگنے' دونوں کا مفہوم شامل ہے جو یہ ظاہر کر رہا ہے کہ فرار کی شدّت اتنی بے پناہ تھی کہ گویا ایک کا فرار اور دوسرے کے لئے بھاگنے کا باعث ہوا اور ایک نے دوسرے کو بھاگنے پر اُبھارا۔ یہ لطف نافرہ کہنے میں پیدا نہ ہو سکتا تھا۔

غیبت کی مثال :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ۝

(الحجرات)

اے ایمان والو بہت زیادہ قیاس آرائیاں کرنے سے پرہیز کرو، کیونکہ گمان و قیاس گناہ بھی ہو جاتا ہے، لوگوں کے حال کا تجسّس نہ کیا کرو، اور ایک دوسرے کی غیبت بھی نہ کیا کرو، کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھائے اور لوگ اس سے گھن کھانے لگیں؟ اللہ سے ڈرو! بیشک وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

کسی مسلمان کے پردۂ ناموس کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی تشبیہ اس کے گوشت کو پارہ پارہ کرنے سے دُنیا قیاس تمثیلی کی کیسی بے نظیر مثال ہے۔ چونکہ غیبت کرنے والا اپنے مسلمان بھائی کی عزّت پر اس وقت حملہ کرتا ہے جب وہ آنکھوں کے سامنے نہیں ہوتا اس لئے اس کا حال بالکل اس شخص کا ہے جو کسی کی رُوح غائب ہو جانے یعنی مر جانے کے بعد اس کے جسم سے گوشت نوچتا ہو اور چونکہ وہ غریب اپنی اس غیبت سے بالکل بے خبر ہوتا ہے اور اپنی مدافعت بھی نہیں کر سکتا۔ اس لئے وہ بمنزلہ اس بے جان لاش کے ہے جس کی بوٹیاں کاٹی جا رہی ہوں اور وہ اپنی بچانے کی قدرت نہ رکھتی ہو۔ نیز چونکہ غیبت کنندہ دوسرے کی متاعِ عزّت سے متمتع ہوتا ہے اور اس کی مذمت سے اپنے نفس کی پیاس بجھاتا ہے۔ اس لئے اس کی تشبیہ گوشت کھانے والے کے ساتھ دی جو مُردہ بھائی کی بوٹیاں چبا کر اپنے پیٹ کی آگ بجھاتا ہے اور اس لحاظ

سے کہ وہ اس بدگوئی کو پسند بھی کرتا ہے اس کی تشبیہ اس شخص کے ساتھ دی گئی جو اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند بھی کرتا ہو۔ ایحب احد کم کے الفاظ اس جُرم کو اور زیادہ سخت بنا دیتے ہیں، کراہت کے ساتھ مُردہ کا گوشت کھانے سے بدتر درجہ یہ ہے کہ رغبت کے ساتھ کھایا جائے اور ظاہر ہے کہ غیبت کرنے والا آدمی اس غیبت سے لذّت بھی لیتا ہے ـــــ

گہری نظر سے اس تشبیہ کے موقع ومحل اور اس کے محاسن پر غور کرو، معقول (مشبّہ) اور محسوس (مشبّہ بہ) میں کیسا کامل تطابق ہے پھر یہ بھی دیکھو کہ اندازِ بیان کیسا بلیغ اور مؤثر ہے۔ بھائی کا گوشت نوچ نوچ کر کھانا طبعاً ہر شخص کو گھناؤنا معلوم ہوتا ہے اور تمام مخاطبین کے اندر اس فطری احساس کراہیت کا موجود ہونا یقینی ہے، لہذا پہلے تو خدا نے اس احساس کی خود خبر دی پھر آیت کے آخر میں تمام مخاطبین کو اس وصف سے متصف قرار دیا (فَكَرِهْتُمُوهُ) نیز اس سے قبل آیت کے شروع میں استفہام انکاری کے ذریعہ اس حقیقت کی مزید توثیق کر دی۔ (أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ) اس طرح ایجابی اور سلبی دونوں پہلوؤں سے اس فطری احساس کو دماغ میں مستحضر کرنے کے بعد ان پر اس امر کو واضح کیا کہ جب یہ شئے تمہاری طبیعت کو گھناؤنی معلوم ہوتی ہے تو پھر کس طرح وہ شئے تمہیں مرغوبِ خاطر ہو سکتی ہے جو اسی کے مشابہ ہے؟

گویا اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ایک ناپسندیدہ شئے سے اس شئے کے خلاف حجّت قائم کی جو انہیں مرغوب ہے۔ پھر شئے مرغوب کو اس شئے نامرغوب کے ساتھ تشبیہ دی جس سے انہیں کابل نفرت اور نہ کم ہونے والی کراہیت ہے۔ پس عقل، فطرت اور حکمت کا عام تقاضا ہے کہ وہ اس شئے سے بھی ویسی ہی نفرت اور کراہیت رکھیں جیسی اس کی نظیر اور مماثل سے رکھتے ہیں ـــــ

اعمالِ کفّار کی بے حقیقتی کی تشبیہ :-

مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ ۖ لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ ـــــ (ابراہیم)

جن لوگوں نے اپنے پروردگار کے سامنے کُفر کیا ان کے اعمال کی مثال اس راکھ کی سی ہے جسے لُو کے دن تیز ہوا اُڑا لے جائے وہ اپنے کئے ہوئے اعمال میں سے کسی عمل (کا ثواب حاصل کرنے) پر قادر نہ ہوں گے۔ یہ ہے پرلے درجے کی ناکامی ـــــ

یہاں اللہ تعالیٰ نے کُفّار کے باطل اور غیر نافع اعمال کو ایسی راکھ سے تشبیہ دی ہے جس پر تیز وتند ہوا کا گزر ہو۔ یعنی چونکہ ان اعمال کی نہ تو ایمان کی بُنیاد پر تعمیر ہوئی نہ خدا کے لئے وہ کئے گئے تھے اور نہ ہی خدا کے حُکم کے مطابق تھے۔ اس لئے خدا کے حضور میں بالکل ہی بے وزن اور بے حقیقت ٹھہریں گے، اتنے بے وزن کہ خدا نے ان کو اس راکھ کے مشابہ قرار دیا جسے بادِ صرصر اِدھر سے اُدھر اُڑا لے جائے اور کوئی شخص اُسے کام میں لانے پر قادر نہ ہو درانحالیکہ وہ اس کا شدید حاجت مند بھی ہوتا ہے، چنانچہ فرمایا ہے کہ :ـــــ

(لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلَىٰ شَيْءٍ) یعنی جن اعمال سے وہ فلاح کی اتنی اُمیدیں باندھے بیٹھے ہیں۔ قیامت کے دن اپنی اُمیدیں اور ضرورتیں پُوری کرنے پر قادر نہ ہوں گے اور وہ اعمال ان کے لئے کسی فائدہ اور ثواب کے موجب ہرگز نہ بنیں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو صرف انہیں اعمال کو شرفِ قبول بخشے گا جو اس کے لئے اور اسی کی نازل کی ہوئی شرع کے موافق ہوں اور ان لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ ان کے کیسۂ اعمال میں خلوص اور طاعتِ الٰہی کا ایک حبہ بھی نہ ہوگا ـــــ

راکھ کے ساتھ ایسے غیر مقبول اعمال تشبیہ دینے میں ایک نہایت لطیف نکتہ مضمر ہے، راکھ کے مادّہ کو کون سی چیز زائل کر کے راکھ بناتی ہے؟ آگ اور ان کے اعمال کو کون سی چیز بے اصل اور بے وزن بنائے گی؟ وہ بھی آگ ہی ہوگی، کیونکہ جو اعمال ایمان باللہ اور اطاعتِ الٰہی کی رُوح سے خالی خولی ہوں گے وہ دوزخ کی آگ کی خوراک بنیں گے۔ مَالِكَ ...

اور نعمت پیدا کرے گا جس طرح کہ وہ اپنے مخلص پرستاروں اور فرماں برداروں کے اعمال ہی سے ان کے لئے لذّت اور نعمت پیدا کرے گا پھر آگ ان اعمال کو جلا کر خاکستر بنا دے گی اور انجام کار یہ منکرینِ حق، ان کے اعمال اور ان کے سارے معبود آگ کے ایندھن ہو جائیں گے۔

کمال کے بعد لغزش کی وجہ - اور اس کی تمثیل :-

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ذّٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (اعراف ۲۲)

اے پیغمبر! ان لوگوں کو اس شخص کی خبر پڑھ کر سناؤ جسے ہم نے اپنی آیات دی تھیں (لیکن اس نے ان پر عمل نہیں کیا) اور ان کی پیروی سے بچ کر نکل بھاگا، پھر شیطان نے اُسے آلیا اور وہ گمراہوں میں شامل ہو گیا، اگر ہم چاہتے تو انہیں آیات کے ذریعہ سے اس کو اونچا اُٹھاتے۔ لیکن وہ تو دُنیا سے چمٹ گیا اور اپنی خواہش نفس کے پیچھے لگ گیا۔ پس اس کی مثال کُتّے کی سی ہے اگر اس کو جھڑکو، مارو، تو بھی اور اگر خاموش رہ کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دو تو بھی زبان باہر لٹکائے رہے۔ یہی مثال ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی۔ پس یہ قصّے اپنے مخاطبین کو سناؤ تاکہ وہ غور کریں ——

یہاں اللہ تعالیٰ نے علمِ ہدایت رکھنے والے دُنیا پرست عالم کی مثال کُتّے سے دی ہے۔ دونوں کی کیفیّات کا تجزیہ کر کے دیکھو کہ دونوں کی فطرت میں کس قدر یکسانی پائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک شخص کو اپنا ہدایت نامہ (کتاب) دیتا ہے اسے علم کی بخشش سے نوازتا ہے، لیکن وہ شکر بجا کر اس پر عمل کرنے کے بجائے اسے پس پُشت ڈال دیتا ہے اور عمل کا ہر قدم خواہشِ نفس کی پیروی میں اُٹھاتا ہے یعنی خدا کی نارضامندی کو اس کی رضا پر اور مخلوق کو خالق پر اور چند روزہ دُنیائے دنی کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے، کُتّے کی جبلّت میں اس کے علاوہ اور کیا چیز ہے؟ اپنے پیٹ کے سوا دُنیا کی کسی چیز سے اسے سروکار نہیں، حرص و آز کا اس کی فطرت پر اس قدر کامل غلبہ ہے کہ چلتے پھرتے اس کی ناک بہر حال زمین سونگھنے میں لگی رہتی ہے کہ شاید کہیں سے بوئے طعام اور اسے اپنی آتشِ معدہ کی تسکین کا موقع مل جائے جب اسے پتھر سے مارا جاتا ہے تب بھی اس کی یہ توقع دُور نہیں ہوتی کہ شاید پتھر کے بجائے نوالہ ہو، پیٹ کا بندہ لپک کر اس کو بھی ایک دفعہ تو دانتوں سے پکڑ ہی لیتا ہے۔ گویا اس کمبخت کے ذہن میں پیٹ اور کھانے کے سوا کسی اور چیز کا تصوّر کبھی آتا ہی نہیں۔ جس چیز کو دیکھتا ہے پیٹ کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اسی حرص کا اثر ہے کہ جب ایک کُتّا کوئی بہت بڑی مُردہ لاش پا جاتا ہے جو صدہا کُتّوں کے کھانے کے لئے کافی ہوتی ہے تب بھی وہ کسی دوسرے کُتّے کو پاس نہیں پھٹکنے دیتا۔ اس میں شریک نہیں کرتا، اور اگر کوئی دوسرا آن موجود ہوتا ہے تو بھونکنا اور کاٹنا شروع کر دیتا ہے کہ وہ بھاگ جائے پھر اس دنائت کے ساتھ ساتھ کس قدر ناپاک طبع اور گندہ فطرت ہوتا ہے کہ تازہ اور صاف کھانے کے مقابلے میں مُردار اور بدبُودار اشیاء کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ اپنے جسم کے سارے اعضاء کو چھوڑ کر بس اپنی شرمگاہ سے دلچسپی رکھتا ہے اور بار بار اسی کو سونگھتا رہتا ہے ——

کُتّے کی ان فطری خصوصیات کو سامنے رکھ کر دیکھو کہ جو شخص کتابِ الٰہی کی ہدایت سے واقف ہو جائے اور اس کی صداقت کو جان لینے کے بعد عملاً اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے، اس کی حالت کُتّے سے کس قدر مشابہ ہے۔ اپنے علم اور اقرار کے خلاف عمل کرنے پر جو چیز اسے مجبور کرتی ہے وہ اس کی حد سے بڑھی ہوئی نفس پرستی کے سوا اور کیا ہے؟ جب وہ پیٹ اور شہوت کا غلام بن جاتا ہے تب ہی تو خدا کو خدا ماننے کے باوجود اس کی بندگی سے انکار کرتا ہے۔ اس کے نفس میں کچھ عرصہ تک ایک کشمکش رہتی ہے۔ ایک طرف اس کا علم کھینچتا ہے اور دوسری

طرف اس کی خواہشات کھینچتی ہیں، آخر کار جب وہ علم کی رسی توڑ کر خواہشات کی طرف ٹوٹ پڑتا ہے تو اس کی حالت بالکل وہی ہوتی ہے جو اُوپر کُتّے کی حالت بیان کی گئی ہے پھر اس کو حلال سے زیادہ حرام کے ساتھ رغبت ہوتی ہے پھر اس کے دل اور دماغ کی جگہ بھی معدہ ہی لے لیتا ہے پھر وہ دُنیا کی ہر چیز کو پیٹ کی آنکھ سے دیکھنے لگتا ہے۔ پھر اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ چار روٹیوں پر اس سے جس چیز کو چاہو قربانی لے لو۔ پھر وہ نوالہ کی توقع پر ہر ذلّت برداشت کرنے پر تیار ہو جاتا ہے اور پیٹ کے بعد اگر کوئی چیز اس کی دلچسپیوں کا مرکز ہوتی ہے تو وہ اس کی شرمگاہ ہے اس کا بس نہیں چلتا کہ ہمہ تن شرم گاہ بن کر رہ جائے ——

ابن جریج کا قول ہے کہ کتّا منقطع القلب ہوتا ہے اس کے اندر دل نہیں ہوتا، اس قول کا مطلب یہ ہے کہ اس کے سینہ میں وہ دِل نہیں ہوتا جو اسے صبر اور وقار پر آمادہ کر سکے اور دُنیا کی خلاظتوں میں رُوح کو لتھڑنے سے روک سکے، بے صبری اور عشقِ دُنیا کا وفور دونوں کی مُشترک خاصیت ہے وہ اس وجہ سے دُنیا پر لوٹا پڑتا ہے کہ اس کی طبیعت دُنیا کے بارے میں غیر معمولی بے صبری اور غیر قانع واقع ہوئی ہے اور یہ اس وجہ سے ہر آن زبان نکالے رہتا ہے کہ حرص اور لالچ کی آگ اس کے کلیجہ میں ہر دم جلتی رہتی ہے۔ کُتّے کی زبان لٹکنے سے باز نہ آئے گی، خواہ تم اسے مار پیٹ کر زبان مُنہ میں رکھنے پر مجبور کر دیا اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اسی طرح جو انسان کُتّے کی سی حالت میں مُبتلا ہو اس کو تم خواہ وعظ و نصیحت کے ذریعہ خدا اور آخرت کا خوف دلاؤ، یا خاموش رہو ہر حال میں اس کا دِل دُنیا ہی میں پھنسا رہے گا ——

ابو محمد ابن قتیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہر جانور بھوک یا پیاس کی شدّت سے بدحواس ہو کر زبان نکالتا ہے مگر کُتّے کا حال سب سے مختلف ہے۔ یہ آرام، تکلیف، تندرستی، بیماری، تشنگی، سیرابی غرض ہر حال میں زبان نکالے رہتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی مثال کُتّے ہی سے دی جو آیاتِ الٰہی کو جانتا ہے کہ خُدا کی طرف سے ہیں اور پھر عملاً اس کی تکذیب کرتا ہے۔ اگر اس کو نصیحت کی جائے تب بھی وہ گمراہی کی دلدل میں پھنسا رہے گا۔ اور اگر نصیحت نہ کی جائے تب بھی، چنانچہ دوسری جگہ ایک آیت میں یہی حقیقت بیان ہوئی ہے۔

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ۭ سَوَاۗءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ۭ

اور اگر تم ان کو ہدایت کی طرف بُلاؤ تو وہ تمہاری پیروی نہ کریں گے، تمہارے لئے یکساں ہے خواہ انہیں حق کی دعوت دو، یا خاموش رہو ——

اب اس مثل کے لئے جو الفاظ اور جُملے استعمال ہوئے ہیں۔ ان کے اسرار و معانی پر ایک نگاہ ڈالو۔ سب سے پہلے آتینٰہ آیاتنا کو دیکھو۔ خدا کہتا ہے کہ ہم نے خاص طور پر اس کو اپنی آیات دیں۔ جو درحقیقت سب سے بڑی نعمت ہیں۔ اس بخشش نعمت کو اپنی ذات کی طرف منسوب فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس بخشش کی قدر و منزلت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ورنہ اگر معمولی سی نعمت ہوتی تو اوتی (اس کو آیت دی گئی تھیں) کہہ دیا جاتا ——

پھر فرمایا فانسلخ منھا یعنی ان آیات کے احاطہ اور اقتدار سے اس طرح نکل بھاگا جس طرح سانپ اپنی کینچلی چھوڑ کر الگ ہو جاتا ہے۔ یا جس طرح کسی جانور کی کھال کھینچی جائے اور وہ گوشت سے الگ ہو جائے، دیکھو پہلے جُملہ کی طرح یہاں خدا نے اس فعل کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا، یعنی یہ نہیں کہا کہ ہم نے اسے اپنی آیات سے دُور کر دیا، کیونکہ یہ تو دراصل اُسی کی بدبختی کا فعل ہے۔ اور اپنی ہوا پرستی کی وجہ سے وہ خود ہی اس محرومی کا سبب بنا ہے —— اس کے بعد آتا ہے " فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ " یعنی شیطان نے اسے پالیا۔ " اتباع " کے معنی یہاں پالینے اور پکڑ لینے کے ہیں، چنانچہ قوم فرعون کے بنی اسرائیل کو پالینے کو اللہ تعالےٰ نے " اتباع " ہی کے لفظ سے ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ " فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ " صبح کے وقت انہوں نے بنی اسرائیل کو جا لیا، شیطان کا حملہ اس وقت اس پر کارگر ہوا جب وہ آیاتِ الٰہی کو پس پشت ڈال چکا تھا۔ اس سے قبل وہ ان آیات کے مضبوط حصار میں مامون و مصئون تھا اور

کسی طرف سے بھی شیطان اس پر قابو نہ پا سکتا تھا اِلّا آنکہ وہ کبھی غافل رہا ہو اور اچانک شیطانی فریب کا چند لمحوں کے لئے شکار ہو گیا ہو، لیکن جب اس نے آیاتِ الٰہی کے اس حصار کو توڑ کر پھینک دیا اور اس سے آزاد ہو گیا تو شیطان نے اپنی کمین گاہ سے جھپٹ کر اسے اس طرح اپنے پنجوں میں داب لیا جس طرح اپنے شکار کو داب لیتا ہے۔ انجام کار وہ ان گمراہوں کے زمرہ میں شامل ہو گیا (فکان من الغاوین) جو حق کو پہچان کر اس کے خلاف عمل کرتے ہیں اور علم ہدایت رکھتے ہوئے اس کے مطابق زندگی نہیں بسر کرتے یعنی علماء سوء ——

پھر فرمایا اگر ہم چاہتے تو ان آیات کے ذریعے سے اُٹھا کر اسے بلندیوں پر لے جاتے" (وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا) یہاں خدا اپنا ایک قانون بیان کر رہا ہے کہ محض علم، خواہ وہ کیسا ہی حقیقی اور عظیم کیوں نہ ہو، خدا کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ قدر و منزلت کی چیز دراصل اتباعِ حق اور پروردگار کی رضا جوئی ہے اور علم کی قدر بھی اسی لئے ہے کہ وہ عملِ صحیح کا ذریعہ ہے۔ اگر علم ہو اور اس کے خلاف عمل کیا جائے تو یہ انسان کو اور زیادہ غضب کا مستحق بنا دیتا ہے ——

ضمناً ایک نکتہ اور بھی اس انداز بیان سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بندے کا اپنے علم کے ذریعہ سے بلند مرتبہ پر پہنچنا حقیقت میں اللہ کی توفیق پر منحصر ہے۔ اگر اللہ کی طرف سے توفیق نہ ملے تو کوئی شخص اپنے علم کے بل بوتے پر اس نعمت کو حاصل نہیں کر سکتا، کیونکہ مجرد علم کوئی وزن نہیں رکھتا۔ خود علم میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ کسی نیچے کو اُونچا کر دے۔ بلندی پر پہنچنے کے لئے علم کے ساتھ دوسرے بہت سے اسباب کی ضرورت ہوتی ہے جو اگر مساعد نہ ہوں تو علم کے باوجود آدمی پست حال رہتا ہے۔ اور اسباب کا مساعد ہونا اللہ ہی کی توفیق پر منحصر ہے —— ایک گروہ کہتا ہے کہ "لَرَفَعْنَاهُ" میں جو ضمیر ہے اس کا مرجع کفر ہے نہ کہ وہ شخص جس کی تمثیل بیان کی گئی ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے آیت کی تفسیر یہ ہوگی اگر ہم چاہتے تو اپنی دی ہوئی آیات کے ذریعے سے اس شخص کے اندر سے کفر نکال دیتے، امام مجاہدؒ اور عطاؒ اسی طرف گئے ہیں۔ اگرچہ یہ خیال بھی اپنی جگہ صحیح ہے لیکن پہلے جو مفہوم بیان کیا جا چکا ہے وہی اس آیت کا اصلی مفہوم ہے اور یہ دوسرا مفہوم اس کے لوازم میں سے ہے۔ دونوں اقوال میں کوئی منافات نہیں۔ جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں سلف کی تفسیر کا یہ بھی ایک اصول اور طریقہ تھا کہ وہ بسا اوقات آیتوں کی حقیقی مراد بیان کرنے کے بجائے اس کے لوازم اور مقتضیات بیان کر دیا کرتے تھے، جو لوگ ان کے اس طریقہ سے ناواقف ہیں وہ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ان کے نزدیک آیت کا مفہوم ہی یہی ہے ——

کتابِ الٰہی پر عمل چھوڑ دینے والے علماء کی مثال :-

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (جمعہ)	جن لوگوں کو توراۃ دی گئی پھر انہوں نے اسے اُٹھانے سے (اس کے احکام پر عمل کرنے سے) عملاً انکار کر دیا ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں، جو لوگ آیاتِ الٰہی کو جھٹلاتے ہیں ان کی مثال بہت بُری ہے اور اللہ راہِ راست سے تجاوز کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتا ——

یہاں ان بدبخت علماء کی مثال بیان کی گئی ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب دی تاکہ وہ اس پر ایمان لائیں، اس میں غور و تدبر کریں، اس کے فرمان کے مطابق عمل کریں، لیکن انہوں نے اس عطیۂ الٰہی کے ساتھ اعتناء نہ کیا، اس کی تعلیمات کی عملاً مخالفت کی، اور اس کی آیات کو طوطے کی طرح پڑھ لینے کے سوا ان سے کوئی تعلق نہ رکھا، وہ جب کتابِ الٰہی کے الفاظ زبان سے دُہراتے تو ان کی تلاوت بس حلق سے اُوپر ہی اُوپر رہتی، دل پر ایسا قفل چڑھا رہتا کہ کتاب کا کوئی اثر اندر تک نہ پہنچنے پاتا، اس طرح فہم و تدبر اور عمل و اتباع کے بغیر محض کتاب کے الفاظ دُہرانے

والوں کو اللہ تعالیٰ نے اس گدھے سے تشبیہ دی ہے جس کی پُشت پر کتابوں کا انبار لدا ہوا ہوتا ہے۔ اور اسے مطلق علم نہیں ہوتا کہ اس میں کیا ہے۔ اس کا واسطہ ان کتابوں سے بس اتنا ہی ہے کہ وہ انہیں لادے پھر رہا ہے ــــــ

یہ تمثیل اگرچہ یہود کی بیان کی گئی ہے لیکن معنوی حیثیت سے یہ ان لوگوں پر بھی چسپاں ہوتی ہے جنہیں قرآن دیا گیا ہے، مگر نہ وہ اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں نہ اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ نہ اس کے حقوق اَدا کرتے ہیں، نہ اس کو قانون کی حیثیت سے مانتے ہیں۔ ان کے ساتھ کمالِ اعتناء صرف اس قدر ہے کہ حریر و دیبا کے خوشنما جزدانوں میں اسے لپیٹ کر طاقچوں پر رکھ دیا جائے اور بس تبرک کے لئے ان کی تلاوت کر لی جائے ــــــ

مشرکین کی حسرتناک اور کس مپرسانہ ہلاکت کی تمثیل :۔

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۙ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَیْرَ مُشْرِكِیْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّیْرُ اَوْ تَهْوِیْ بِهِ الرِّیْحُ فِیْ مَكَانٍ سَحِیْقٍ ○ ـــ

(حج - ۴)

پس بُت پرستی کی نجاست سے دُور رہو اور دروغ گوئی سے بچتے رہو۔ ہر طرف سے کٹ کر صرف اللہ کے ہو رہو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور جو خُدائے واحد کے ساتھ شرک کرتا ہے اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ گویا وہ آسمان سے گر پڑا، پھر یا تو اُسے پرندے اُچک لے جائیں گے، یا ہوا کسی دُور دراز مقام پر لے جا کر ڈال دے گی ــــــ

اس تمثیل پر غور کرو اور دیکھو۔ اللہ کے ساتھ اغیار کو شریکِ الوہیت کرنے والوں کے انجام اور حالات کی کیسی کامل تصویر ہے۔ اس تشبیہ میں دو پہلو ہو سکتے ہیں ــــــ (۱) اسے تشبیہ مرکّب مانا جائے، یعنی مشبّہ اور مشبّہ بہ میں باہمی مطابقت ان کے ہر ہر جزء کی حیثیت سے نہ ہو، اس صورت میں مشرک کی اس حالت کو، کہ اس نے خود اپنے ہاتھوں ہلاکت کا ایسا پھندا اپنے گلے میں ڈال لیا ہے جس سے رہائی کی توقع ہی ناممکن ہے، اس شخص کے حال اور انجام سے مشابہت دینا مقصود ہوگا جو آسمان سے گر پڑا ہو اور فضا ہی سے پرندے اسے اُچک کر اس کی تکا بوٹی کرنے لگیں یا ہوا کے تیز و تند جھونکے اسے اُڑا کر کسی دُور دراز اور سنسان مقام پر ڈال دیں جہاں زندگی کی بقا و حفاظت کی کوئی کوشش نہ ہو پس جس طرح اس شخص کی ہلاکت یقینی اور ناگزیر ہے اور اسے ہلاکت سے کوئی نجات نہیں دلا سکتا۔ اسی طرح توحید کے رشتہ کو چھوڑ کر کوئی شخص ہلاکت سے مفر نہیں پا سکتا ــــــ

(۲) اسے تشبیہ مفرق مانا جائے جس میں مشبّہ اور مشبّہ بہ کے تمام متقابل اجزاء میں مطابقت ہوتی ہے۔ اس صورت میں خالص انسانیت کے مقام کو جس کا فطری مقتضا خدائے واحد کی بندگی ہے۔ اور جس کی خلقی رفعت کا تقاضا یہ ہے کہ کسی مخلوق کے آگے سر نہ جُھکایا جائے، آسمان سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس سے اُوپر اللہ کا قبضہ ہے اور سب کچھ اس کے نیچے ہے۔ جو شخص خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا الٰہ اور رب اور خداوند اور اُن داتا اور مالک امر و نہی بناتا ہے، یا خداوندی میں دوسروں کو خدا کا شریک قرار دیتا ہے، اس کی حالت ایسی ہے کہ وہ گویا آسمان سے گر کر تحت الثریٰ کی طرف چلا آ رہا ہے۔ اب جو وہ اس پستی کی طرف چلا تو اس کے دو ہی انجام ہوں گے ــــــ یا تو وہ ان فاسق و ظالم حکمرانوں اور جھوٹے مذہبی پیشواؤں کے چنگل میں پھنس جائے گا جو اس کی بوٹیاں شکاری پرندوں کی طرح نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ یا پھر خود اپنی ہوائے نفس کے طوفان میں گھر جائے گا اور وہ اسے کہیں سے کہیں اُڑائے لئے پھرے گی ــــــ

شرک کی نامعقولیت اور شرکاء کی بیچارگی کی مثال

يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهُ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَن يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ وَإِن يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنقِذُوهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ ٥ مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ

(حج - ۱۰)

اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے اسے غور سے سنو۔ اللہ کے ماسوا جن ہستیوں کو تم بحیثیت معبود پکارتے ہو، وہ (اس قدر عاجز و بیچارہ ہیں کہ) ایک مکھی تک نہیں پیدا کر سکتے۔ وہ سب کے سب مل کر ہی کیوں نہ پیدا کرنا چاہیں۔ اور اگر مکھی (جیسی ادنیٰ اور ہیچ مخلوق) ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اس سے اس چیز کو واپس بھی نہیں لے سکتے۔ طالب اور مطلوب دونوں ایک جیسے کمزور ہیں۔ لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو پہچانا نہیں جیسا کہ پہچاننے کا حق تھا بیشک اللہ قوت اور غلبہ والا ہے۔ (اس کے علاوہ ساری موجودات اس صفت سے بالکل محروم ہیں) ——

یہ مثال اس ...... قابل ہے کہ ہر انسان اپنے قلب پر اس کو نقش کرلے اور اس کے معارف میں غرق ہو کر فلسفۂ الوہیت پر غور و فکر کرے۔ اگر دل میں حق کی طلب ہو گی تو ناممکن ہے کہ وہ جمالِ واحدانیت سے مسحور ہوئے بغیر اس کی گہرائیوں سے واپس آئے۔ یہ تمثیل شرک کی جڑ بنیاد کھود کر رکھ دینے والی ہے کیونکہ یہ ایک بدیہی اور مسلّمہ حقیقت ہے کہ معبودیت کا کمتر سے کمتر درجہ یہ ہے کہ معبود اپنے بندوں کو نفع پہنچانے اور ان سے نقصان کو دفع کرنے پر قادر ہو۔ ورنہ اگر وہ اپنے اندر اتنی بھی سکت نہیں رکھتا تو اسے کیا حق ہے کہ اپنی پرستش کرائے اور لوگ اس کی پرستش کریں؟ —— لیکن مشرکین کے معبودوں کا کیا حال ہے؟ نفع و نقصان پہنچانے کی قدرت رکھنا تو بڑی چیز ہے وہ غریب اتنے بے بس، اتنے لاچار اور اتنے عاجز ہیں کہ سب مل کر بھی ایک مکھی تک نہیں پیدا کر سکتے، اور پیدا کرنا تو درکنار اگر مکھی جیسی کمزور مخلوق اُن کے چڑھاوے میں سے کوئی چیز لے اُڑے تو یہ کائنات کے "فرمانروا" اتنی قوت بھی نہیں رکھتے کہ اس سے اس چیز کو چھین کر واپس لے لیں۔ اور اس سے اس گستاخی کا انتقام لیں، گویا ان سے بڑھ کر ضعیف اور عاجز و ناتواں ہستی کوئی نہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی درست ہوش و حواس رکھنے والا انسان ایسی ہستیوں کے آگے سر جھکانے کو گوارا کس طرح کر سکتا ہے ——

یہ مثال شرک کی نامعقولیت اور مشرکین کی بے عقلی اور سفاہت پر ایک حجۃ بالغہ کی حیثیت رکھتی ہے اس کا طرزِ استدلال قرآن کے بلیغ ترین استدلالات میں سے ہے اس کی روشنی میں دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیطان ان مشرکین کی عقلوں کو کس طرح الٹ دیتا اور کس حد تک ماؤف بنا دیتا ہے کہ وہ پتھر کی بے جان مورتیوں میں، جن کی طاقت اور قدرت کا یہ حال ہے کہ معمولی اور حقیر سے حقیر مخلوق کو بھی پیدا نہیں کر سکتیں، حتیٰ کہ اگر حقیر ترین مخلوق ان کی جناب میں گستاخی کر کے کوئی چیز سامنے سے اُچک لے جائے تو سب کی سب مل کر بھی اسے چھڑا کر واپس نہیں لے سکتیں، ایسی بے جان اور بے حقیقت مورتیوں میں یہ عقل کے دشمن الوہیت جیسی چیز کا جلوہ دیکھتے ہیں اور انہیں معبود اور الٰہ سمجھ کر ان کے سامنے پیشانیاں ٹیکتے ہیں۔ حالانکہ معبود اور الٰہ کی معبودیت و الوہیت کا ابتدائی اور بنیادی تقاضا یہ اس نے ساری مخلوقات کو پیدا کیا ہو، قادرِ مطلق ہو، ہمہ دان ہو، سب سے بے نیاز ہو، سب کا ملجا و مرجع ہو، فریاد رس اور معدلت گستر ہو ——

اس حقیقت کے اظہار کے بعد کہ الوہیت کے مقام اور اصنام کی حیثیت میں کتنا بعد المشرقین ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ :۔ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ "۔ یعنی عابد و معبود دونوں یکساں ضعیف اور ناتواں ہیں۔ یہ تفسیر ان لوگوں کی ہے جن کا خیال ہے کہ یہاں طالب سے

مُراد عابد اور مطلوب سے مُراد معبود ہے، یعنی ایک عاجز دوسرے عاجز سے چشمِ اُمید رکھتا ہے یا پیاسا پیاسے سے پانی مانگ رہا ہے اور یہ کتنی بڑی نادانی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں سالب اور مسلوب کی یکسانی دکھائی گئی ہے، یعنی معبودانِ باطل اور مکھی دونوں ضعف و بیچارگی کے لحاظ سے برابر ہیں۔ اس تاویل کی رُو سے طالب وہ بُت ٹھہرے اور مطلوب مکھی جو ان کا چڑھاوا لے اُڑی ہو۔ ایک تیسری تاویل اور بھی ہے جو دوسری کے بالکل برعکس ہے، ہمارے نزدیک لفظ کی وسعت اور عمومیت ان سب تاویلات پر محیط ہے اور ضعف کی نسبت عابد معبود (بُت) اور سالب (مکھی) سب کی طرف ہے۔ پس ایسی ضعیف ہستی کو جو اپنی ہی طرح بے دست و پا ہو، اپنا مسجود اور اللہ قادر کا شریک قرار دینے والا در اصل الوہیت کے تصوّر سے عاجز ہے اور معبود کے علو و کمال کا در اصل کوئی احساس نہیں رکھتا۔ ورنہ اس سے یہ ظلمِ عظیم ہرگز سرزد نہ ہوتا ——

کُفّار کے پتھر جیسے سخت دلوں سے حق کی آواز ٹکرا کر کس طرح ناکام واپس آتی ہے، اس کی مثال:

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ○

(البقرہ - ۲۱) ——

کُفّار کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ایک ایسی چیز کو پُکار رہا ہو جو پُکارنے اور بُلانے کی آواز کے سوا کچھ نہیں سُنتی (یعنی پُکارنے والے کا مطلب بالکل نہیں سمجھتی) یہ کافر لوگ بہرے گونگے بہرے اور اندھے ہیں جو کچھ سمجھ بوجھ نہیں رکھتے ——

" نعیق " چرواہے کی اس آواز کو کہتے ہیں جسے وہ گلّے کو پُکارنے اور بُلانے کے وقت اپنے مُنہ سے نکالتا ہے۔ تجزیہ کرنے سے اس تشبیہ میں مشبّہ بہ کے دو اجزاء اور افراد نکلتے ہیں۔ ایک ناعق یعنی چرواہا۔ دوسرا منعوق بہ یعنی گلہ۔ رہ گیا یہ امر کہ چرواہے اور گلّے سے تشبیہ کس چیز کو دی گئی ہے۔ سو اس بارے میں علماء تفسیر کے چند مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول کے مطابق ناعق سے مُراد بُت پرست ہے جو اپنے بُتوں کو بوقتِ احتیاج بُلاتا ہے اور ان سے دُعائیں مانگتا ہے۔ اور منعوق بہ سے مُراد وہ بُت ہیں جنہیں اس کے پُجاری بُلاتے ہیں۔ اس تاویل کے لحاظ سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ بُتوں کو بُلاتے اور ان سے دُعائیں اور منتیں مانگتے وقت کُفّار کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جو اپنے جانوروں کو چلا چلا کر بُلاتا ہے اور وہ اس کی آواز کو سمجھتے تک نہیں۔ عبدالرحمٰن ابن زید وغیرہ کا یہی خیال ہے ——

علامہ زمخشریؒ اور دوسرے بہت سے اہلِ تفسیر نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے۔ کہ " اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً " کے الفاظ اس تاویل کا کسی طرح ساتھ نہیں دیتے، کیونکہ بُت تو مطلقاً کسی آواز یا پُکار کو سُنتے ہی نہیں اور آیت کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اگر منعوق بہ پُکارنے والے کی بات کو سمجھتا تو نہیں مگر سُنتا ضرور ہے۔ لہٰذا یہاں بُتوں کو مشبہ نہیں قرار دیا جا سکتا ——

اس اعتراض کے تین جواب دیئے گئے ہیں: ——

ایک یہ کہ اس جگہ لفظِ اِلَّا زائد ہے اور آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ " کُفّار کی مثال اس شخص کی ہے جو کسی ایسی چیز کو بُلا رہا ہو جو پُکارنے اور چلّانے کی آواز تک نہیں سُنتی " ظاہر ہے کہ یہ کس قدر پھیکا اور غلط جواب ہے۔ قرآن کی تفسیر اگر اس انداز سے کی جائے کہ جس لفظ کو جہاں چاہا زائد کہہ دیا، اور جس کو جہاں ضرورت سمجھی محذوف قرار دے دیا۔ تو قرآن تو بازیچۂ اطفال بن جائے گا۔ اور تحریفِ معنوی کا دروازہ روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے —— دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں تشبیہ میں پیشِ نظر محض دُعاء (بُلانا اور آواز دینا) ہے اور بتانا یہ مقصود ہے کہ

بُلانے کا انجام دونوں جگہ یکساں ہے۔ اس جگہ مدعو کی (یعنی جس کو بُلایا گیا ہو، اس کی) خصوصیات سے بحث نہیں ہے۔ اس لئے اگر مشبہ بہ میں ایک ایسی زائد صفت اور خصوصیت پائی جائے جو مشبہ میں موجود نہیں تو اس سے نفس تشبیہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا ——

تیسرے جواب کی رُو سے آیت کی توضیح اس طرح ہو گی کہ ایسے خود ساختہ معبودوں سے، جن کو احساس تک نہیں ہوتا کہ انہیں مخاطب کر کے کوئی کیا کہہ رہا ہے، دعائیں مانگنے والوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اپنے ریوڑ کو بُلا اور پکار رہا ہو اور اس پر اس کے بُلانے اور چلّانے کا کوئی اثر نہ رہا ہو اور اس کی ساری چیخ پکار کا حاصل صرف یہی ہوتا ہو کہ بس وہ بُلائے جا رہا ہے۔ یہی مُشرک کا حال ہوتا ہے جبکہ وہ اپنے گونگے بہرے خداؤں کو گڑگڑا، گڑگڑا کر بُلاتا ہے۔ اور گڑگڑانے اور دعائیں مانگنے کی محنت مشقّت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا"۔

دوسری تاویل یہ کی گئی ہے کہ کفّار کی مثال ان بہائم کی سی ہے جو چرواہے کی پکار کا مطلب بالکل نہیں سمجھتے۔ صرف اتنا محسوس کرتے ہیں کہ اس کے حلق سے آواز نکل رہی ہے یعنی اس تاویل کے قائلین کے نزدیک راعی سے مُراد پیغمبر ہے جو کفّار کو حق کی طرف بُلا رہا ہے مگر ان پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ سیبویہ نے —— آیت کی تشریح اسی طرح کی ہے ——

اس تمثیل کو تشبیہ مرکب بھی مانا جا سکتا ہے اور تشبیہ مفرق بھی۔ پہلی صورت میں صدائے حق کو نہ سمجھنے اور اس سے فائدہ نہ اُٹھانے والے کفّار کی تشبیہ دینی مقصود ہو گی اُس گلہ سے جو چرواہے کی پکار کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں سمجھتا کہ وہ کچھ بول رہا ہے اور اگر اسے تشبیہ مفرّق مانا جائے یعنی وہ تشبیہ جس میں مشبہ اور مشبہ بہ کے تمام متقابل اجزاء میں مماثلت اور مشابہت ضروری ہوتی ہے تو اس صورت میں کفّار بمنزلۂ بہائم کے ہوں گے اور دعوتِ حق بمنزلۂ نعیق (جانوروں کو بُلانے کی آواز) کے ہو گی اور ان کفّار کا اس دعوتِ حق کو صدائے محض سمجھنا بمنزلۂ ادراک بہائم کے ہو گا جو چرواہے کے بُلانے اور پکارنے کی آواز کو ایک بے معنی آواز سے زیادہ نہیں سمجھتے ——

انفاق فی سبیل اللہ اور انفاق فی سبیل الطاغوت کی مثال۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

جو لوگ اپنا مال راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں ان کی (خیرات کی) مثال اس دانے کی سی ہے جس میں سات خوشے اور ہر خوشہ میں سو دانے پیدا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے برکت عطا کرتا ہے اور اللہ وسعت اور قدرت رکھنے والا نیز ہر شے سے باخبر ہے ——

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ——

... اے ایمان والو اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور (سائل کو) ایذا دے کر اکارت نہ کرو اس شخص کی طرح جو اپنا مال محض لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان پر (تھوڑی سی) مٹی پڑی ہو، پھر اس پر تیز بارش ہو اور (مٹی کی اس پتلی سی تہ کو بہا کر) چٹان کو چکنی اور سپاٹ کر کے چھوڑ دے (یہی انجام ہے ریاکار صدقہ دہندوں کا قیامت میں) یہ لوگ اپنے دیئے ہوئے صدقات میں سے کچھ نہ حاصل کر سکیں گے اور اللہ ناشکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۙ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ——

(بقرہ-۳۶ ع)

اور ان لوگوں کی مثال جو اپنا مال خرچ کرتے ہیں محض خدا کی رضا جوئی کے لئے نیز خلوص اور ثباتِ قلبی کے ساتھ، ان کی خیرات کی مثال ایک باغ کی سی ہے جو ٹیلے پر واقع ہے، پھر اس زور کا مینہ برسا اور (عام انداز سے) دوگنا پھل لایا اور اگر اس پر زور کی بارش نہ بھی ہوئی تو اسے ہلکی پھوار (بھی بس کرتی ہے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے سارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو اور اس کے نیچے نہریں پڑی بہ رہی ہوں، اس میں ہر قسم کے میوے ہوں اور بڑھاپا اُسے آلے، اور اس کے چھوٹے چھوٹے ناتواں بچے ہوں (ایسی حالت میں) باغ پر آتشیں بگولا چلے اور وہ جل بھن کر رہ جائے۔ اللہ تعالیٰ اپنی آیات تمہارے لئے یونہی کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم غور کرو ——

یہ ایک مفصّل تمثیل ہے جس میں انفاق لوجہ اللہ اور انفاق ریائی دونوں کی حقیقت اور دونوں کے انجام اور ثمرات کی تصویر کھینچی گئی ہے پہلے انفاق فی سبیل اللہ کے انجام کی مثال دی گئی ہے کہ خدا کی راہ میں۔ خواہ جہاد میں یا کسی نیک کام میں خرچ کرنے والے کی مثال اس شخص کی سی ہے جو زمین میں بیج ڈالتا ہے اور ہر بیج سے سات خوشے پیدا ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک کے اندر سو سو دانے ہوتے ہیں۔ گویا ایک دانہ بو کر سات سو حاصل کرتا ہے، اللہ کے لئے مال قربان کرنے والا یونہی اپنا مال ضائع نہیں کرتا بلکہ درحقیقت کئی گنا اسے بڑھاتا ہے۔ اس بڑھوتری کا انحصار خرچ کرنے والے کے خلوص اور ایمان پر نیز مال کی نافعیت اور حقدار کی حیثیت پر ہے، کیونکہ صدقہ کا ثواب صدقہ دینے والے کی قلبی کیفیت کے لحاظ سے متفاوت ہوا کرتا ہے۔ نیّت ایک میزان ہے جس پر ہر عمل کا وزن کرکے اس کا بدلہ متعیّن کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آگے چل کر اس انفاق کی، جس کی ثواب حد مذکورہ تک پہنچنے والا ہے، یعنی کمالِ انفق کی دو صفتیں بیان کی ہیں، ایک تو یہ کہ وہ محض اللہ کے لئے ہو، شہرت پسندی اور ریاکاری کا اس میں شائبہ تک نہ ہو۔ دوسری صفت تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ کی ہے۔ تثبیت کا مطلب یہ ہے کہ صدقہ خیرات دینے والا صدقہ نکالتے وقت دل میں کسی قسم کی تنگی نہ محسوس کرے بلکہ کھلے دل سے اور ثباتِ قلب کے ساتھ دے اور مال کو اپنے ہاتھ سے نکالنے سے پہلے اپنے دل سے نکال دے۔ یہی تثبّتِ نفس ہے جو اموالِ خیرات کی مقدار اور نوعیّت کے ساتھ مل کر خیرات کی قدریں مقرّر کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ سیکڑوں گنا زیادہ معاوضہ تک پہنچ جاتی ہیں ——

اس کے بعد یہ دیکھو کہ اس صدقہ کی حقیقت کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی معنویت کو کس طرح مشہود کرایا ہے۔ سو پہلے تو اللہ نے صدقہ کو بیج سے تشبیہ دی ہے، گویا اپنے پاک مال کو بغیر کسی دوسرے جذبہ کے خلوصِ دل سے خدا کی راہ میں خیرات کرنے والا ایک کسان ہے جو اپنے مال کو عمدہ اور ستھری زمین میں بوتا ہے۔ اب پیداوار کا کم و بیش ہونا بیج کی عمدگی، زمین کی زرخیزی، پودوں کی آبپاشی اور خودرَو گھاس پات سے ان کی حفاظت پر منحصر ہے۔ اگر یہ تمام لوازم بدرجہ کمال موجود ہو جائیں اور کھیتی پر کسی قسم کی ارضی یا سماوی آفت نہ آئے تو وہ نہایت شاداب اور زوردار ہوگی۔ اور اس کی مثال اس باغ کی سی ہوگی جو اونچی زمین پر واقع ہے جہاں اسے ہر وقت کھلی ہوا، دھوپ اور روشنی مل رہی ہے اور اس کے درخت پوری آزادی کے ساتھ نشوونما حاصل کر رہے ہیں، پھر ابر بہار آتا ہے اور جی کھول کر اسے سیراب کرتا ہے، انجام کار اس کے درخت دوسرے

درختوں کی بہ نسبت دوچند پھل لاتے ہیں اور اگر موسلادھار بارش نہیں بھی ہوتی تو ہلکی سی بارش بھی اس کے لئے کافی ہوتی ہے کیونکہ اس کی زمین اُپنے اندر روئیدگی کی کامل استعداد رکھتی ہے ـــــ

یہی حال اس صدقہ کے نشوونما اور اس کی برومندی کا جو خلوص اور للّٰہیت کی مقدس زمین میں بویا جاتا ہے۔ اسبابِ نمو کے تفاوت کے لحاظ سے اس کے حاصل میں بھی تفاوت ہوتا ہے۔ وابل (زور کا مینہ) اور طل (ہلکا مینہ) کے الفاظ اسی تفاوت کی طرف اشارہ کرتے ہیں بعض صدقے وابل کی حیثیّت رکھتے ہیں۔ اور بعض طل کی۔ جو جیسا راہِ خدا میں دے گا ویسا ہی وہاں سے اُجر بھی پائے گا ـــ

اس کے برعکس معاملہ ہے اس شخص کے انفاق کا جو خرچ تو کرتا ہے۔ لیکن بے فائدہ جس کا کوئی حاصل نہیں، یعنی خدا کے لیے اور ثبت نفس کے ساتھ نہیں دیتا، بلکہ شہرتِ طلبی اور ریاکاری کے جذبہ کے ماتحت دیتا ہے، انجام کار اس کا سارا دیا دلایا اکارت جاتا ہے ایسے شخص کی مثال اللہ تعالیٰ نے اس بدبخت اور حسرت نصیب انسان سے دی ہے جس کے پاس کھجور اور انگور کے بیش قیمت باغات ہوں جس کے نیچے نہریں پڑی بہ رہی ہوں اور اسے برابر سیراب وشاداب رکھتی ہوں۔ ہر قسم کے پھل لگے ہوئے ہوں اور وہ خود کہن سالی کی عمر کو پہنچ چکا ہو، اس کی اولاد خرد سال اور ناتواں ہو یعنی نہ خود کمانے کی سکت رکھتا ہو اور نہ بچے اس قابل ہوں۔ ایسی حالت میں جب کہ وہ باغ کی برومندی کا سخت حاجت مند ہے ـ لوؤں کی لپٹ آئے اور سارے باغ کو جھلس کر خشک کر دے۔ بالکل یہی حال اس شخص کا جو کھانے کے لئے اپنا مال خیرات کیا کرتا ہے۔ ابھی تو اپنی فیاضی کے غرور میں سرمست ہے لیکن جب اس فیاضی کی قیمت معلوم ہونے کا وقت آئے اور داورِ محشر کے سامنے اس کا اعمالنامہ کھولا جائے گا تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ ہو گی کہ جس کشتِ عمل کی شادابی اور ثمرداری پر وہ اس قدر نازاں تھا اور اس پر اعتماد کئے بیٹھا تھا، عین اُس وقت جبکہ وہ اس کے ثمرات کا سخت حاجت مند ہے ساری کھیتی جل کر خشک ہو چکی ہے، اور مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ اب دوبارہ جوتنے بونے کا موقع بھی نہیں۔ وجہ مشابہت دونوں کے انجام میں صاف ہے، یعنی شدید احتیاج کے وقت نعمت کا چھن جانا، آرزؤں کا تاراج ہو جانا اور ہیبت ناک حسرتوں سے دوچار ہونا ـــــ

اِس امر میں کہ یہ مثال کس شخص کی دی گئی ہے، بعض دوسرے اقوال بھی مذکور ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس شخص کی مثال ہے جس کا خاتمہ فساد انگیزی اور فتنہ پروری پر ہُوا ہو، امام مجاہدؒ کا قول ہے کہ یہ اس شخص کے حالات کی تمثیل ہے جو زندگی بھر طاعت الٰہی میں کوتاہیاں کرتا رہا، سُدّی کے نزدیک یہ اس ریاکار کی تشبیہ ہے جس نے خُدا کی رضا جوئی کو نظر انداز کر کے داد و دہش کی ہو۔ یوں تو آیت کے عموم میں ہر قول کی سمائی ہے۔ لیکن سیاق وسباق آخری قول کی ہی تائید کرتا ہے ـــــ

اس تمثیل کا ایک حصّہ اب اور باقی رہ جاتا ہے۔ یعنی صدقاتِ باطلہ کی مثال۔ صدقات کو باطل کرنے والے امور دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو صدقات کو ذریعۂ ثواب اور علّتِ ثواب بننے ہی سے روک دیتے ہیں۔ مثلاً ریا اور نام ونمود کی خواہش، دوسرے وہ امور جو صدقات کو ذریعۂ ثواب بننے سے تو نہیں روکتے لیکن اس ثواب کو باطل اور معدوم کر دیتے ہیں جو ان صدقات کے عوض ملنا چاہیئے تھا، مثلاً احسان جتانا، یا سائل کو ایذا دینا۔ ایسے صدقات کی مثال اللہ تعالیٰ نے اس سخت اور سپاٹ چٹان سے دی ہے جس پر مٹی کی ایک ہلکی سی تہ آکر جم گئی ہو، پھر تیز بارش آئے اور مٹی کی اس تہ کو بہا کر چٹان کو کھلی ہوئی سپاٹ حالت میں چھوڑ دے۔ اس تمثیل کے اجزاء اور مشبّہ کے اجزاء کے ساتھ ان کے تطابق کو دیکھو، قرآن کی شانِ عظمت اور اس کے اعجازِ بیان کا کیسا روشن آئینہ ہے۔ اللہ کی خوشنودی کو چھوڑ کر دنیوی جاہ ونمود پر اپنا مال قربان کرنے والے یا خیرات کر کے احسان جتانے اور سائل کو تکلیف دینے والے آدمی کے قلبِ ناآشنائے اخلاص کو پتھر سے اور اس کے عمل کو چٹان پر جمی ہوئی مٹی سے تشبیہ دینے میں کتنے لطیف نکات پنہاں ہیں، پتھّر کی سختی مٹی کو اپنے اندر پانی جذب نہیں کرنے دیتی اور نہ اسے روئیدگی کی اجازت دیتی ہے۔ کیونکہ اس کی فطرت میں یہ مادہ ہے ہی نہیں۔ کہ بارش ہونے کے بعد مٹی کے ذرّات کو اپنے سے ملاتے

رکھ سکے اور نہیں پانی اور روئیدگی قبول کرنے کا موقع دے سکے، معمولی زمین کے لئے تو بارش سبب روئیدگی ہے مگر چٹان پر جمی ہوئی مٹی کے لئے بارش ہونے کے معنی رہی سہی روئیدگی بھی ضائع ہو جانے کے ہیں، اسی طرح جو قلب خلوص، للہیت اور ایمان و اخلاص سے عاری رہتا ہے اور محض نمائش کے لئے فیاض بنا رہتا ہے، جب اس پر آسمان شریعت سے اوامر و نواہی کی بارش ہوتی ہے تو وہ اسے قبول نہیں کر سکتا۔ اور انجام کار غبار کی ہلکی سی وہ تہ بھی، جو اس پتھریلے قلب پر نقاب بن کر پڑی ہوئی تھی، اس بارش کے ریلے میں بہ جاتی ہے اور اس کا دل اپنی اصلی ہیئت میں ایک سپاٹ پتھر کی طرح نگاہوں کے سامنے ظاہر ہو جاتا ہے جس میں نشو و نما کی کوئی استعداد نہیں ہوتی ــــ

کلمہ طیبہ (علم حق) اور کلمہ خبیثہ (علم باطل) کی مثال :-

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ اِۨجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ــــ

(ابراہیم ۴)

کیا تم نے اس بات پر دھیان نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے (کلمہ طیبہ کی) کیسی مثال دی ہے "کلمہ طیبہ" ایک اچھی ذات کے درخت کی طرح ہے جس کی جڑ (مضبوط) زمین کے اندر جمی ہوتی ہے اور جس کی شاخیں آسمان میں ہیں اور جو اپنے پروردگار کے حکم سے ہمہ وقت پھل لاتا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے سامنے یہ مثالیں اس لئے بیان کرتا ہے کہ وہ (حقائق کا) احساس کریں، اور "کلمہ خبیثہ" کی مثالیں اس (ناکارہ اور) بداصل درخت کی سی ہے جو (بآسانی) زمین کے اوپر سے اکھڑ آئے (اور) اسے کوئی جماؤ اور مضبوطی حاصل نہ ہو ــــ

یہ دو متقابل مثالیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کے فطری جوہروں کو مشاہد کرنے کے لئے بیان فرمایا ہے۔ ہم ان دونوں مثلوں کی الگ الگ تشریح کریں گے ــــ پہلی مثال میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ "کلمہ طیبہ" ایک عمدہ درخت کے مانند ہے۔ وجہ مشابہت بالکل عیاں ہے۔ کلمہ طیبہ سے اعمالِ صالحہ کے پھل نکلتے ہیں جس طرح کہ عمدہ درخت سے کارآمد اور عمدہ پھل پیدا ہوتے ہیں۔ جمہور مفسرین کے اقوال سے یہی تاویل مفہوم ہوتی ہے جن کا خیال ہے کہ کلمہ طیبہ سے مراد کلمہ شہادت لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے، کیونکہ یہی کلمہ تمام ظاہری اور باطنی اعمال صالحہ کا سرچشمہ ہے اور ہر نیک عمل اسی کلمہ کا ثمرہ ــــ

علی ابن ابی طلحہ نے اپنی تفسیر میں ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ کلمہ طیبہ شہادت توحید ہے اور شجرہ طیبہ، ذاتِ مومن، "اصلها ثابت" کا مطلب یہ ہے کہ قول لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مومن کے قلب میں جڑ پکڑے ہوئے ہے اور "فرعها فی السماء" کنایہ ہے اس امر کی طرف کہ یہی کلمہ شہادت مومن کے اعمال کو عرش الٰہی تک پہنچاتا ہے ــــ

ربیع بن انس فرماتے ہیں کہ کلمہ طیبہ سے مراد ایمان ہے۔ یہاں ایمان ہی کو شجرہ طیبہ سے تشبیہ دی گئی ہے اور اصل ثابت سے مقصود اخلاص ہے۔ اور ایمان و اخلاص سے جو خوفِ خدا پیدا ہوتا ہے اس کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچنے والی شاخ سے تعبیر کیا گیا ہے ــــ

اگرچہ کلمہ طیبہ کی تاویل ان دونوں اقوال میں ایک ہی ہے لیکن ہمارے خیال میں پوری تمثیل کی یہ آخری توضیح زیادہ صحیح ہے۔ اس تشریح سے تشبیہ میں کھلی ہوئی مطابقت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا حسن بالکل نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ مشبہ وہ شجر توحید ہے جو مومن کے دل میں اُگ رہا ہے اور مشبہ بہ وہ عمدہ اور پاکیزہ درخت ہے جس کی جڑ نہایت مضبوط ہو، جس کی شاخیں آسمان سے باتیں کرنے والی ہوں اور جو برابر پھل دیئے جا رہا ہو۔

غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام صفات "شجرِ توحید" میں کس طرح پائی جاتی ہیں۔ اس کی جڑیں قلبِ مومن کے ریشہ ریشہ میں پیوست ہوتی ہیں اس کی شاخہائے اعمالِ صالحہ آسمانوں تک جا پہنچتی ہیں۔ اور وہ ہر آن، ہر لحظہ نیکیوں کے اتنے ہی زیادہ پھل لاتا رہتا ہے جتنا زیادہ اس کی جڑوں میں ثبات ہوتا ہے۔ یعنی جتنا ہی زیادہ اس (شہادتِ توحید) میں اخلاص اور اذعان ہوتا ہے۔ اور جتنا ہی زیادہ قلب کو اس کے جمال سے عشق، اس کے حقائق کی معرفت اور اس کے مقتضیات کی برآری کا لحاظ رہتا ہے۔ اتنے ہی زیادہ اس سے نیک افعال صادر ہوتے ہیں ـــــ پس جس شخص کے قلب میں یہ کلمہ طیبہ اپنی کامل حقیقت کے ساتھ جم گیا اور جس کا باطن اس کے لاہوتی رنگ میں پوری طرح رنگ گیا۔ یقین کرو کہ وہی اس ماہیتِ الوہیت کا حقیقی رازدان ہے جس کا نشیمن یہی قلبِ مؤمن ہوا کرتا ہے۔ پھر نہ صرف اس کی زبان واحدانیت کی گواہی دیتی ہے بلکہ اس کے سارے جوارح سے توحید کی شہادت تراوش کرنے لگتی ہے۔ اس کے بعد وہ اس ماہیّت (یعنی مقامِ الوہیت) اور اس کے تمام لوازم کی خدا کے سوا ہر دوسری چیز سے نفی کر دیتا ہے اور ساری مخلوق کو اپنا ہی جیسا ہیچ اور مجبورِ محض سمجھنے لگتا ہے۔ اس وقت دنیا اپنی لگاہوں سے صاف طور پر دیکھتی ہے کہ یہ کلمۂ طیبہ جو اس کے دل پر نقش ہے اور جس کا اس کی زبان سے ہر وقت اعلان ہوتا رہتا ہے، کس طرح دم بدم نیکیوں کے حیات آفریں پھل دیتا رہتا ہے۔ ایسی نیکیاں جو برابر اللہ کے حضور میں پہنچتی رہتی ہیں، گویا یہی کلمۂ طیبہ ان اعمال کو بارگاہِ الٰہی میں پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ پھر یہی کلمہ بہت سے دوسرے کلماتِ طیبہ پیدا کرتا ہے جن کے ساتھ مزید نیک اعمال ظہور میں آتے ہیں۔ اور یہ نیک اعمال ان کلماتِ طیبہ کو اٹھا کر حضورِ الٰہی تک لے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ذیل کی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:ـــــ

اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ط (فاطر-۲)	اللہ ہی کی طرف کلمہ طیبہ (یعنی اچھی بات) پہنچتا ہے۔ عملِ صالح اسے اٹھاتا ہے اور بلند کرتا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بتلا دیا ہے کہ عملِ صالح ہی کلمہ طیبہ کو عرش تک پہنچاتا ہے۔ اور مثال زیرِ بحث میں اتنی بات اور فرما دی ہے کہ یہی کلمہ مومن سے اچھے اعمال کراتا ہے۔ اب دونوں آیتوں کو ایک ساتھ ملا کر پڑھو، مقصودِ الٰہی بالکل روشن ہو جاتا ہے۔ جب کوئی شخص کلمۂ توحید کی اصل سپرٹ کو سمجھ جاتا ہے اور اس سمجھ جانے کا اثر اس کی عملی زندگی میں نمایاں ہو جاتا ہے تو بس یوں سمجھو کہ یہ کلمہ ایک ایسے درخت کی طرح ہے جس کی جڑ اس کے قلب میں مضبوطی کے ساتھ جمی ہوئی ہے اور اس کی شاخیں آسمانی کناروں تک جا پہنچتی ہیں اور وہ درخت برابر پھلتا رہتا ہے ـــــ "شجرۂ طیبہ" کی تاویل میں سلف کے مختلف اقوال مذکورہ ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ شجرۂ طیبہ سے مراد کھجور کا درخت ہے اور حضرت ابنِ عمرؓ کی روایت سے اسی قول کی تائید ہوتی ہے ـــــ

ایک جماعت کا خیال ہے کہ شجرۂ طیبہ خود ذاتِ مومن ہے۔ حضرت ابنِ عباسؓ اور عطیۃ العوفی وغیرہ اکابر کی یہی رائے ہے۔

لیکن دراصل دونوں قولوں میں اختلاف نہیں۔ نفسِ تشبیہ پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ برکات کے لحاظ سے مومن اور کھجور کے درخت کو ایک دوسرے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اگر کھجور کا درخت شجرۂ طیبہ ہو سکتا ہے تو مؤمن کا وجود بدرجۂ اولیٰ ہو سکتا ہے۔ اس لئے مشبہ بہ خواہ اسے قرار دو خواہ اسے، مقصودِ تشبیہ میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا ـــــ

ایک تیسرا قول یہ بھی ہے کہ یہ شجرۂ طیبہ جس کا ذکر مثال زیرِ بحث میں ہوا ہے۔ جنت کا ایک درخت ہے اگر یہ صحیح ہے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ تشبیہ کا مقصد اس سے بھی پورا ہو جاتا ہے ـــــ اس مثال کے اندر اسرار و حکمت کا جو بیش بہا خزانہ پوشیدہ ہے وہ بس اسی مرکزِ علم و حکمت ہی کا حصہ ہے جس نے اسے بیان فرمایا ہے۔ آؤ! اس کے بعض محاسن کو سمجھنے کی کوشش کریں ـــــ

درخت میں چار چیزوں کا وجود ضروری ہے۔ جڑ، تنا، شاخیں اور پھل ـــــ شجرِ ایمان کے اندر بھی ان چاروں چیزوں کا وجود ہونا چاہیئے تاکہ مشبہ اور مشبہ بہ میں کامل مطابقت ظاہر ہو سکے۔ سو علم و معرفت اور اذعانِ قلب و شجرِ ایمان کی جڑ ہے۔ اخلاص اس کا تنا ہے۔

اعمال اس کی شاخیں ہیں اور پھل وہ اخلاقِ حسنہ اور وہ صفاتِ حمیدہ ہیں جو ان اعمال صالح کے کرنے سے لازمی طور پر فطرتِ انسانی میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ انہیں تمام اشیاء کا لحاظ کر کے فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ کس دل میں ایمان ہے اور کس میں نہیں اگر کسی کے اندر یہ تمام چیزیں موجود پائی جائیں، یعنی اگر اس کا علم عالم الغیب کی نازل کردہ کتابوں کے مطابق ہے، اگر اس کا اعتقاد اس معیار پر صحیح اترتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی زبانی بیان فرمایا ہے، اگر اخلاص کا نور اس کے دل میں موجود ہے اور اعمال ان اشیاء مذکورہ کے اقتضاء کے موافق صادر ہو رہے ہیں تو سمجھنا چاہیئے کہ ایمان کا شجر مبارک اس کے قلب میں اُگا ہوا، اور تر و تازہ ہے جس کی جڑیں مضبوط اور جس کی ٹہنیاں آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اور اگر معاملہ برعکس ہو تو یقین کر لینا چاہیئے کہ اس کے قلب کی سطح پر جو درخت لگا ہوا ہے وہ ایک ناکارہ اور بے جان درخت ہے جس کی جڑوں میں کوئی دم نہیں اور جو ایک جھٹکے میں اکھڑ جانے والا ہے ——

پھر یہ دیکھو کہ کوئی درخت اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا جب تک کہ اس کی آبیاری نہ ہوتی رہے۔ پانی دینا چھوڑ دو کچھ دنوں میں خشک ہو جائے گا۔ شجرِ اسلام کا بھی یہی حال ہے۔ انسان اس کی باقاعدہ دیکھ بھال نہ رکھے اور برابر تدبر و تفکر اور علمِ نافع اور عملِ صالح سے اس کی آبیاری نہ کرتا رہے تو اس کی شادابی حیات آج نہیں تو کل ضرور ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ مسند امام احمد بن حنبلؒ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ——

"ایمان کپڑے کی طرح پرانا ہو جایا کرتا ہے۔ لہٰذا اپنے ایمانوں کو نیا (تازہ کرتے رہو)"

یہیں سے یہ نکتہ بھی سمجھ میں آجاتا ہے کہ انسان کی حیاتِ ایمانی کے لئے ان موقت اور مہیم عبادت کی کیسی شدید ضرورت ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے فرض کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ کتنا بڑا ہم پر احسان ہے کہ اس نے اس شجرِ توحید کو تر و تازہ رکھنے کے لئے اس کا سامان مہیم پہنچایا ہے، جس کی کاشت اس نے ہمارے قلوب میں کر رکھی ہے —— اچھے باغ یا عمدہ زراعت حاصل کرنے کے لئے قدرت کا یہ مقررہ قانون ہے کہ اسے بیگانے پودوں سے پاک صاف ہونا چاہیئے۔ اگر مالی اپنے باغ کو یا کسان اپنی کھیتی کو ایسے پودوں اور گھاسوں سے محفوظ رکھتا ہے اور انہیں کھود کھود کر پھینکتا رہتا ہے تو اس کا باغ پوری طاقت کے ساتھ بڑھے گا اور پھلے گا۔ اس کے پودوں کو کامل روئیدگی حاصل ہو گی۔ اس میں نہایت کثرت سے عمدہ اور پاکیزہ پھل آئیں گے، لیکن اگر وہ ایسا کرنا چھوڑ دے تو خودرو پودے اور بیگانہ جھاڑ جھنکار سارے باغ میں پھیل جائیں گے۔ زمین کی قوت نمو کو جذب کرتے جائیں گے اور کسان کا اصل مقصود یعنی پاکیزہ پھل لانے والے درخت غذا کی کمی کی وجہ سے بے جان اور پژمردہ ہو کر رہ جائیں گے۔ ان میں اوّل تو پھل آئیں گے ہی نہیں اور اگر تھوڑے بہت آئے بھی تو ناقص اور ناکارہ ہوں گے، چنانچہ جو کم فہم اور ناتجربہ کار باغبان اس بات کو نہیں سمجھتا وہ بڑے گھاٹے میں رہتا ہے اور نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے —— پس مؤمن کو ہمیشہ دو باتوں کی سعی کرنی چاہیئے۔ ایک تو یہ کہ اس شجرِ ایمانی کو برابر پانی دیتا رہے۔ دوسری یہ کہ اس کے ماحول کو اشجارِ خبیثہ سے پاک صاف رکھے۔ پانی دینے ہی میں اس کی بقا اور دوام ہے اور دیکھ بھال ہی اس کی بقا اور دوام ہے اور دیکھ بھال ہی اس کے کمال نشو و نما دار تقاء کی ضامن ہے ——

یہ ان اسرار و حکم کے بعض پہلو ہیں جو اس پُر معنی تمثیل کی تہوں میں چھپے ہوئے ہیں اور غالباً اس سمندر کے مقابلہ میں ایک قطرہ ہی کی حیثیت رکھتے ہیں جو اس کی گہرائیوں میں مستور ہے اور یہ ہمارے اذہان کی نارسائی، ہمارے قلوب کی بے نوری، ہمارے علوم کی کوتہی اور ہمارے اعمال کی بے برکتی کا قصور ہے کہ ہم اس سے زیادہ اپنے ظرف میں نہیں لے سکتے۔ ورنہ اگر ہمارے دل میں روشنی، ہماری روحوں میں پاکیزگی، ہمارے ذہنوں میں جلا اور ہمارے اعمال میں خلوص ہو اور ہم اللہ اور اس کے رسول سے حقیقت کے انوار اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں تو یقیناً کلام الٰہی کے وہ اسرار و معارف ہم پر منکشف ہو جائیں گے جن کی تابانیوں کے سامنے یہ سارے رسمی علوم اور یہ ساری دنیوی قال اور اقوال ماند پڑ جائے۔ یہی وہ نعمت ہے جو صحابہ کرامؓ کو نصیب ہوئی اور دوسرے اس سے محروم ہیں۔ اور اسی سے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے

علم وعرفان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۔۔۔

دوسری مثال میں دراصل پہلی ہی مثال کا قابل پہلو واضح کیا گیا ہے کہ "کلمہ طیبہ" کے مقابلہ میں "کلمہ خبیثہ" کی کیا ماہیت ہے۔ اللہ تعالےٰ کہتا ہے کہ یہ کلمہ اس شجرِ خبیث کے مشابہ ہے جو معمولی جھٹکے میں اکھڑ جانے والا ہو جس میں نہ کوئی مضبوط جڑ ہو۔ نہ بلند وبالا شاخیں ہوں، نہ اچھے پھل ہوں، نہ سایہ ، نہ سبزہ ہو۔ غرضیکہ سر سے پاؤں تک اس کے اندر کوئی حسن وخوبی اور کوئی خیر ومنفعت نہ ہو ۔۔۔

"کلمہ خبیثہ" سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق سلف سے چند اقوال مذکور ہیں۔ ضحاک فرماتے ہیں کہ کلمہ خبیثہ کافر کہا گیا ہے اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اس درخت کی طرح، جس کی صفات اور ماہیت کا اوپر ذکر ہوا) کافر کے اعمال خیر کی روح سے خالی ہوتے ہیں، ان میں کوئی ثبات اور وزن نہیں ہوتا اور نہ اللہ تعالیٰ ان میں کوئی برکت اور منفعت عطا فرماتا ہے۔ ابن عبّاس رضی اللہ عنہ کے نزدیک کلمہ خبیثہ سے مراد شرک ہے، اور شجرۂ خبیثہ سے مراد کافر ہے۔ یعنی مشبّہ شرک اور مشبّہ بہ کافر کی ذات ہے۔ آیت کا مدعا یہ ہے کہ شرک کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی جس پر مشرک اعتماد کر سکے اور اپنی صداقت پر کوئی دلیل نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ کوئی مشرکانہ عمل قبول نہیں کرتا اور نہ اسے اللہ کے حضور میں رسائی ہوتی ہے اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے کہ "نہ تو اس شجر خبیث میں کوئی مضبوط جڑ ہے۔ جو زمین میں جمی ہو، نہ ہی اوپر کی طرف شاخیں ہیں"، یعنی مشرک کے جیب و دامن میں کوئی نیکی نہیں ہوتی جسے دنیا وآخرت میں کوئی وزن حاصل ہو ۔۔۔

ایک صاحب علم سے پوچھا گیا کہ کلمہ خبیثہ کی حقیقت کیا ہے؛ فرمایا تو اس کے لئے زمین میں کوئی جائے قرار ہے نہ آسمان میں کوئی محل صعود، بلکہ وہ اپنے قائل اور متبع کی گردن میں لٹکا رہتا ہے اور اس وقت تک لٹکا رہے گا جب تک قیامت نہ آجائے ۔۔۔

ان دونوں مثلوں کے بیان کرنے اور کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کی حقیقتیں عریاں کر دینے کے بعد اللہ تعالیٰ ان دونوں کے آثار ونتائج پر روشنی ڈالتا ہے، اور اپنی صفت عدل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:۔۔۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۔
(ابراھیم ۔ ۲۷)

جو لوگ ایمان لائے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ پکّی بات (یعنی کلمہ طیبہ) کے ذریعہ دنیا کی زندگی (میں بھی) اور آخرت میں بھی ثبات (جماؤ) بخشتا ہے۔ اور اللہ ظالموں کو آوارہ و بے راہ بنا دیتا ہے اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے ۔۔۔

اس آیت میں انسانی فلاح کا حقیقی راز کھول دیا گیا ہے۔ خدا کی اس نوازش پر، جسے اس نے ثبات اور جماؤ اور قرار بخشنے سے تعبیر کیا ہے، انسان کی کامرانی یا محرومی کا دار و مدار ہے۔ کوئی شخص ایک لمحہ کے لئے بھی اس نوازش سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اگر خدا کسی کو اپنی اس ثبات بخشی کی نعمت سے محروم کر دے تو دیکھتے دیکھتے اس کے ایمان کی اور اس کی زندگی کی بنیادیں ہل جائیں۔ عام انسان تو ایک طرف رہے خود تمام انسانوں کے سردار اور دنیا کے سب سے بڑے صاحب ایمان بندہ (روحی فداہ) کے بارے میں خدا کہتا ہے کہ:۔۔۔

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۔ (بنی اسرائیل ۔ ۷۴)

اگر ہم تمہیں ثبات نہ بخشتے تو تم ان مشرکوں کی طرف کچھ (نہ کچھ) ضرور جھک پڑے ہوتے ۔۔۔

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔۔۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ (ھود ۔ ۱۲۰)

اور اے پیغمبر! گذشتہ انبیاء کے جتنے قصے ہم تم سے بیان کرتے ہیں ان کے ذریعہ ہم تمہارے دل کو ثبات اور مضبوطی بخشتے ہیں۔

دیکھو حق پر مضبوطی سے جمے رہنے کے لئے پیغمبر کو بھی تائیدِ الٰہی کی ضرورت پڑتی ہے۔ پھر یہی وہ توفیقِ الٰہی تھی جس نے صحابہ کرامؓ کی ایک مٹھی بھر جماعت کو اپنے سے تگنے دشمنوں کے مقابلہ میں فتح مند کیا۔ اور فتح کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات گناتے وقت مسلمانوں کو یاد دلایا کہ:۔

اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ (انفال - ۲)

یاد کرو اس وقت کو جب تمہارا پروردگار (مدد کے لئے نازل ہونے والے) ملائکہ پر وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ پس مومنوں کو ثابت قدم رکھو۔

نہ صرف دنیا کی زندگی میں بلکہ آخرت میں بھی یہ توفیق مومنوں کے شامل حال رہے گی، جیسا کہ آیت زیر بحث میں تصریح ہے اور ایک مشہور حدیث میں بھی آتا ہے کہ "وَھُوَ یُسَائِلُھُمْ وَیُثَبِّتُھُمْ" (یعنی اللہ تعالیٰ ------ ان مومنوں سے سوالات کرے گا اور ساتھ ہی دل میں قوت اور ثبات بھی بخشتا جائے گا) اور درحقیقت مرنے کے بعد ہی کا وقت ایسا ہوگا جب کہ انسان کو اس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت کا شانِ نزول ہی عذاب قبر بتایا گیا ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں بروایت براءؓ بن عازبؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ:۔

"جب مومن برزخی قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے تو ایک آنے والا اس کے پاس آتا ہے، اور اس سے پوچھتا ہے کہ تیرا ربّ کون ہے؟ — تیرا دین کیا ہے؟ — تیرا پیغمبر کون ہے؟ وہ جواب دیتا ہے کہ میرا ربّ اللہ ہے، میرا دین اسلام ہے؟ — اور میرے پیغمبر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ یہ سن کر وہ اسے زور سے جھنجھوڑتا ہے اور پھر پوچھتا ہے کہ بتا تیرا ربّ کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ اور یہ آخری آزمائش ہے جس سے مومن دوچار ہوتا ہے۔ اور یہی وہ وقت ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ۔ الخ چنانچہ بندہ پھر جواب دیتا ہے کہ میرا ربّ اللہ ہے، میرا دین اسلام ہے اور میرے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم ہیں) فرشتہ یہ سن کر کہتا ہے کہ صدقت (تو نے سچ کہا)۔"

صحاح کے اندر تھوڑی سی کمی بیشی کے ساتھ یہ حدیث متعدد طرق سے مروی ہے کہ بعض میں ہے کہ آنے والا فرشتہ ایک نہیں بلکہ دو ہوں گے اور مردہ کو زندہ کر کے یہ سوالات کریں گے۔ اسی طرح دوسری روایتوں میں اسی قبیل کی بعض اور تفصیلات بھی ہیں۔

"القول الثابت" سے مراد قولِ حق اور کلمۂ صدق ہے، یعنی قول باطل اور کلمۂ صدق ہے، یعنی قول باطل اور کلمہ کذب کا ضد۔ کیونکہ قول کی دو ہی قسمیں ہیں۔ ایک قول وہ ہوتا ہے جس کے اندر کوئی حقیقت ہوتی ہے۔ دوسرا وہ جو حقیقت سے عاری ہوتا ہے حقیقت رکھنے والے قول کو قولِ ثابت کہا گیا ہے، اور قولِ اثبت (یعنی ثابت ترین قول) کلمہ توحید ہے کیونکہ یہی وہ سراپا حقیقت قول ہے جس کے ذریعہ اللہ کے بندوں کو دنیا و آخرت کی ہر زندگی میں ثبات اور قوت بخشتا ہے۔ اس قول کے اندر اتنی قوت ہوتی ہے کہ انسان جب اس کی کنہ تک پہنچ جاتا ہے تو ساری مادی قوتیں اس کے سامنے ہیچ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ نہ سچے آدمی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی جری شجاع اور قوی القلب ہوتا ہے نہ جھوٹے سے بڑھ کر کوئی ذلیل بزدل اور بے حمیت۔

خدا کے حضور دنیوی تعلقات کی بے اثری کی مثالیں :-

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۝

تحریم (پ ۲۸)

کافروں کے لئے اللہ تعالیٰ زوجۂ نوحؑ اور زوجۂ لوطؑ کی مثال دیتا ہے کہ یہ دونوں عورتیں ہمارے بندوں میں سے دو صالح بندوں کے نکاح میں تھیں لیکن انہوں نے (ان کی پیروی کرنے کے بجائے) ان سے غداری کی (اور ان کے خلاف خدا کے نافرمانوں اور گمراہوں سے ملی رہیں) اس لئے ان کے شوہر (اپنی پیغمبرانہ برگزیدگی کے باوجود) اللہ کے مقابلہ میں ان کے کچھ کام نہ آئے اور ان سے کہا گیا کہ اور دوزخیوں کے ساتھ تم بھی دوزخ میں جا داخل ہو ——

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ (تحریم-۱۲) وتقدم

اور اللہ تعالیٰ مومنوں کے لئے زوجۂ فرعون کی مثال بیان کرتا ہے جب کہ اس نے کہا۔ اے میرے پروردگار! میرے لئے اپنے ہاں بہشت میں ایک گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کے (برے) اعمال (کی لعنتوں) سے نجات دے اور مجھے بچا ان ظالموں سے۔ نیز (دوسری مثال اللہ تعالیٰ) "عمران" کی بیٹی مریم کی دیتا ہے جو پاک باز اور عفیفہ تھی۔ پھر ہم نے اپنے حکم سے روح اس میں پھونکی اور اس نے ہمارے کلمات اور ہماری کتابوں کی تصدیق کی۔ نیز وہ ہمارے فرمانبردار با ادب بندوں میں تھی ——

ان آیات میں تین مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک کافروں کے لئے اور دو مسلمانوں کے لئے —— پہلی مثال میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کی پاداش آدمی کو بہرحال ملے گی۔ خواہ اس کا رشتہ کیسے ہی برگزیدہ و مقدس لوگوں سے ہو۔ بزرگوں کے ساتھ اس کے جو نسبی و صہری وغیرہ دنیوی رشتے بھی ہوں، ان میں سے کوئی اسے نہ بچا سکے گا کیونکہ یہ تمام رشتے قیامت کے دن کٹ چکے ہوں گے، اگر کوئی رشتہ اس دن کام آسکتا ہے تو وہ، وہ رشتہ ہے جسے خدا کے فرستادوں نے خدا اور بندوں کے درمیان قائم کیا ہے وگرنہ اگر رحمی نسبی اور ازدواجی تعلقات منکرینِ خدا کے حق میں کچھ بھی منفعت بخش ہو سکتے تو نوح اور لوط علیہما السلام کے رشتہ ہائے ازدواجی ان کی بیویوں کے حق میں ضرور مفید ثابت ہوتے جو اگرچہ زمرۂ کفار میں تھیں لیکن ان کے شوہر وقت کے سب سے بڑے باخدا انسان تھے، مگر ہوا یہ کہ اتنے قریبی رشتے بھی ان کافرہ عورتوں کے کچھ کام نہ آئے وہ بھی تمام کفر کیشوں کی معیت میں بالکل انہیں کی طرح مستحق جہنم قرار دے دی گئیں ——

یہ آیت ان تمام لوگوں کی جھوٹی امیدوں کی جڑ کاٹ دیتی ہے جو خود تو دن رات معصیتِ الٰہی میں ڈوبے رہتے ہیں لیکن توقع رکھتے ہیں کہ فلاں مردِ صالح کا دامنِ اتصال ہمیں اپنے اندر چھپا لے گا اور ہم اخروی سزاؤں سے بچ جائیں گے۔ فرض کرلو کہ ایسی بے بنیاد توقعات رکھنے والے کا تعلق اس شخص سے بہت ہی قوی ہے جس کے طفیل یہ رندِ خراباتی اپنے کو جنت کا وارث سمجھے بیٹھا ہے، لیکن کیا کوئی تعلق زوجیت، اور ابوت و ابنیت کے تعلقات سے بھی زیادہ گہرا زبردست ہو سکتا ہے؟ پھر اگر حضرت نوحؑ اپنے چہیتے بیٹے کو، حضرت ابراہیمؑ اپنے باپ کو اور حضرت نوحؑ

ولوط علیہما السلام اپنی بیویوں کو خدا کی پکڑ سے نہ بچا سکے گا۔ تو تا بدیگراں چہ رسد۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں قانون مجازات کے اس اصل الاصول کو کئی جگہ بیان فرمایا ہے۔ سورۂ ممتحنہ میں ہے:——

"تمہاری رشتہ داریاں اور تمہاری اولادیں قیامت کے روز کچھ کام نہ آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہی تمہارے درمیان (بالکل ٹھیک ٹھیک) فیصلہ کریگا"

دوسری جگہ ہے:——

"قیامت کا دن وہ دن ہے جب کوئی کسی کو کچھ بھی فائدہ نہ پہنچا سکے گا اور سارا معاملہ اُس دن اللہ ہی کے اختیار میں ہوگا" (سورۂ انفطار ۱)

ایک مقام پر اور آتا ہے کہ:——

"لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو اور خوف کھاؤ اس دن کا جب نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کے کام آئے گا۔ اور نہ کوئی بیٹا اپنے باپ کے"

یہ تمام آیات مشرکین کی ان ساری باطل تمناؤں کو جھٹلا رہی ہیں جو محض کسی کے "طفیل" نجات کی آس لگائے بیٹھے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بزرگوں کی شفاعت خدا کے روبرو ہمیں ہر سزا سے محفوظ کر دے گی، یہ سب سے بڑی گمراہی ہے جو کوئی انسان اختیار کر سکتا ہے۔ اور اس کی بیخ کنی کیلئے سارے انبیاء اور صحف سماوی کا نزول ہوتا ہے —— یہ مثال تو کفّار کی عبرت پذیری کے لئے تھی۔ اس کے بعد روئے خطاب مسلمانوں کی طرف پھرتا ہے اور دو مثالیں ان کے سامنے بیان کی جاتی ہیں۔ پہلی مثال میں انہیں بتایا جاتا ہے کہ آخرت میں جس طرح کسی نبی یا ولی کا رشتہ کسی بدکار شخص کو کیفر کردار تک پہنچنے سے بچا نہیں سکتا، اسی طرح کسی نیکوکار شخص کو کسی منکرِ حق کی قرابت داری بھی ہرگز ہرگز موجب ضرر نہیں ہو سکتی جبکہ وہ اس کی معصیت پرستی اور اس کے کفر و انکار سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو۔ فرعون سے بڑا دشمنِ حق شاید ہی پیدا ہوا ہو، لیکن ایسے بڑے کافر کی بیوی بھی جب اللہ کی فرمانبردار بن گئی تو اس کافر فرعون کی زوجیت میں ہونا اس کی نجات کی راہ میں بالکل حائل نہ ہوا، یہاں ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے، پیغمبرؑ کی بیوی اگر بدعمل ہے تو پیغمبر کے رشتۂ ازدواج میں ہونا اس کے لئے کچھ مفید نہیں۔ اور فرعون کی بیوی اگر نیکوکار ہے تو اتنے بڑے کافر و ظالم کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں وابستہ ہونا بھی اس کیلئے کچھ نقصان دہ نہیں۔ مومنوں کے ساتھ کفّار کے رشتے مومنوں کی حیاتِ اُخروی کے لئے تو کسی گزند کے باعث نہیں ہو سکتے، البتہ یہ ممکن ہے کہ دنیا کی زندگی میں انہیں کوئی نقصان پہنچ جائے اور جب اہلِ کفر پر خدا کا عذاب نازل ہو تو اس کی لپیٹ میں یہ صاحبِ ایمان بندے بھی آجائیں۔ اس لئے کہ خدا کی سنّت ہی یہ ہے کہ جب بحیثیتِ مجموعی اس کی اطاعت سے بغاوت ہونے لگتی ہے اور عتابِ الٰہی نمودار ہو جاتا ہے تو اس وقت عذاب کی وسعت محض کفّار اور معاندینِ حق ہی تک محدود نہیں رہتی بلکہ ان کے ساتھ رہنے والے دو چار صالح بندے ہوتے ہیں وہ بھی اس کی زد میں آجاتے ہیں —— جیسے زلزلے میں نیک و بد دونوں کے گھر برباد ہو جاتے ہیں۔

دوسری مثال میں اسی حقیقت کو ایک تیسرے پہلو سے نمایاں کیا گیا ہے۔ پہلی مثال میں جس عورت کے انجام کو پیش کیا گیا تھا وہ ایسی عورت تھی جس کا تعلق ایک مردِ صالح سے تھا۔ دوسری مثال میں جس عورت کا ذکر کیا گیا ہے اس کا رشتہ ایک کافر و فاسق شخص سے تھا —— اب تیسری عورت (حضرت مریمؑ) کی مثال دی جاتی ہے جو مذکورۂ بالا دونوں رشتوں میں سے کوئی رشتہ نہیں رکھتی تھیں۔ ان تینوں اقسام کی عورتوں کے حالات و عواقب بیان کرنے میں دراصل ایک ہی مقصد پوشیدہ اور ایک ہی اصول، اجزا کا اظہار مطلوب ہے، یعنی یہ کہ ہر شخص اپنی شخصی ذمہ داری پر نجات یا عذاب کا سزاوار بنتا ہے نہ کسی نیک آدمی کا رشتہ اُسے آخرت کی سزاؤں سے بچا سکتا ہے جیسا کہ پہلی مثال میں مذکور ہے۔ نہ کسی بدکار کا رشتہ مادّی کسی کی نجاتِ اُخروی میں حائل ہو سکتا ہے جیسا کہ دوسری مثال بتا رہی ہے۔ اور نہ کسی شخص کی جزا و سزا پر اس کا کوئی رشتہ اثر انداز ہو سکتا ہے، جیسا کہ تیسری مثال (حضرت مریمؑ کی سرگزشت) شہادت دے رہی ہے ——

سورہ کے سیاق پر نظر ڈالنے سے ان امثال کے بعض نکات اور سامنے آتے ہیں۔ پہلے سے ازدواجِ مطہرات کا ذکر چلا آرہا ہے اور انہیں اپنی شخصی ذمہ داریاں یاد دلائی جا رہی ہیں۔ پھر اس سلسلے میں انہیں کے مثل دوسری عورتوں کے حالات پیش کر کے انہیں متنبہ کیا جا رہا ہے کہ اگر تم نے

اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کی تو یاد رکھو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے تمہارا انتساب آخرت میں کچھ کام نہ آئے گا۔ جیسا کہ لوطؑ اور نوحؑ علیہما السلام کی ازواج کا معاملہ تمہارے سامنے ہے، چنانچہ اسی مناسبت سے ان مثال میں عام قرابت داریوں کا ذکر نہیں ہے بلکہ خاص نکاحی رشتوں ہی کا ذکر کیا گیا ہے ——— یحییٰ بن سلام کہتے ہیں کہ پہلی مثال حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کی تنبیہ اور تحذیر کے لئے بیان کی گئی ہے۔ پھر دوسری مثال کے ذریعہ انہیں سمع و طاعت پر اُبھارا گیا ہے۔ تیسری مثال میں بھی جو حضرت مریمؑ سے متعلق ہے اور مؤمنوں کے لئے بیان کی گئی ہے ایک اور نکتہ مضمر ہے۔ یعنی یہ کہ حضرت مریمؑ پر یہودی اشرار نے جو جھوٹی تہمتیں تراشی تھیں۔ انہوں نے اللہ کے نزدیک حضرت مریم کو کوئی ضرر نہیں پہنچایا بلکہ وہ اس کے ہاں ویسی ہی برگزیدہ رہیں جیسا کہ واقعۃً وہ تھیں اور انہیں اللہ تعالیٰ نے تمام صنف نازک پر فضیلت بخش کر صدّیقہ کا مرتبہ جلیلہ عطا فرمایا۔ پس اس مثال سے معلوم ہوا کہ فاسق و فاجر لوگوں کا کسی نیکو کار کو متہم کرنا خدا کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

(امثال القرآن از امام ابن قیمؒ)

قرآن میں قسموں کی تشریح

علامہ فراہیؒ امعان القرآن میں لکھتے ہیں :——

بعض اوقات آدمی اپنے مخاطب کو مطمئن کرنے کے لئے ضرورت محسوس کرتا ہے کہ اپنے کسی بیان یا وعدے کو زور اور تاکید کے ساتھ پیش کرے، خصوصیت کے ساتھ اہم قومی و اجتماعی معاملات میں ایسا کرنا بسا اوقات ناگزیر ہوتا ہے، ایک قوم، دوسری قوم کے ساتھ یا ایک بادشاہ اپنی رعایا کے ساتھ، یا عام افراد آپس میں کوئی معاہدہ کرتے ہیں تو باہمی اعتماد و اطمینان کے لئے اس طرح کی تاکید و توثیق ضروری سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ چیز موافق کو مخالف اور دوست کو دشمن سے پہچاننے کا معیار قرار پا جاتی ہے —— انسان کی اس تمدنی ضرورت نے طرح طرح کے طریقے اور خاص خاص الفاظ پیدا کر دیئے جس سے لوگ اس تاکید کا اظہار کرنے لگے۔ یہ قسم کی اصل ہے ——

رومیوں، عربوں اور عبرانیوں کے حالات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعض اوقات اس تاکید کا اظہار دہنا ہاتھ پکڑ کر کرتے تھے۔ جب معاہدے کے وقت ایک فریق دوسرے فریق کا ہاتھ پکڑ لیتا تھا تو یہ فریقین کی طرف سے معاہدے کی پختگی اور مضبوطی کے ساتھ اس کی پابندی کا اظہار و اقرار ہوتا، گویا یہ ہیئت ان کی طرف سے اس امر کا اعلان سمجھی جاتی کہ ہمارا تعلق محکم ہے اور اس کی ضمانت کے طور پر داہنے ہاتھ گواہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قسم کے لئے یمین کا لفظ استعمال ہوا جس کے معنی عربی زبان میں داہنے ہاتھ کے ہیں ——

یہیں سے قسم میں کفالت و ضمانت کا مفہوم بھی پیدا ہو گیا۔ اس چیز کو ہر صاحب نظر جانتا ہے۔ بیعت کے وقت داہنا ہاتھ تھامنا یا بیع و شراء کے وقت ہاتھ پر ہاتھ مارنا اسی حقیقت کی ایک عملی تصویر ہے ——

جب عہد میں شریک ہونے والے بہت سے لوگ ہوتے تو ایسا بھی ہوتا کہ پانی سے بھرے ہوئے کسی برتن میں سب اپنے داہنے ہاتھ ڈالتے اور چونکہ برتن کی چیز سے سب کے ہاتھ مس ہوتے اس لئے اس کے معنی یہ سمجھے جاتے کہ گویا سب نے ایک دوسرے کا داہنا ہاتھ پکڑ کر کسی بات پر اتفاق کیا ہے اور چونکہ چھونے اور لگنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں چیز پانی ہے ——

بعض مرتبہ کوئی چوپایہ ذبح کر کے اس کا خون معاہدے کے دونوں فریق اپنے جسموں پر چھڑکتے۔ اس کا مطلب یا تو یہ سمجھا جاتا کہ یہ دوستی رشتۂ خون و قرابت کے درجے کی ہے یا یہ کہ اس عہد کی حفاظت کی راہ میں ہم اپنا خون تک بہا دیں گے۔ ایک صورت یہ تھی کہ کسی چیز سے بغیر شرط کے رُک جاتے، اس کو ایلیۃ کہتے ہیں، قرآن مجید میں اس کا ذکر آیا ہے :——

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ (البقرہ ۲۲۶) ——	جو لوگ اپنی بیویوں سے نہ ملنے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں اُن کے لئے چار مہینوں کی مہلت ہے ——

پھر آہستہ آہستہ اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوئی یہاں تک کہ آلیت اقسمت، کے مترادف کی حیثیت سے استعمال ہونے لگا۔ اس کی مثالیں بہت مل سکتی ہیں۔ 'الیت، کو اقسمت کی جگہ بہت استعمال کیا گیا ہے۔ بعض جگہ اسی تاکید کے مقصد کے لئے

لام تاکید استعمال کرتے تھے۔ اس کی مثال قرآن مجید میں بھی ہے

وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (المائدہ - ۷۳)

اور اگر باز نہ آئے اس بات سے جو کہتے ہیں تو البتہ ان لوگوں کو جنہوں نے ان میں سے کفر کیا ہے۔ عذاب دردناک پکڑے گا

دوسری جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ (الحج - ۴۰)

البتہ، اللہ مدد کرے گا اُن لوگوں کی جو اس کی مدد کریں گے

اس کی وجہ یہ ہے کہ قسم کی اصل حقیقت محض تاکید ہے اس لیے ہر جگہ مقسم بہ محذوف ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں لام قسم آیا ہے سب کو اسی اصول پر قیاس کرنا چاہیئے اور اگر اس سے پہلے کوئی ایسا لفظ آئے جو قطعیت اور یقین کو ظاہر کرے تو وہ بھی لفظ قسم سے مشابہ ہوگا۔ قرآن مجید میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً: ——

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ - (یوسف ۳۵)

پھر ان نشانیوں کے دیکھ لینے کے بعد بھی ان لوگوں نے یہی مناسب سمجھا کہ ایک مدت کے لئے اسکو ضرور قید کر دیں۔

دوسری جگہ ہے: ——

قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ ——— (ص - ۸۵)

کہا پس یہ سچ ہے اور میں سچ ہی کہتا ہوں کہ جہنم کو ضرور بھر دوں گا ——

پس اس طرح کے مواقع میں ہر جگہ مقسم بہ محذوف ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔ سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ ان مثالوں میں محذوف ماننا کلام کی بلاغت کے بالکل خلاف ہے ——

قسم کے لئے مقسم بہ ضروری نہیں،

مشہور الفاظِ قسم کی تشریح

—— اللہ اور اس کے شعائر کی قسم مفرد اور بسیط معانی اور مفاہیم میں سے نہیں ہے کہ اس کے لیے شروع ہی سے مستقل الفاظ وضع ہو کر استعمال میں آتے۔ یہ چیز تو معاشرتی ضروریات اور دینی عقائد کے تعلق و امتزاج سے پیدا ہوئی ہے۔ پس یہ بات کچھ صحیح نہیں ہے کہ جہاں کہیں مقسم بہ مذکور نہ ہو وہاں ہم یہ خیال کر لیں کہ یہاں اللہ تعالیٰ کی قسم کھائی گئی ہے اور لفظ اللہ یہاں مقدر ہے ——

ہم یہاں ان الفاظ کے معانی کی تشریح کرنا چاہتے ہیں جو قسم کے لیے عام طور پر مستعمل ہیں اور مقصد یہ دکھانا ہے کہ یہ الفاظ اصلاً اللہ تعالیٰ یا اس کے شعائر یا کسی خاص چیز کی قسم کے لیے نہیں وضع ہوئے تھے، وہ الفاظ یہ ہیں: ——

۱ —— یمین، نذر، الیۃ، قسم، حلف ——

"یمین" کی اصل حقیقت اور قسم کے لیے اس کا عام استعمال اوپر ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں ——

"نذر" کے اصل معنی کسی شے کو دور کرنے اور اس سے بچنے کے ہیں۔ اگر کسی شے کو تم اپنے سے ہٹا کر خدا کے لیے خاص کر دو تو یہ "نذر" ہے۔ یہیں سے اس میں کسی شے کو حرام کر دینے کا مفہوم پیدا ہو گیا۔ عبرانی میں اس کا یہی مفہوم ہے۔ پھر یہ لفظ اپنے اوپر کسی لذت کو حرام کر دینے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اپنے اوپر کسی شے کو بطور قسم لازم کرنے کے مفہوم

کے لیے اس میں وسعت پیدا ہو گئی ـــــــ

" الیہ " کے معنی ہیں کسی امر سے کوتاہی کرنا۔ " آل " اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی شے میں کوتاہ اور عاجز ہو۔ پھر یہ کسی شے کو چھوڑ دینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ یہیں سے یہ عورتوں سے قسم کھا کر ترک تعلق کے معنی میں منتقل ہو گیا۔ پھر اس میں مزید وسعت پیدا ہوئی اور اپنے اوپر کسی شے کے لازم کر لینے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ خواہ یہ لازم کر لینا بصورتِ اختیار لیکن اس میں غالب پہلو کسی ایسی شے کے لازم کرنے کا ہے جس میں کچھ مضرت کا شائبہ ہو۔ اس اعتبار سے یہ " نذر " سے مشابہ ہے ـــــــ

" قسم "، قسم کے اصل معنی (قطع) کاٹنے کے ہیں قسمت الشیء وقسمتہ اسی معنی میں مستعمل ہیں اور قطع کا لفظ شک وشبہ کی نفی کے لیے عام ہے ـــــــ

قرآن مجید میں ہے :-

أَهَـٰٓؤُلَآءِ ٱلَّذِينَ أَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ ٱللَّهُ بِرَحْمَةٍ (الاعراف - ۴۹)

کیا یہی لوگ ہیں جن کے بارے میں تم نے قسمیں کھائی تھیں کہ خدا کی رحمت میں ان کے لئے کوئی حصہ نہیں ہے

دوسری جگہ ہے :-

وَقَاسَمَهُمَآ إِنِّى لَكُمَا لَمِنَ ٱلنَّـٰصِحِينَ فَدَلَّىٰهُمَا بِغُرُورٍ (الاعراف - ۲۱)

اور اس (ابلیس) نے ان دونوں سے قسمیں کھائیں کہ میں تم لوگوں کے خیر خواہوں میں سے ہوں۔ پھر ان کو فریب سے مائل کر لیا۔

حلف، کے معنی بھی کاٹنے اور تیز ہونے کے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ بالکل لفظ قسم کے مشابہ ہے۔ عربی میں دستانِ حلیف اور لسان حلیف وغیرہ محاورات عام طور پر مستعمل ہیں۔ ازہری کے نزدیک یہ 'حلف' سے ماخوذ ہے جو ایک تیز نکیلی گھاس ہے پس حلف علی امر، کا مفہوم لعینہ وہی ہوگا جو قطع بامر ہوگا۔ لفظ کی اصل معنوی روح یہی ہے۔ پھر یہ لفظ قسم کی طرح بات میں عزیمت اور پختگی کے اظہار کے لئے استعمال ہونے لگا۔ اور اسی وجہ سے اس کے لئے مقسم بہ کوئی ضروری چیز نہیں ہے ـــــــ

قسم کا اصلی مفہوم جبکہ مقسم بہ موجود ہو

ـــــــ جو قسم مقسم بہ سے خالی ہو اس کی اصل حقیقت جب تم پر واضح ہو گئی تو مقسم بہ والی قسموں کا سمجھ لینا تمہارے لیے کچھ مشکل نہیں رہا۔ ان کی حقیقت بس یہ ہے کہ قسم کھانے والا اپنے ساتھ اپنے دعوے کے گواہ کے طور پر مقسم بہ کو ملا لیا کرتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قسموں میں بیشتر 'و، ب، ت' وغیرہ کا استعمال ہے جو معیت وصحبت کا مفہوم ظاہر کرنے والے حروف ہیں ـــــــ

" و " اور " ب " معیت وصحبت کے مفہوم کے لیے مشہور ومستعمل ہیں، البتہ " ت " کے بارے میں تمہیں تردد ہوگا۔ لیکن یہ بھی حقیقت میں " و " ہے جو منقلب ہو کر " ت " بن گئی۔ جس کی مثال تم " تقوی " اور " تجاہ " وغیرہ الفاظ میں دیکھ سکتے ہو ـــــــ

قرآن مجید سے بھی ہمارے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے۔ انبیاء کے میثاق کے متعلق فرمایا ہے ـــــــ

وَإِذْ أَخَذَ ٱللَّهُ مِيثَـٰقَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ لَمَآ ءَاتَيْتُكُم مِّن كِتَـٰبٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِۦ وَلَتَنصُرُنَّهُۥ ۚ قَالَ ءَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب کہ اللہ نے نبیوں کے بارے میں میثاق لیا کہ البتہ میں تم کو جو کتاب وحکمت دوں اور پھر جب آئے تمہارے پاس کوئی رسول مطابق اس کے جو تمہارے پاس ہے تو تم اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا، پوچھا،

عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَکُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ فَمَنْ تَوَلّٰی بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (آل عمران ۸۱-۸۲)	کیا تم نے اقرار کیا اور میرا ذمہ لیا، کہا ہم نے اقرار کیا، کہا بس گواہ ہو اور میں تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں، بس جنہوں نے مُنہ موڑا اس کے بعد تو وہی لوگ بدعہد ہیں

یعنی یہ عہد جو تم سے میں نے باندھا ہے اپنی اور تمہاری موجودگی میں باندھا ہے پس اس سے مُکرنا کسی حال میں جائز نہیں ہو گا اور جو اس عہد کو توڑیں گے وہ بدعہد اور خائن ٹھہریں گے ــــــ

اس طرح کی تاکیدات کا اصلی راز یہ ہے کہ آدمی جب کہتا ہے کہ :" اشہد بہ" میں اس کی شہادت دیتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں اس کو اپنے علم، واقفیت اور مشاہدے کی بناء پر کہتا ہوں، صرف دوسروں سے سُن کر نہیں کہتا۔ پس ایسی شہادت کے بعد اگر وہ جھوٹ بولے اور مُکر جائے تو اس کے لئے کوئی وجہ عذر نہیں ہے۔ اسی بناء پر حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا ــــــ

وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا کُنَّا لِلْغَیْبِ حٰفِظِیْنَ۔ (یوسف۔۸۱)	اور ہم نے نہیں شہادت دی مگر اس بات کی جو ہم نے جانی اور ہم غیب کے عالم نہیں ہیں ــــــ

قسم میں اس پہلو کا استعمال بہترین شکل میں مندرجہ ذیل آیت میں پایا جاتا ہے :ــــــ

لٰکِنِ اللّٰهُ یَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَیْکَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ وَالْمَلٰٓئِکَةُ یَشْهَدُوْنَ وَکَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا (النساء ۱۶۶) لیکن اللہ گواہی دیتا ہے اس چیز کی جو تم پر اُتارا، اس کو اُتارا اپنے علم سے اور ملائکہ گواہ ہیں اور اللہ کی گواہی کافی ہے۔

شہادت کے اس سارے جھگڑے کو قرآن مجید کی ایک آیت چکا دیتی ہے جس میں "شہادت" اور "اشہاد" تصریح کیساتھ قسم کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ فرمایا ہے :ــــــ

اِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ۔ اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ (المنافقون ۱-۲)	جب تمہارے منافق آتے ہیں کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں کہ تم اللہ کے رسُول ہو۔ اللہ جانتا ہے کہ تُو اس کا رسُول ہے اور اللہ گواہ ہے کہ منافق جھوٹے ہیں انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے۔ پس روکتے ہیں اللہ کی راہ سے۔

قسم مقسم بہ یا مُخاطب یا متکلّم کی تعظیم کے پہلو سے

۱ــــــ سچائی عرب کی فطرت کا اصلی جوہر تھی، بالخصوص جب وہ کوئی معاہدہ کر لیتے کسی بات کے لئے زبان دے دیتے معاملے میں قسم کھا بیٹھتے تو پھر اس سے ٹلنا ان کے لئے ناممکن ہوتا۔ وہ کسی کے حلیف ہوتے یا کسی سے رشتہ جوار قائم کرتے نذر مانتے تو اپنی ذمّہ داری جس طرح بھی ممکن ہوتا ضرور پوری کرتے، قسم کھا لینے کے بعد اس سے مُکرنا اور پیچھے قدم ہٹانا وہ غیرت وحمیت کی انتہائی توہین سمجھتے تھے۔ معاہدے کے وقت وہ جو ہاتھ میں ہاتھ دیتے تھے تو اس کی معنی یہ ہوتے کہ اس کی حُرمت کے لئے وہ اپنی جان کے لئے ہر جوکھم برداشت کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جان کو خطرے میں ڈالنا قسم کا ایک لازمی ہو گیا۔

ہے۔ چنانچہ عرب میں سب سے زیادہ عام قسم "لعمری" (میری جان کی قسم) ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ میں اپنی بات کے لئے اپنی زندگی خطرے میں ڈال دوں گا ——

۲ —— دوسری یہ کہ جب مقسم بہ مخاطب کی طرف مضاف ہو تو اس سے مقصود مخاطب کے عزّت و احترام کا اظہار ہوتا ہے مثلاً فرمایا ہے:——

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (الحجر ۲۰) تیری جان کی قسم وہ اپنی مدہوشی میں اندھے ہوئے جا رہے ہیں۔

اس خطاب سے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی عزّت بڑھائی ہے۔ اسی اسلوب کی دوسری آیت ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ الآیۃ (النساء ۶۵) | پس نہیں، تیرے رَبّ کی قسم وہ مؤمن نہیں ہیں تا آنکہ تجھے حَکم نہ مانیں ——

اور جب مقسم بہ کی اضافت متکلّم کی طرف ہوتی ہے تو اس سے خود اس کی عزّت و عظمت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ گویا وہ کہتا ہے کہ میری عزّت و حرمت ایسی بالاتر شے ہے کہ اس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کی جا سکتی ——

قرآن میں مخلوق کی قسموں کا جواب

۱ —— قرآن نے ایک ہی لفظ کبھی بندے کے لئے استعمال کیا ہے اور کبھی اللہ تعالیٰ کے لئے۔ ایسی صورت میں لامحالہ لفظ کے مختلف مفاہیم میں فرق کرنا پڑتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ جلّ شانہٗ کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہ ہو جائے جو اس کی عظمت و تقدیس کے منافی ہو۔ مثلاً صلوٰۃ جب بندے کی طرف سے ہو تو دُعا کے معنی میں ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہو تو رحمت کے مفہوم میں ہے۔ اسی طرح شکر بندے کی طرف سے اعترافِ نعمت ہے اور خدا کی طرف سے ہماری نیکیوں کی پذیرائی ہے۔ یہی حال توبہ، سخط، مکر، کید، اسف اور حسرت وغیرہ الفاظ کا ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ ہماری لُغت کا کوئی لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس کو ہم اس فرق کے لحاظ کے بغیر اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال کرتے ہوں۔ ہم تمام الفاظ میں یہی کرتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال کرتے وقت ان کے صرف انہی مفاہیم کو سامنے رکھتے ہیں جو خُدا کی ذات برتر کے شایانِ شان ہوں۔ بعینہٖ یہی طریقہ ہم نے قسم میں اختیار کیا۔

۲ —— حمل نظیر علی النظیر اور تفسیر آیات بالآیات کا اصول بھی اس کی طرف رہبری کرتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن کبھی تو دلائل و آیات کو سیدھے سادے اسلوب پر بیان کرتا ہے اور کبھی ان کے لئے قسم کا اسلوب اختیار کر لیتا ہے اور مقصود دونوں صورتوں میں اہلِ نظر کے سامنے شہادت پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ قرآن مجید میں فرمایا ہے:——

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ

آسمانوں اور زمین کی پیدائش، رات اور دن کی آمد و شد، اور ان کشتیوں میں جو لوگوں کے لئے نفع رساں سامان لے کر سمندروں میں چلتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اُتارا اور اس سے زمین کو اس کے خشک ہونے کے بعد شاداب کیا اور اس میں طرح طرح کے جانور پھیلائے اور ہواؤں کی گردش اور آسمان و زمین کے درمیان مسخّر بادلوں میں

لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔ (البقرہ-۱۶۴) ——— | عقل مندوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔

اس طرح کی آیتیں قرآن مجید میں بہت ہیں اور ان سب کا مقصود استشہاد و استدلال ہے۔ پھر غور کروگے تو دیکھوگے کہ بعینہٖ یہی چیزیں ہیں جن کو قرآن نے بطریقِ قسم شہادت میں پیش کیا ہے۔ قسم والی آیات پر ایک نظر ڈال کر دیکھو وہ کیا چیزیں ہیں؟ آسمان زمین، سورج، چاند، رات، دن، فجر، وقت چاشت، ہوا، ابر، پہاڑ، سمندر، شہر، انسان، باپ، بیٹا، نر، مادہ، جفت، طاق وغیرہ وغیرہ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ وہی چیزیں ہیں جو سادہ اسلوب میں بطور دلیل و شہادت پیش کی جاتی ہیں۔ پس ان کے دلیل ہونے کے ثبوت میں خود قرآن مجید کے نظائر موجود ہیں۔ اس لئے ان کو تعظیم کے مفہوم میں لینا کسی طرح صحیح نہیں ہیں ——— بلکہ ان چیزوں کو شہادت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے ———

۳ ——— خود مقسم بہ بھی اس دعوے کی تائید کرتا ہے کیونکہ کوئی عاقل ایک لمحے کے لئے بھی یہ باور نہیں کرسکتا کہ اللہ تعالیٰ خود اپنی پیدا کی ہوئی بعض چیزوں کو ایک معبود و مقدس کی حیثیت دے دے گا۔ بالخصوص جب کہ چیزیں بھی ایسی ہوں جن میں تقدس کا کوئی خاص پہلو موجود نہ ہو، مثلاً دوڑنے والے گھوڑے، غبار اڑانے والی آندھی وغیرہ وغیرہ ——— اور اس کے برعکس قرآن نے ان تمام چیزوں کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ سب مطیع و محکوم اور خلق کی نفع رسانی کے لئے مسخر ہیں۔ پس مجرد ان چیزوں کی قسم کھانا ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ ان کو محض بطور شہادت کے پیش کیا گیا ہے ———

۴ ——— مقسم بہ اور مقسم علیہ میں بالعموم نہایت واضح مناسبت موجود ہوتی ہے۔ قرآن نے ان قسموں کو ایسے قالب میں پیش کیا ہے کہ صاحبِ نظر بادنیٰ تامل مقسم علیہ کے ساتھ ان کے تعلق کو پالیتا ہے ———

۵ ——— جس طرح کی تعمیم قرآن مجید میں عام آیات و دلائل کے بیان کے سلسلے میں ہے۔ بعینہٖ اسی قسم کی تعمیم و وسعت بعض جگہ مقسم بہ میں موجود ہے۔ مثلاً فرمایا ہے:———

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ——— (الحاقہ ۳۸-۳۹) | سو نہیں، میں قسم کھاتا ہوں اس چیز کی جس کو تم دیکھتے ہو اور اس چیز کی جس کو تم نہیں دیکھتے ———

اس قسم میں جملہ کھلی چھپی چیزوں کو سمیٹ لیا ہے اور یہ وہی تعمیم ہے جو:———

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (الایہ (اسراء ۴۴)- نہیں ہے کوئی شے مگر اس کی تسبیح کرتی ہے حمد کے ساتھ۔

میں ہے اور اسی تعمیم سے ملتی جلتی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں قسم کھائی ہے وہاں متقابل چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ یعنی روز اور شب، زمین اور آسمان۔ پس کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کی اس عموم کے ساتھ تعظیم فرمائی ہو۔ البتہ ان کو دلیل و شہادت کے طور پر ذکر کرنے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ پس اس راہ کے سوا کوئی اور راہ اختیار کرنا ہمارے نزدیک بالکل غلط ہے۔

۶ ——— بعض جگہ مقسم بہ کے بعد ایسی تنبیہات بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اہلِ نظر کے سامنے بطور دلیل و شہادت پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً۔

وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ۔ (الفجر ۱-۵) | شاہد ہے فجر اور دس راتیں اور جفت و طاق اور رات جب ڈھل چلے کیوں اس میں تو ہے قسم عقلمند کے لئے۔

اس میں آخری ٹکڑا هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ۔ (کیوں اس میں تو ہے قسم عقلمند کے لئے) بالکل اسی طرح کی بات ہے جیسی کہ بالعموم دلائل کے ذکر کے بعد قرآن میں آتی ہے، مثلاً سورہ نحل میں بہت سے دلائل کے بعد فرمایا:۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۔ (۱۲)
اس میں بہت سی نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لئے۔

سورہ طٰہٰ میں ہے :—

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰی۔ (۵۴)
بے شک اس میں بہت سی نشانیاں ہیں اہلِ عقل کے لئے۔

آلِ عمران میں ہے :—

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ (۱۳)
بے شک اس میں سامانِ عبرت ہے اہلِ بصیرت کے لئے۔

اسی عام اسلوب کے مطابق سورۂ فجر میں قسمیں کھانے کے بعد ارشاد فرمایا کہ ان قسموں کے اندر اہلِ عقل و بصیرت کے لئے بہت سے دلائل پوشیدہ ہیں —

سورۂ واقعہ کی تنبیہ بھی اس سے ملتی جلتی ہوئی ہے۔ فرمایا ہے —

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ۔ (۷۵-۷۶)
سو نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے ڈھلنے اور ڈوبنے کی جگہوں کی اور بلاشبہ یہ ایک عظیم الشان قسم ہے اگر تم لوگ جانو۔

یعنی اس میں بہت بڑی دلیل اور ایک عظیم الشان شہادت ہے۔ یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ قسم کی بڑائی کی تصریح فرمائی ہے مقسم بہ کی عظمت کا ذکر نہیں فرمایا —

۷ — بالعموم مقسم بہ کا ذکر ایسے صفات کے ساتھ ہوتا ہے کہ اس سے استدلال مترشح ہوتا ہے۔ مثلاً —

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی۔ (النجم-۱) ⊥ شاہد ہے ثریا جب مائل ہو —

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ (التکویر ۱۵-۱۶) سو نہیں، میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے والے چلنے والے (ستاروں) کی۔

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۝ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۝ فَالتّٰلِیٰتِ ذِكْرًا (الصّٰفّٰت - ۱-۳)
قسم ہے ان کی جو صف باندھتے ہیں پھر ڈانٹتے ہیں پھر ذکر کی تلاوت کرتے ہیں —

وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا ۝ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۝ فَالْجٰرِیٰتِ یُسْرًا ۝ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا (الذاریات ۱-۴)
قسم ہے ہواؤں کی جو اڑاتی ہیں غبار پھر اٹھا لیتی ہیں بوجھ، پھر چلنے لگتی ہیں آہستہ۔ پھر الگ الگ کرتی ہیں معاملہ کو۔

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (القیامۃ-۲)
اور نہیں، میں قسم کھاتا ہوں نفس ملامت گر کی —

غور کرو تاروں کا گرنا اور پیچھے ہٹنا، ملائکہ کی صف بندی، ہواؤں کی غبار انگیزی اور تقسیمِ امر، نفس کی ملامت گری، ان باتوں کو استدلال سے زیادہ تعلق ہے یا ان کی تعظیم کی جا رہی ہے —

۸ — بعض مقامات میں ایسا ہے کہ مقسم بہ سے پہلے عام دلائل و آیات کا ذکر ہوا ہے۔ پھر اس کے بعد مقسم بہ ایسے انداز سے آیا ہے کہ انگلی اٹھا کر تمام پچھلی دلیلوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے، گویا استدلال کا جو پہلو مدِ نظر تھا اس کی تمہید پہلے ہی سے جما دی گئی تھی، ایسے مواقع نظمِ قرآن کے طالب کے لئے بڑے نشاط انگیز ہوتے ہیں۔ اس کو ایک مثال سے سمجھنا چاہیئے۔ سورۂ ذاریات میں فرمایا گیا ہے

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ (۲۰-۲۲)
اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لئے اور خود تمہارے اندر بھی۔ کیا تم نہیں دیکھتے؟ اور آسمان میں تمہاری روزی ہے اور وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔

یعنی آسمان و زمین میں خدا کی پروردگاری اور روز جزاء کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں۔ جیسا کہ دوسرے مقامات میں اس کی

تفصیل فرمائی ہے، پھر آسمان وزمین کے دلائل جزا کا حوالہ دینے کے بعد فرمایا :—

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ (الذاریات ۲۳) | پس آسمان اور زمین کے پروردگار کی قسم، یہ بات حق ہے جس طرح کہ تم بولتے ہو—

"وہ" سے مُراد اس آیت میں جزاء ہے۔ جن لوگوں نے یہاں قرآن مُراد لیا ہے ان کا خیال صحیح نہیں ہے —

اس قسم پر جم کر غور کرو۔ اس میں تعظیم کا پہلو موجود ہے۔ کیونکہ قسم اللہ تعالیٰ کی کھائی گئی ہے لیکن اس کے باوجود اس میں آسمان اور زمین کی نشانیوں سے استدلال کا پہلو نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ چنانچہ مقسم بہ کا ذکر ایسی صفت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ جو ماسبق استدلال کی طرف خود اشارہ کر رہی ہے اور چونکہ اس میں تعظیم کا پہلو زیادہ اُبھرا ہُوا تھا جو ممکن تھا کہ استدلال کے پہلو کو دبا دیتا اس لئے مناسب ہُوا کہ استدلال کی تمہید پہلے استوار کی جائے —

قسم کی بلاغتیں

— ممکن ہے کسی کو شُبہ ہو کہ اگر یہ قسمیں دلیل ہیں تو ان کو دلیل کے صاف اسلوب میں کیوں نہیں پیش کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ استدلال کی مختلف حالتیں ہیں، بعض مرتبہ استدلال ایسے امور پر ہوتا ہے جن میں نفرت یا رغبت کا کوئی پہلو نہیں ہوتا اس کی نہایت واضح مثالیں علوم طبیعی، ریاضی یا بالعموم تاریخ میں مِل سکتی ہیں۔ ایسے مواقع پر بلاشبہ استدلال کا کوئی واضح اسلوب ہی موزوں ہو سکتا ہے۔ لیکن بعض اوقات استدلال کا تعلّق ایسے نفسیاتی امور سے ہوتا ہے جن میں متکلّم ومخاطب دونوں طرف سے ترغیب وانکار، زجر واعراض اور ضد واصرار کی ایک خاص کشاکش ظہور میں آجاتی ہے۔ ایسے مواقع میں ضرورت پیش آتی ہے کہ دلیل کو مختلف صورت اور بھیسوں میں پیش کیا جائے اور کلام کے ایسے ڈھب اختیار کئے جائیں جو وضاحت ولطافت اور قوّت وشدّت کے اعتبار سے متفاوت ہوں، یہی نکتہ ہے کہ بعض مرتبہ اسلوبِ کلام بدل دیا جاتا ہے۔ تاکہ مخاطب ایک ہی انداز کی گفتگو سے بے مزہ نہ ہو اور اگر ایک اسلوبِ کلام اس پر مؤثر نہیں ہوتا تو دُوسرا اختیار کیا جاتا ہے کہ ممکن ہے یہ کچھ کارگر ہو۔ قرآن مجید نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے —

اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ۔ (الانعام ۶۵) | غور کرو کس طرح ہم اپنی آیتیں ہیر پھیر کر بیان کرتے ہیں۔ تاکہ وہ سمجھیں —

حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے جس بادشاہ سے مجادلہ کیا تھا، اس کے ساتھ بھی آپ نے یہی انداز اختیار کیا، جب دیکھا کہ جو دلیل انہوں نے مخاطب کے سامنے پیش کی ہے، اس کو وہ نہیں سمجھ رہا ہے۔ انہوں نے اس کو ترک کرکے فوراً دوسری دلیل اختیار کر لی اور پہلی دلیل پر اصرار مناسب نہیں سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ معترض اس دوسری دلیل کے سامنے بے بس ہو کے رہ گیا —

یہ شبہے کا اجمالی جواب ہُوا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اسلوب قسم کے اندر محاسن بلاغت کے جو گوناگوں پہلو موجود ہیں، ان میں سے بعض کی طرف یہاں اشارہ کریں —

۱— اس اسلوب سے قول کی پختگی اور تاکید کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں رسولوں کا قول مذکور ہے —

قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ وَمَا | کیا ہمارا پروردگار شاہد ہے کہ ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں۔

عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (یٰسٓ ۱۶، ۱۷) ——— اور نہیں ہے ہماری ذمہ داری مگر کھلے طور پر پہنچا دینا۔

سورہ طارق میں ہے :-

وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ وَ الْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (۱۱-۱۴)	اور شاہد ہے آسمان پر نگار اور زمین پر شگاف کہ یہ دو ٹوک بات ہے اور ہنسی مسخری نہیں ہے ـــ

اور عرب اس بات کو جانتے تھے کہ ایک شریف انسان جب کسی بات پر قسم کھاتا ہے تو اس سے اس کا مقصود بات کی سچائی اور واقعیت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اوائل نبوت میں قسمیں زیادہ ہیں تاکہ لوگوں کے سامنے معاملے کی اہمیت اور سنجیدگی پوری طرح واضح ہو جائے اور یہ چیز خود اسلوب قسم کی خصوصیات میں سے ہے۔ اس وجہ سے نہیں ہے کہ اس میں تعظیم کا کوئی پہلو ہوتا ہے۔

قرآنِ حکیم اور اکتشافاتِ جدیدہ

مولانا محمد شہاب الدین ندوی لکھتے ہیں:۔

دُنیا میں قرآنِ کریم ہی ایک ایسی زبردست علمی کتاب ہے جس نے انسانی ذہن و فکر پر گہرے اثرات ڈالے ہیں اور روزِ اوّل ہی سے بحث و مباحثہ اور فکر و نظر کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔ اس کی موافقت و مخالفت پر اتنا کچھ کہا اور لکھا گیا ہے کہ شاید ہی کسی دوسری کتاب پر کہا اور لکھا گیا ہو ـــــ یہ سلسلہ برابر جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا ـــــ

اختلافِ آراء

آج کل موضوعِ سخن یہ بنا ہوا ہے کہ قرآن عصرِ جدید کے تقاضوں کا کہاں تک ساتھ دے سکتا ہے؟ جدید علمی حقائق اور سائنٹیفک اکتشافات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت کہاں تک رکھتا ہے اور موجودہ بدلے ہوئے حالات میں انسان کی رہنمائی کہاں تک کر سکتا ہے وغیرہ۔ اس سلسلے میں اُس کے مخالفین کا تو ذکر ہی کیا خود اُس کے حامی اور متعقین تک مختلف و متضاد نظریات رکھتے ہیں ـــــ

۱ـــ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ قرآن مجید محض دینی و شرعی احکامات کا مجموعہ ہے وہ لوگوں کو مراسمِ عبودیت سکھانے کی خاطر نازل ہوا، کائنات اور اُس کے حقائق سے اُس کو کوئی بحث ہی نہیں ہے ـــــ

۲ـــ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ قرآن سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کرنے اور زمین کے مادّی و پوشیدہ خزانوں سے مستفید ہونے کی دعوت دیتا ہے لہٰذا مادّیات میں ترقی کر کے کائنات کی تسخیر کرنا ہی اسلام اور خلافتِ الٰہیہ کا اصل منشاء ہے ـــــ

۳ـــ کسی کا اعتراض ہے کہ قرآن میں جب "سب کچھ" مذکور ہے اور تمام ایجادات و اکتشافات کا تذکرہ کر دیا گیا ہے تو پھر خود مسلمان اس درجہ پسماندہ کیوں ہیں اور سائنسی علوم میں ترقی کر کے چاند ستاروں وغیرہ پر کیوں نہیں پہنچ سکتے۔؟

۴ـــ کوئی معترض ہے ـــــ کہ جب قرآن میں چاند کی تسخیر وغیرہ کا ذکر موجود ہے تو پھر قدیم مفسّرین نے اس کا تذکرہ نہیں کیا؛ کیا وہ قرآن کو صحیح طور پر سمجھ نہیں پائے تھے؟ ـــــ

۵ـــ کوئی اعتراض کرتا ہے کہ قرآنِ کریم کو عصری ایجادات و اکتشافات کا پابند بنا دینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے اور یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا ـــــ

صحیح نقطۂ نظر

واقعہ یہ ہے کہ یہ اور اس قسم کے تمام نظریات و اعتراضات افراط و تفریط کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ قرآن مجید کا بنیادی مقصد تو نوعِ انسانی کی ہدایت و رہنمائی ہی ہے مگر وہ فکر و نظر کی اصلاح اور غلط افکار و معروضات کی تردید کی خاطر کائنات کے حقائق سے بھی بحث کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ دین اور شرعی امور کا تذکرہ تو نہایت واضح انداز میں اور پوری صراحت کے ساتھ کرتا ہے تاکہ اس کے ماننے والوں کو کسی بھی دور میں اپنے معاملاتِ زندگی کے سمجھنے میں اشتباہ نہ رہے اور وہ ہر دور میں صراطِ مستقیم پر گامزن رہیں۔ اس کے برعکس وہ امور جو تکوین یا فطرت (NATURE) سے متعلق ہوتے ہیں ان کو محض اشاروں کنایوں کی زبان میں ایک خاص انداز اور ایک خاص اسکیم کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ جن کا صحیح مفہوم

اور صحیح مطلب اُسی وقت واضح ہو سکتا ہے جب کہ تحقیق و تفتیش کے باعث کائنات کے اسرار اور قدرت کے مخفی رازوں کا افشا ہو جائے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس قسم کی آیات کا مفہوم ہر دَور میں بدلتا رہے گا ـــــ بلکہ دراصل قرآنی آیات کی ساخت و ترکیب اور ان کے الفاظ و معانی میں بڑی وُسعت اور حیرت انگیز لچک رکھی گئی ہے۔ اس درجہ جامعیت اور خوبی کے ساتھ کہ ہر دَور کے معلومات و اکتشافات کی بدولت اُن کے نئے نئے پہلو بھی اُجاگر ہوتے جائیں اور اُن کا قدیم مفہوم بھی غلط نہ ہونے پائے بلکہ مزید گنجائش نئے نئے معانی و مطالب کے اخذ و استفادہ کی برابر باقی رہے ـــــ

میں اس موقع پر ایک مثال پیش کروں گا جس کے ذریعہ یہ مسئلہ بھی بخوبی ذہن نشین ہو جائے گا اور اس سلسلے کی بہت سی غلط فہمیاں بھی دُور ہو جائیں گی۔ قرآن حکیم میں کہا گیا ہے :ـــــ

" ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی ہی سے پیدا کیا ہے "۔

موجودہ دَور سے پہلے اس کا مطلب یہ لیا جاتا رہا کہ تمام حیوانات نطفہ ہی سے وجود پذیر ہوتے ہیں جو پانی ہی کی ایک شکل ہے یا مجازاً اُس کو پانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ مفہوم اپنی جگہ پر بالکل صحیح تھا اور ہے۔ مگر جدید سائنسی تحقیقات کی بدولت ایک نیا مفہوم سامنے آیا ہے جس کے پیشِ قرآنِ حکیم کے حیرت انگیز اعجاز کا حال بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حیاتیات (BIOLOGY) کی ترقی کی بدولت اس بات کا پتہ لگایا جا چکا ہے کہ تمام حیوانات و نباتات کی تشکیل یکساں قسم کے مادّہ سے ہوئی ہے اور خوردبینی مشاہدہ سے پتہ چلا ہے کہ حیوانات و نباتات کے اجسام نہایت درجہ ننھّے ننھّے خلیوں پر مشتمل ہیں، اِن خانوں میں ایک لیسدار، چپ چپا اور متحرّک مادّہ بھرا رہتا ہے جس کو پروٹو پلازم کا نام دیا گیا ہے اور کیمیائی تجزیہ سے پتہ چلا ہے کہ اس مادّہ کا اکثر و بیشتر حصّہ پانی پر مشتمل ہے ـــــ اب غور فرمائیے کہ " قرآنِ کریم کا یہ بیان کہ ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی ہی سے بنایا ہے "کس قدر بلیغ اور حکیمانہ ہے وہ نہ تو حیوانات و نباتات کا نام لیتا ہے نہ پروٹو پلازم کا ہی کوئی ذکر کرتا ہے بلکہ ایسے جامع الفاظ استعمال کرتا ہے جو اس جدید حقیقت اور پروٹو پلازم کے اکتشاف کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لے۔ جیسا کہ "کل شئ حیّ (ہر جاندار چیز) کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے یہ قرآن مجید کا معجزہ نہیں تو پھر کیا ہے ۔؟۔

یہ محض ایک مثال ہے اس پر دوسرے امور کو بھی قیاس کر لیجئے کہ قرآن حکیم کے حیرت انگیز بیانات میں جدید سے جدید تر تمام تحقیقات کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کی گنجائش روزِ ازل ہی میں رکھ دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ معجزانہ خصوصیّت وہی عظیم ترین ہستی رکھ سکتی ہے جس کا علم تمام زمانوں کو محیط ہو اور جس کی نظروں سے قیامت تک واقع ہونے والی کوئی بھی حقیقت اوجھل نہ ہو

اس ملاحظہ سے حسبِ ذیل حقائق بے نقاب ہو جاتے ہیں :ـــــ

۱ ـــ قرآن حکیم میں قدرت کے مخفی رازوں کا بیان ایک خاص انداز میں موجود ہے ـــــ

۲ ـــ قدرت کے یہ بھید سائنس کی ترقی کے بعد ہی ظاہر و منکشف ہوتے ہیں ـــــ

۳ ـــ قرآنی آیات میں لچک اور وسعت رکھی ہوئی ہے اور وہ تحقیقاتِ جدیدہ کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کی صلاحیّت و استعداد رکھتی ہیں ـــــ

۴ ـــ نئے مفہوم کو لینے سے پرانا مفہوم بالکل غلط یا باطل نہیں ہو جاتا بلکہ آیتِ کریمہ کا ایک نیا پہلو جلوہ گر ہوتا ہے ـــــ

۵ ـــ اس سے نہ تو اگلے مفسّرین کی کوئی تنقیص ہوتی ہے اور نہ ان پر قرآنِ حکیم کو ٹھیک طرح سے نہ سمجھ سکنے کا الزام ہی لازم آتا ہے کیونکہ انہوں نے جو کچھ بھی بیان کیا تھا وہ اپنے دَور کی معلومات کے مطابق بالکل صحیح تھا ـــــ

۶ ـــ نئے مفہوم کو لینے سے جدید مفسّر کی شان کچھ دوبالا نہیں ہوجاتی، کیونکہ اُس نے جو مفہوم لیا ہے وہ موجودہ تحقیقات وانکشافات کے عین مطابق ہے ـــــ

۷ ـــ قرآنِ حکیم کے نئے نئے مصادیق ومطالب کا یہ سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا۔ خود حدیث شریف میں آیا ہے کہ :۔

"قرآن کے عجائبات کبھی ختم نہ ہوسکیں گے" ـــــ (ترمذی)

سائنس اور مُسلمان

مذکورہ بالا حقائق کے ملاحظہ کے بعد یہ اعتراض خود بخود رفع ہوجاتا ہے کہ قرآنِ کریم میں جب تمام ایجادات واکتشافات کا بیان موجود ہے تو پھر مسلمان پسماندہ اور خستہ حال کیوں ہیں؟ ظاہر ہے کہ رازہائے قدرت کی دریافت کے بعد ہی قرآن کے اشارات کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اس سے پہلے ان حقائق کو سمجھنا مشکل ہے تو پھر ان حقائق سے قبل ازوقت واقف ہوکر ترقی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ـــــ نیز اس سے یہ نظریہ بھی غلط ہوجاتا ہے کہ قرآن کی اصل دعوت مادّی قوّتوں کو زیر کرکے مظاہرِ فطرت سے استفادہ کرنا اور معیارِ زندگی کو بلند کرنا ہے۔ اگرچہ وہ مادّی مظاہر سے استفادہ کا اصلاً مخالف نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ مجموعی اعتبار سے کائنات کے نظام میں غور وفکر کرنے اور اس کی مشنری کو سمجھنے کی نہ صرف دعوت دیتا ہے بلکہ جگہ جگہ اس کی تاکید بھی کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں کائنات کے مخفی گوشے سامنے آتے ہیں اور ضمناً تمدن بھی ترقی کرتا جاتا ہے، جس کی بدولت جسمانی راحت وآسائشوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے ـــــ

تہذیب وافکار

اَب حل طلب مسئلہ صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اصل حقیقت جب یہ ہے تو پھر قرآن مجید میں اس درجہ ایجاز واختصار اور رمز وکنایہ کی آخر ضرورت ہی کیا تھی اور اس کا فائدہ ہی کیا ہے؟ تو اس سلسلے میں حسب ذیل حقائق پر نظر رہنی چاہیئے :ـــــ

۱ ـــ سب سے پہلے اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسانی ذہن ودماغ کو قابو میں رکھا جائے اور اُس کو کسی طرح بھی بہکنے نہ دیا جائے یعنی کائناتی علوم کی ترقی اور مختلف ایجادات واکتشافات کے ظہور کے باعث انسان مغرور وخودسر ہوکر خدا کا انکار نہ کر بیٹھے۔ لہٰذا اُس کو الحاد ولادینیت کے مضر اثرات سے بچانے کے لئے ایسے دلائل فراہم کرنا ضروری ہے جو خدا پرستی کی تصدیق وتائید کرنے اور انسان کے باغیانہ رویّہ کی مذمت وبُرائی بیان کرنے والے ہوں۔ قرآن کے سائنٹیفک بیانات سے دراصل یہی دلائل وشواہد فراہم کرکے منکرین ومعاندین پر اتمام حجّت کرنا مقصود ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں ان دلائل وشواہد کو "آفاقی وانفسی دلائل" کہا جاتا ہے۔ ۲ ـــــ اسلام، انسان کو تمدنی ترقیوں سے نہیں روکتا بلکہ اُس کے باغیانہ رویّہ پر قدغن لگاتا ہے۔ سائنسی ترقیوں کے بدولت انسانی تمدّن کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرلے وہ ہر دَور کے تقاضے کیمطابق انسان کو غلط روی سے بچاتا اور اُس کے فکر ونظر کی اصلاح کرتا رہتا ہے۔ یہی قرآنِ عظیم کی اصل ہدایت اور اُس کا سب سے بڑا اعجاز ہے ـــــ

۳ ـــــ قرآنِ عظیم کی یہ ہدایت ہر دور کے تقاضے کے مطابق قیامت تک جاری رہے گی اور وہ کبھی فرسودہ یا آؤٹ آف ڈیٹ ہونے نہ پائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس لافانی صحیفہ کو کائنات کے تمام بُنیادی رازوں کا امین بنادیا گیا ہے ـــــ

۴ ـــــ خدا پرستی کے اثبات اور خدا بیزاری کے ابطال کے لئے جتنے بھی علمی وعقلی اور سائنٹیفک دلائل ممکن ہوسکتے تھے وہ سب قرآن حکیم میں ودیعت کردیئے گئے ہیں۔ کائنات کے حقائق یا قوانینِ فطرت (LAWS OF NATURE) کو بُنیاد بناکر دراصل انہی علمی وسائنٹیفک دلائل کا اظہار مقصود ہے، تاکہ ان کے ذریعہ ہر دَور کی ذہنی پیداوار کے مطابق اُس کی دعوت وہدایت پر اثر انداز ہونے والے اعتراضات کا قلع قمع ہوتا رہے ـــــ

۵ —— قرآن مجید کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ انسان کو کائنات کے متعلق سوچ بچار کی غلط راہوں اور غلط سمتوں کی طرف جانے نہیں دیتا اور اصل راہ (صراطِ مستقیم) سے ذرا بھی بھٹکنے نہیں دیتا، بلکہ جگہ جگہ اُس کو ٹوکتا اور اُس کے فکر و نظر کی اصلاح و نگرانی کرتا رہتا ہے —— اس قسم کے دلائل و شواہد کی مثال کے لئے قرآنِ حکیم کے مذکورۂ بالا بیان ہی کو لے لیجئے: "اور ہم نے پانی ہی سے ہر زندہ چیز کو بنایا ہے" —— اس ایمان آفرین حقیقت کے ملاحظہ سے سب سے پہلے اور اوّلین طور پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کائنات میں ایک عالم ترین ہستی کا وجود ضروری ہے جس کا وجود نہ صرف ازلی ہے بلکہ اُس کی باتیں بھی کبھی نہیں بدلتیں اور اُس کے کلام کی سچائی ہر دور میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں یہ زبردست خصوصیت کسی انسانی کلام میں نہیں پائی جاسکتی، اس لحاظ سے قرآنِ عظیم کلامِ الٰہی قرار پاتا ہے ——

—— اور دوسری حیثیت سے غور کیجئے، تو پتہ چلے گا کہ محض پانی جیسی سادہ چیز سے ایک حیرت انگیز مادہ (پروٹوپلازم) پیدا کر دینا اور اس مشترکہ مادّہ کے ذریعہ مختلف اور گوناں گوں خصوصیت رکھنے والے قسم ہا قسم کے حیوانات و نباتات کی تخلیق کر دینا ربوبیت کا ایک حیرتناک کرشمہ اور شاندار معجزہ نہیں تو پھر کیا ہے —؟

—— تیسری حیثیت سے نظر کیجئے تو معلوم ہوگا کہ دُنیائے سائنس جس مادۂ اولیٰ کو پروٹوپلازم کہتی ہے اُس کی مکمل ماہیت و حقیقت کی وہ اب تک راز جوئی نہیں کر سکی اور نہ اس رازِ سربستہ کی نقاب کشائی ہی کر سکی ہے کہ یہ پُراسرار مادہ ابتداً کیسے اور کس طرح وجود میں آگیا! عبرت کی بات تو یہ ہے کہ وہ پروٹوپلازم میں پائے جانے والے عناصر مثلاً آکسیجن، ہائیڈروجن، کاربن اور نائٹروجن وغیرہ کو جب اسی مقدار میں اکٹھا کرتی ہے تو اس سے پروٹوپلازم (زندہ و متحرک مادّہ) نہیں بن پاتا اور اس میں حرکت و زندگی کی کوئی رمق بھی نمودار نہیں ہوتی ——

دُنیائے سائنس کی اس ناکامی و نامرادی سے ملحدوں کا یہ نظریہ باطل ہو جاتا ہے کہ یہ عظیم الشان کائنات خود بخود وجود میں آگئی ہے اور "زندگی" محض بخت و اتفاق کی پیداوار ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ اس عالمِ رنگ و بو میں ایک باشعور و باارادہ ہستی کا وجود ضرور ہے جو نہایت درجہ حکمت و دانائی کے ساتھ مظاہرِ کائنات کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ یہی خُدا ہے جس کا وجود ایک زندہ و تابندہ صداقت ہے۔ لہٰذا موجودہ نام نہاد روشن خیالی کے مطابق خُدا کے وجود کا اقرار جہالت و نادانی کی بات نہیں بلکہ اس کا انکار درحقیقت جہل و نادانی کا مظہر ہے، اسی لئے قرآن حکیم میں مذکورہ بالا بیان کے آخر میں کہا گیا ہے: **أفلا یؤمنون** کیا وہ اب بھی ایمان نہیں لائیں گے ؟ —— یہ ہے قرآنِ حکیم کے آفاقی و انفسی دلائل کی حقیقت و نوعیت اور اُس کی ایک جھلک۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم صرف علمی انکشافات ہی نہیں کرتا بلکہ وہ باطل سے نبرد آزمائی کے طریقے بھی سکھاتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ عصری علوم سے بھی استفادہ کیا جائے اور غور و خوض کر کے قرآن حکیم کے بلیغ اشارات کو سمجھنے کی بھی کوشش کی جائے ——

کائنات کے ملاحظہ و جائزہ سے دراصل ایک زبردست اور قادر ترین ہستی کا وجود ثابت ہوتا ہے اور قرآن مجید کے مطالعہ سے ایک عالم ترین ہستی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ یہ کائنات خداوند جل جلالہٗ کی قدرتِ کاملہ کے آثار ہیں۔ تو قرآن حکیم اُس کے علم ازلی کا نمونہ اور ان دونوں کی تطبیق و ہمنوائی سے عرفانِ حق حاصل ہو جاتا ہے اور غلط و دور از کار فلسفیانہ نظریات و تخیلات کے تانے بانے ٹوٹ جاتے ہیں، یہ ہے وہ بنیادی وجہ جس کی بناء پر قرآن میں کائنات اور اس کے اسرار و حقائق سے بحث کی گئی ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ قرآن محض علومِ طبیعی (PHYSICAL SCIENCES) کے اکتشافات کا خبرنامہ نہیں ہو سکتا ——

قرآن میں تسخیرِ کائنات اور آفاقی دلائل کا مقصد

قرآن کریم نہ تاریخی کتاب ہے کہ محض واقعات کی تفصیل ہی بیان کرتا رہے اور نہ ہی طبعی نوامیس کی تفصیل و بیان پر مشتمل کتاب طبیعات ہے کہ محض علمی افسانوں میں وقت ضائع کرے۔ وہ تاریخی کی رُوح پیش کرتا ہے اور طبیعات کے فکر و عمل کے نتائج بیان کرتا ہے۔ جس سے توحیدِ الٰہی، خلق و ربوبیت کے حقائق انسان کے دل و دماغ میں پیوست ہوں اور رُوح کو پاکیزگی حاصل ہو۔

قرآن اگر کائنات میں غور کرنے کی دعوت دیتا ہے تو اس کی غرض و غایت یہی ہوتی ہے کہ انسانی ذہن و فکر کے سامنے اللہ تعالیٰ کی معرفت کا راستہ کھل جائے اور اس غور و فکر کے بصیرت آموز نتائج سے ایمان بالغیب کی تائید اور پرورش ہو، اس لئے کہ ان حقائق کونیہ اور حقائق الٰہیہ میں غور و خوض سے ایمان قوی ہوگا، وہ ان کی طرف محض علم و فن کی حیثیت سے کبھی دعوت نہیں دیتا کہ محض فن ہی کو مقصد بنالیا جائے ——

قرآنِ کریم کے بعض جدید مفسرین کو اسی سلسلہ میں بڑی غلط فہمی ہوئی ہے، انہوں نے ان موضوعات میں محض قرآنی مباحث کی تفسیر اور ان مباحث کی غرض و غایت بیان کرنے میں بڑے غلو سے کام لیا ہے اور یہ حقیقت ان نگاہوں سے اوجھل ہوگئی ہے کہ قرآن اگر طبیعات میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے تو اس کا مقصد بھی معرفتِ الٰہی تک پہنچنا ہے اور کسی جگہ ان طبعی مسائل کو خدمتِ خلق کا ذریعہ بنایا جائے، ظاہر ہے کہ ذات و صفاتِ الٰہی کے بحرِ بیکراں میں شناوری کا صرف یہی ایک راستہ ہے کہ انسان ان حقائق میں غور کرے تاکہ اس وادی میں ان کے فکر و نظر کی صلاحیتیں زیادہ وسیع ہوں اور ان کے سامنے معرفتِ الٰہیہ کے نئے نئے باب کھلیں اور جب اس طرح قلب و رُوح کی تربیت ہو جائے اور انسان کا صحیح شعور بیدار ہو جائے تو عملی دائرہ کا صحیح مقصد بھی خود بخود متعیّن ہو جاتا ہے

اس تمام بحث و تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ کائنات اور کونیات حق تعالیٰ کے کمالاتِ قُدرت اور صفات جلال و جمال کا ایک صحیفہ ہے جس کے مطالعہ سے اور اس میں غور و فکر کرنے سے ایمان میں پختگی پیدا ہوتی ہے اور اس حیثیت سے طبیعات کے جدید علوم ان اصحاب کے لئے بلاشبہ بصیرت افزا اور بیحد بصیرت افروز ہیں جن کو وحی کی راہ سے وصول الی اللہ حاصل نہ ہو۔ معرفتِ الٰہیہ ان علوم پر منحصر نہیں ہے بلکہ ظاہر بین اصحاب کے لئے حصولِ معرفت کا یہی ایک راستہ باقی رہ گیا ہے ——

عملی معارف کے بعد عملی نتائج ہیں اور اس علم و عمل سے حقیقی فوائد حاصل کرنے کے لئے صحتِ مقصد کی ضرورت ہے اور تصحیحِ مقصد کی ضرورت اور تصحیح مقصد کے لئے ایمان باللہ، ایمان بالرسل اور ایمان بالآخرت کے سوائے کوئی دوسری راہ نہیں ہے۔ ایمان و یقین سے محرومی اور بے مقصد علم و عمل ہی کی وجہ ہے کہ رُوس، امریکہ اور یورپ کی قومیں ان سائنسی ترقیات اور محیّر العقول ایجادات و اختراعات کے باوجود انسانیت کی صفوں سے نکل کر پوری درندگی کی حدوں تک پہنچ چکی ہیں ——

ایک طرف سائنس کی موجودہ ترقیات اور حیرت انگیز ایجادات و اختراعات کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

انسانی عقل میں کیا کیا صلاحیتیں رکھی ہیں اور جب ان صلاحیتوں سے کام لیا گیا ہے تو عقل نے کہاں تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ ان چیزوں کو دیکھ کر سائنس دانوں کے کمالات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ صورت کمال کا صرف ایک ہی رُخ ہے۔ اس تصویر کا دُوسرا رُخ دیکھئے کہ ان آیاتِ قدرت اور عجائباتِ خلق و تکوین کو دیکھنے کے بعد بھی وہ اب تک اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے اور ایمان باللہ کی دولت سے محروم ہیں۔ تو حیرت ہوتی ہے۔ کہ یہی عقلاء فکر و نظر کے اس رُخ پر اس قدر جاہل کیسے رہ گئے، لیکن حق تعالیٰ ان کے اس کفر و انکار کی حقیقت سے بھی پردہ اُٹھاتا ہے۔ ارشاد ہے:۔

یعلمون ظاهرًا من الحیوٰة الدنیا وهم عن الاٰخرة هم غٰفلون	وہ حیات دُنیا کے ظاہر ہی میں سے کچھ جانتے ہیں اور یہی لوگ آخرت سے تو بالکل ہی غافل ہیں

دُنیا کا بھی ظاہر اور وہ بھی ہمہ بہت محدود مقدار میں جانتے ہیں، ان کا ذہن اور ان کی فکر و نظر اس طرف بالکل نہیں جاتی کہ اس حیرت انگیز کائنات اور پُراسرار حقائق مخلوقات کے خالق پر ایمان لائیں، ایک طرف یہ ذہانت ___ اور حیرت انگیز ذہانت اور دوسری طرف اس قدر غباوت اور غیر معمولی غباوت بجائے خود کس قدر عجیب اور حیرت ناک ہے ___

پہلے اس سے کہ ہم کلمۂ تسخیر کے معنی بیان کریں۔ قرآن کریم کی ان آیاتِ ربّانی سے سرسری طور پر جن حقائق کی طرف رہنمائی ہوتی ہے ان کو اجمالاً پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں ___

۱ ___ یہ تمام کارخانۂ قدرت جس میں آسمان، زمین، چاند، سورج، سمندر اور دریاؤں کا حیرت انگیز نظام جسے نظامِ شمسی کہا جاتا ہے قائم ہے۔ یہ پُورا نظام عالم انسان کی خدمت و آسائش کے لئے ہے ___

۲ ___ یہ تمام عالم ملکوت حق تعالیٰ کی تخلیق کا نتیجہ ہے۔ اسی کے تصرّف میں ہے۔ اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے اور یہ سب کچھ اس کی عظمت و جلال کی نشانیاں ہیں ___

۳ ___ ان ملکوتی عجائب میں غور کرنے والے یقیناً خالق کائنات کی عظمت کے قائل ہوں گے اور اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ کارخانہ کسی عظیم ترین مقصد کا پیش خیمہ ہے اور اس کا نتیجہ فوق العادت نکلنے والا ہے۔ نہ یہ از خود وجود میں آیا ہے نہ ہی بے مقصد ہے یہ تخلیق بھی اسی کی ہے۔ اس پر اقتدار تصرّف بھی اسی کا ہے

۴ ___ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے چاند کے گھٹنے بڑھنے کی علّت اور سبب کو دریافت کیا، جواب میں سبب بتلانے کی بجائے مقصد سے آگاہ کیا گیا۔ کہ یہی معلوم کرنا اہم اور کار آمد ہے۔ باقی سبب و علّت یہ تو عقلی چیز ہے۔ خود مشاہدات و تجربات سے سمجھ جائیں گے۔ اصلی مقصد اس نظام کے منشاء قدرت کو سمجھنا ہونا چاہیئے۔ سو اس کو بتلا دیا

تسخیر کے معنی

عربی لغات میں تسخیر کے معنی ہیں۔ کسی چیز کو اپنے ارادہ کے تابع کر لینا یا کام میں لگا لینا اور اس طرح مجبور کرنا کہ وہ خلاف نہ کر سکے، چاند، سورج، رات دن اور کائنات کے تمام سیّاروں اور تاروں کی تسخیر کی حقیقت یہ ہے کہ ان سب کو حق تعالیٰ نے ایک ایسے نظام میں منسلک کر دیا ہے۔ کیا مجال ہے کہ اس مقرر کردہ نظام سے سر مو تجاوز کر سکیں۔ حق تعالیٰ کی تکوینی اور تخلیقی نظام کے مطابق یہ سب اپنے اپنے مدارات پر معلّق ہیں اور ایک نظام کے تحت چل رہے ہیں۔ یعنی اپنا اپنا کام انجام دے رہے ہیں۔ اور یہ تسخیر محض حق تعالیٰ کے ارادہ و اختیار اور تصرّف و اقتدار کا کرشمہ ہے۔ انسانی دسترس سے بالاتر ہیں۔ یہ تسخیر شدہ کائناتی اشیاء، اشیاء کونیہ ہیں اور ان کو مسخّر کرنے والی صرف حق تعالیٰ کی ذات جل ذکرہ ہے اور جس کے لئے ان کو تسخیر کیا گیا وہ حضرت انسان ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس حقیقت کی رُو سے انسانی ارادہ و اختیار اور تصرّف و اقتدار کو اس نظام کائنات میں ذرّہ برابر بھی دخل نہیں۔ نہ اس نظام کو روک سکتا ہے، نہ بدل سکتا ہے۔

قرآن میں شرکیہ تصوّرات کا حتمی انسداد

جہاں تک توحید اور شرک کا تعلق ہے، قرآن کا تصور اس درجہ کامل اور بے لچک ہے کہ اُس کی کوئی نظیر پچھلے تصورات میں نہیں مل سکتی۔ اگر خدا اپنی ذات میں یگانہ ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنی صفات میں بھی یگانہ ہو، کیونکہ اُس کی یگانگت کی عظمت قائم نہیں رہ سکتی، اگر کوئی دوسری ہستی اُس کی ذات میں شریک و سہیم مان لی جائے ۔۔۔۔

ایجابی پہلو یہ ہے کہ خدا ایک ہے۔ سلبی یہ ہے کہ اُس کی مانند کوئی نہیں، اور جب اُس کی مانند کوئی نہیں تو ضروری ہے کہ جو صفتیں اس کے لیے مخصوص ہیں ان میں کوئی دوسری ہستی شریک نہ ہو۔ پہلی بات توحید فی الذات ہے اور دوسری توحید فی الصفات سے تعبیر کی گئی ہے۔ قرآن سے پہلے اقوام عالم کی استعداد اس درجہ بلند نہیں ہوئی تھی کہ توحید فی الصفات کی نزاکتوں اور باریکیوں کی متحمل ہو سکتی۔ اس لیے ان مذاہب نے تمام تر زور توحید فی الذات ہی پر دیا۔ توحید فی الصفات اپنی ابتدائی اور سادہ حالت ہی میں چھوڑ دی گئی ۔۔۔۔

لیکن قرآن نے توحید فی الصفات کا ایسا کامل نقشہ کھینچ دیا کہ اس طرح کی لغزشوں کے تمام دروازے بند ہو گئے۔ اُس نے صرف توحید ہی پر زور نہیں دیا بلکہ شرک کی راہیں بھی بند کر دیں اور یہی اس باب میں اُس کی خصوصیت ہے ۔۔۔۔

وہ کہتا ہے ہر طرح کی عبادت اور نیاز کی مستحق صرف خدا ہی کی ذات ہے۔ پس اگر تم نے عبادت، عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے ساتھ سر جھکایا تو توحید الٰہی کا اعتقاد باقی نہ رہا۔ وہ کہتا ہے، یہ اُس کی ذات ہے جو انسانوں کی پکار سنتی اور ان کی دعائیں قبول کرتی ہے۔ پس اگر تم نے اپنی دعاؤں اور طلب گاریوں میں کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا تو خدا کے رشتۂ معبودیت کی یگانگی باقی نہ رہی۔ اسی طرح عظمت و کبریائیوں، کارسازیوں اور بے نیازیوں کا جو اعتقاد ہمارے اندر خدا کی ہستی کا تصور پیدا کرتا ہے، وہ صرف خدا ہی کے لیے مخصوص ہونا چاہیے، اگر تم نے ویسا ہی اعتقاد کسی دوسری ہستی کے لیے بھی پیدا کر لیا تو تم نے اُسے خدا کا ہمسر یعنی شریک ٹھہرا لیا اور توحید کا اعتقاد درہم برہم ہو گیا ۔۔۔

یہی وجہ ہے کہ سورۂ فاتحہ میں "إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ" کی تلقین کی گئی۔ اس میں اوّل تو عبادت کے ساتھ استعانت کا بھی ذکر کیا گیا، پھر دونوں جگہ مفعول کو بھی مقدم کیا جو مفید حصر ہے یعنی "صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں"۔

اُس کے علاوہ تمام قرآن میں اسی کثرت کے ساتھ توحید فی الصفات اور ردِ اشراک پر زور دیا گیا ہے، شاید ہی کوئی سورت ہوگی جو اس کی صفات سے خالی ہو ۔۔۔۔

مجلس نشر السنّہ — مخدوم رشید (ملتان)